بہار میں اردو صحافت
سمت و رفتار
ڈاکٹر منصور خوشتر
Dr. Mansoor khushtar
Bihar mein Urdu sahafat
simt-o-raftar
EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com
978-93-5073-229-8

بہار میں اُردو صحافت: سمت ورفتار

ڈاکٹر منصور خوشتر

مصنف/مرتب کی دیگر کتابیں:۔

(۱) لمعات طرزی ۲۰۱۴ء

(۲) نثر نگاران دربھنگہ ۲۰۱۴ء

(۳) ماجرادی اسٹوری ۲۰۱۴ء

(۴) کچھ محفل خوباں کی (شعری مجموعہ) ۲۰۱۵ء

(۵) اجمل فرید: یادیں، باتیں ۲۰۱۵ء

(۶) اجالوں کا گھر ۲۰۱۶ء

(۷) نقد افسانہ ۲۰۱۶ء

(۸) منظوم تبصرے (طرزؔی کے منظوم تبصرے) ۲۰۱۶ء

بہار میں اُردو صحافت: سمت ورفتار

مرتب

ڈاکٹر منصور خوشتر

اس کتاب کی اشاعت میں محکمہ راج بھاشا اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار کا مالی تعاون شامل ہے۔

Bihar men Urdu Sahafat: Samt-o-Raftar

Edited by : **Dr. Mansoor Khushter**

Year of Publication:-2016 Price:-Rs. 200/-

Library Edition:-Rs. 300/-

نام کتاب	:	بہار میں اُردو صحافت: سمت ورفتار
مرتب	:	ڈاکٹر منصور خوشتر
ای میل	:	mansoorkhushter@gmail.com
موبائل	:	09234772764,9472059441
سنہ اشاعت	:	2016
تعداد	:	پانچ سو (۵۰۰)
قیمت	:	۲۰۰ روپے، لائبریری ایڈیشن: ۲۵۰ روپے
کمپوزنگ	:	احسان عالم، گلیکسی کمپیوٹرس، رحم خاں، دربھنگہ
مطبع	:	نیو پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی
زیر اہتمام	:	المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، سبھاش چوک، دربھنگہ

ملنے کا پتہ :---

- سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز، شوکت علی ہاؤس محلّہ پرانی منصفی، دربھنگہ
- دفتر روزنامہ قومی تنظیم، سبزی باغ، پٹنہ ● ناولٹی بکس قلعہ گھاٹ، دربھنگہ
- دربھنگہ قومی تنظیم زونل آفس، ڈاکٹر آفتاب حسین کمپلیکس، سبھاش چوک، دربھنگہ
- بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ ● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔۶
- کتاب دار، ممبئی ● دانش محل، لکھنؤ

انتساب

روزنامہ قومی تنظیم کے مدیر اعلیٰ

ایس ایم اشرف فرید

اور

صدر جمہوریہ ہند سے ایوارڈ یافتہ

پروفیسر عبدالمنان طرزی

کے نام

اپنی اس کاوشِ علمی کا انتساب ہے۔

فہرست

☆☆☆

مشتاق احمد نوری

بہار میں اردو صحافت: سمت و رفتار۔ایک تاثر

اردو صحافت اپنا 200 سال مکمل کرنے جا رہی ہے۔اتنے لمبے عرصے میں صحافت نے کئی دور دیکھے اور ہر دور میں اس نے اپنا رول بہت ذمہ داری سے نبھایا۔آزادی کی جنگ میں انقلاب زندہ آباد جیسا نعرہ جو رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گردش بڑھا دیتا تھا اس نعرے کو عوام تک یہ صحافت نے ہی پہنچایا۔صحافتی خبریں ہر دور میں اہمیت کی حامل رہیں اور عوام تک ان باتوں کو پہنچایا جس کا جاننا عوام کے لئے ضروری تھا۔یہ صحافت ہی ہے جس سے سرکاریں ڈر گئیں۔انہیں توپ کے گولے سے اڑا دیا گیا' جیل میں ڈالا گیا۔ملک سے نکالا گیا لیکن صحافی کا قلم کبھی خاموش نہیں ہوا۔اردو صحافت گرچہ انگریزی اور ہندی صحافت کے شانہ بشانہ نہیں چل سکی لیکن اس نے اپنے محدود ذرائع کے دائرے میں ہمیشہ اپنی ہمت جواں رکھی اور سماج میں مثبت رول ادا کرنے کی کوشش کی۔

بہار بھی صحافتی خدمات میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔شروع کے دور سے لے کر آج تک بہار کے صحافیوں نے بھی ملک کے دیگر صحافیوں کے شانہ بشانہ اپنی خدمات انجام دیں۔یہ الگ بات ہے کہ پرانے دور کے صحافیوں نے جس جانفشانی سے خدمات انجام دیں وہ جذبہ آج کے دور کے صحافیوں میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔زیادہ دور کی بات نہیں ہے جب غلام سرور مرحوم نے سنگم شروع کیا تھا تو وہ دور اردو صحافت کے لئے آزمائش کا دور تھا۔خبریں کتابت کی جاتیں' پتھر کے سیل پر پلیٹ بنتا تب اس کی اشاعت ہوتی۔اس زمانہ میں سنگم نے اپنے عروج کا دور دیکھا۔رات بھر لوگ یہی سوچتے کہ غلام سرور کے اخبار کی سرخی کیا ہوگی۔کیونکہ خبروں کی اہمیت اس کے سرخی سے بھی بڑھ جاتی ہے۔اس زمانے میں غلام سرور ایک سے ایک جذباتی سرخیاں لگاتے اور عوام سے داد وصول کرتے۔اسی زمانے میں صدائے عام بھی سنگم کے شانہ بشانہ چل رہا تھا۔لیکن اس کے بعد

جدید ٹکنالوجی کا دور آیا۔اخباروں کی اشاعت میں کمپیوٹر کی سہولت ملنے لگی اور آفسٹ مشین سے رنگین پیج بھی چھپنے لگے۔آج بہار سے درجنوں اخبار نکلتے ہیں جن کا نام گنانے کی ضرورت نہیں۔ کچھ اخبار ایسے ہیں جو بزنس گھرانے کے ہیں۔ان کے ایڈیٹر، رپورٹرس کو مالی طور پر وہ پریشانی نہیں جھیلنی پڑتی جو پرائیویٹ اخبار میں کام کرنے والے لوگوں کو ہوتی ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے کہ ایک اعلیٰ صحافی ہونے کے لئے صرف خدمت کا جذبہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی رقم کی ضرورت بھی ہے جس سے بال بچوں کے ساتھ گذر بسر کیا جا سکے۔ذہنی انتشار کے بجائے جب ذہنی آسودگی ہوتی ہے تو کوئی بھی قلم کار بہت مطمئن ہو کر اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔لیکن بہار کے اردو صحافیوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی محنتوں کا واجب معاوضہ نہیں پاتے لیکن مجبوراً زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لئے انہیں یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ نئے صحافیوں کے لئے کسی قسم کی تربیت نہیں ہوتی۔اس سے ان کو اچھی صحافت کا گر بھی نہیں معلوم ہوتا اور وہ بنے بنائے ڈگر پر چلنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر ان صحافیوں کی تربیت کا کوئی کورس کرانے کی کوئی صورت پیدا ہو تو ان کی صحافتی کارگذاریوں کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

اردو صحافت کو روشن کرنے میں اخبار کے علاوہ اردو رسائل نے بھی اپنی ذمہ داری نبھائی ہے۔ بہار کی سطح پر ابھی جتنے بھی رسائل ہیں انہوں نے بھی اردو صحافت صیقل کرنے کے لئے اپنی ذمہ داری نبھائی ہے۔ان رسائل کا تفصیلی ذکر اس کتاب کے کسی نہ کسی مضمون میں مل جائے گا اس لئے میں ان کی تفصیل سے گریز کرتا ہوں۔

میں صحافت کو عبادت تصور کرتا ہوں کیونکہ عبادت میں جس ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے صحافی حضرات بھی کم و بیش اسی ریاضت سے گذرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان ہی صحافیوں میں سے کسی نہ کسی پر صحافت کو بدنام کرنے کا الزام لگتا رہا ہے اور اس بات کی نشاندہی کی جاتی رہی ہے کہ صحافتی تحریر کے ذریعہ اپنے دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے اور کسی نہ کسی پر بہتان تراشی اور الزامات عائد کئے جاتے ہیں۔اس کی بدترین مثال الکٹرونک میڈیا ہے جہاں میڈیا ٹرائیل کو لیکر

انگلیاں اٹھتی رہی ہیں۔ دراصل صحافت اتنا معزز پیشہ ہے کہ اس پر تھوڑا سا میل بھی نظر آجاتا ہے اور عام آدمی کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس پاکیزہ پیشے پر کسی بھی گوشے سے کیچڑ اچھالا جائے۔

ڈاکٹر منصور خوشتر کا شمار ایک معتبر صحافی کے طور پر ہوتا ہے اس کے ساتھ وہ ایک بہترین شاعر بھی ہیں اور کہانیوں پر بھی ان کی گرفت ہے۔ان کی شناخت ایک سماجی کارکن اور ایک اچھے بزنس مین کے طور پر بھی ہوتی ہے۔ان کے اخلاص اور ان کی محبت کا ایک زمانہ قائل ہے۔ وہ قومی تنظیم کے دربھنگہ کے بیورو چیف ہیں اور ہر ہفتے ادب پر ایک صفحہ ترتیب دیتے ہیں جس سے ان کی اعلیٰ صلاحیت اور ذہانت کا پرتو جھلکتا ہے۔ابھی حال ہی میں انہوں نے صحافت کے سمت و رفتار پر ایک سیمینار بھی دربھنگہ میں منعقد کیا جس میں دہلی اور ممبئی کے صحافی بھی شامل ہوئے اور بہار کی سطح پر جانے مانے صحافی نے بھی اپنے مقالے اور تقریر سے نوازا۔اس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ منصور خوشتر صرف ایک اردو صحافی ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے سمت و رفتار پر بھی ان کی گہری نگاہ ہے۔صحافت پر ان کی اس کتاب میں بہت سے اہم صحافی اور قلم کاروں کی شراکت ہوئی ہے۔ اس میں شامل مضامین سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب قلم لوگوں نے صحافت کا جائزہ بہت باریک بینی سے لیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔صفدر امام قادری نے اپنے مضمون ''بہار میں اردو صحافت تاریخ، تکنیک اور معیار کا جائزہ'' کے تحت صحافت کی پوری تاریخ رقم کی ہے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ انگریزی، بنگلہ، فارسی، گجراتی اور ہندی زبانوں کی صحافت پر بھی نگاہ رکھی ہے۔انہوں نے ان رسائل کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے صحافت پر مضامین شائع کئے اور ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جس میں صحافت پر بحث ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحنان سبحانی نے اردو اخبارات اور قومی یکجہتی کے عنوان سے ایک بہتر مضمون قلم بند کیا ہے جس میں انہوں نے ملک کی سلامتی و آزادی اور تحفظ کے لئے باہمی اتحاد اور یگانگت کو اشد ضرورت بتانے کے ساتھ صوفی سنتوں کی تعلیمات پر بھی نظر رکھی ہے۔انہوں نے قومی یکجہتی پر خاص طور سے توجہ دی ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ آج کی صحافت کس طرح اطلاعاتی اور ٹکنالوجی کی صحافت کے طور پر اپنی پہچان کرا رہی ہے۔

اردو تنقید و صحافت کا جانا پہچانا نام حقانی القاسمی کا ہے جنہوں نے صحافت، صارفیت اور صہیونیت کے نام سے ایک بہت ہی اہم مضمون قلم بند کیا ہے اور صحافت کے کئی رنگوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات کی بھی وکالت کی ہے کہ صحافتی اقدار کو زندہ رکھنے کے لئے معاشرے کا بیدار رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ صحافت کا گرتا ہوا معیار معاشرے کے ذہن اور ضمیر کے زوال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انوار الحسن وسطوی، ڈاکٹر ریحان غنی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر سید احمد قادری، عطا عابدی، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر امام اعظم، احسان عالم، محمد ارشاد، محمد عبدالرحمٰن راشد ڈ، کامران غنی صبا، شاہد الرحمٰن، جمیل اختر، سلمان عبدالصمد، نور السلام ندوی اور فیاض احمد وجیہہ، کے علاوہ اور بھی کئی قلم کاروں اور صحافیوں نے اردو صحافت کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور صحافت کے مختلف گوشوں کو ہمارے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر منصور خوشتر ایک بیدار ذہن شخصیت کا نام ہے جن کی نگاہ ادب اور صحافت پر یکساں رہتی ہے جس کی مثال دربھنگہ ٹائمز کے وہ شمارے ہیں جو ان کی ادارت میں شائع ہوئے۔ ابھی فکشن نمبر کی دھوم کم نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے ناول نمبر کی اشاعت کا اعلان کر دیا ہے اور یقیناً دربھنگہ ٹائمز کا یہ نمبر بھی ادباء اور قارئین سے داد وصول کرے گا۔ ان کی موجودہ کتاب ''بہار میں اردو صحافت۔ سمت و رفتار'' صحافت کے لئے نیک شگن کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے مطالعہ سے بہار میں اردو صحافت کی پوری شکل واضح ہو جائے گی اور واقعی ہمیں اردو صحافت کے سمت و رفتار کا تعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ میں ان کی تحریروں سے ایک خوش آئند مستقبل کی دھمک محسوس کرتا ہوں اور ان سے بہت سی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں کہ۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

☆☆☆

ڈاکٹر منصور خوشتر

عرض مرتب

صحافت ایک ایسی تحریر کا نام ہے جو کم و بیش زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، سائنسی، قومی اور بین الاقوامی خیالات و افکار جگہ پاتے ہیں۔ جن کا تعلق اطلاعات کی فراہمی اور رائے عامہ کی تشکیل سے ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ نئی نئی ایجادات اور تحقیق کے لئے نئے نئے گوشے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ اس میں ادیب و شاعر دانشور اور مصلح کی تمام چیزیں اور سارے خیالات بھی شامل ہوتے ہیں۔ صحافی شب و روز کے حالات کی عکاسی اور ان کے پس منظر سے ابھرنے والے نظریات کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صحافت کا میدان اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اس کی مکمل تفسیر و تفہیم پیش کرنا آسان نہیں۔ ابتدائی دور سے دور حاضر تک صحافت میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے۔ جیسے جیسے انسانی ذہن فروغ پا رہا ہے اور جیسے جیسے دنیا پھیل رہی ہے ویسے ویسے صحافت کا میدان بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

آج سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے اور نئی نئی ایجادات اتنی آگے بڑھ گئی ہیں کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت ساری تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ ان نئی ایجادات اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی نے صحافت کے میدان میں بھی غیر معمولی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ آج اس سے ہر آدمی مستفیض ہو رہا ہے۔ آج صحافت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس کی حد نہ صرف مطبوعہ صحافت تک محدود ہے بلکہ اس کے ذریعہ ایک نیا انقلاب آ گیا ہے۔ مطبوعہ صحافت میں روزنامہ، دوروزہ، سہ روزہ ہفت روزہ، اخبار، ماہنامہ، دو ماہی، سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ رسائل و جرائد وغیرہ شامل ہیں۔

برقی صحافت میں ریڈیو، ٹی وی، فلم، سی ڈی، ہیڈ پروجیکٹر، سلائڈ، ٹیلی کانفرنسنگ، ویڈیو کانفرنسنگ، ویڈیو ٹیلکس، وائرلس سسٹم، نیوز فوٹو ٹرانس میشن، انٹرنیٹ، فیس بک، واٹس ایپ وغیرہ نے سمعی و بصری صحافت میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔

اخبار کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ اس کے ذریعہ متعدد حکومتیں قائم ہوئیں اور انھیں استحکام بخشا گیا اور اخبار نے کئی حکومتوں کو برباد بھی کر دیا ہے۔ نپولین کا قول ہے کہ تین مخالف اخباروں سے اتنا کام لیا جا سکتا ہے جتنا ایک ہزار بندوقوں سے نہیں لیا جا سکتا ہے۔ مغلیہ دور حکومت میں چھوٹے حکمراں، شہنشاہ کی تلوار سے زیادہ دربار میں رہنے والے دانشوروں کے قلم سے خوف کھاتے تھے۔ اخبارات کی آواز نے انگریز حکمرانوں کو لرزہ کر دیا تھا۔ ملک کی آزادی کی جنگ میں اخبارات نے جو اہم رول ادا کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ دور حاضر پر اگر نگاہ دوڑائی جائے تو ٹیونیشیا، لیبیا اور مصر میں واٹس ایپ اور فیس بک نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ساری دنیا اسے ''عرب اسپرنگ'' کے نام سے جانتی ہے جہاں لاکھوں

لوگ ایک آواز پر جمع ہو گئے اور آخر کار حکمرانوں کو تبدیل کر کے جمہوری حکومت قائم کر لی گئی۔ ہانگ کانگ میں ''امبریلا اسپرنگ'' بھی اس کی شاندار مثال ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار کلکتہ سے ۱۷۵۰ء میں ''ہکی بنگال گزٹ'' کے نام سے نکلا جو ہفت روزہ اخبار تھا۔ اس کے بعد اخبار کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ ہندی کا سب سے پہلا اخبار ۱۸۲۶ء میں کلکتہ ہی سے نکلا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے قبل ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ اسے تعلیم یافتہ ہندو مسلم سب سمجھتے تھے۔ بلکہ پڑھتے لکھتے اور بولتے بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ راجہ رام موہن رائے نے مذہبی اصلاح کی غرض سے فارسی زبان میں ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء کو ''مراۃ الاخبار'' جاری کیا۔ فارسی زبان کا یہ پہلا اخبار تھا۔

اردو زبان کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ہے جو ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس سے اردو صحافت کی راہ ہموار ہوئی۔ اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال تھے۔ یہ اخبار کم و بیش ۵۵ سال تک نکلتا رہا۔ اس میں خبروں کے ساتھ ساتھ غزلیں اور تاریخی مواد بھی ہوتے تھے۔ ساتھ ہی انگریزی اور فارسی کے مضامین کے تراجم بھی شائع کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد ملک میں کئی اچھے اخبار نکلے ان میں ''دہلی اردو اخبار''، ''آئینہ سکندری''، ''سید الاخبار''، ''خیر خواہ ہند''، ''صدر الاخبار''، ''بنارس گزٹ''، ''آفتاب ہند''، ''سحر سامری''، ''کوہ نور''، ''محبت ہند'' اور ''اخبار انجمن پنجاب'' وغیرہ اہم ہیں۔

اس دور کی اردو صحافت پر ادبیت غالب تھی کچھ خبروں کی زبان ایسی مقفع و مسجع تھی کہ اگر ان میں سے حروف رابطہ کو نکال دیا جائے تو وہ عربی اور فارسی کی تحریریں معلوم ہوں

گی۔۱۸۵۱ء اور ۱۹۲۵ء کی تحریروں میں نمایاں فرق دیکھا جاسکتا ہے۔

''ذکر فرحت اثر شادی تولد فرزند ارجمند مشکوئے دولت و
اقبال جناب معلیٰ القاب ترپا بارگاہ، رفیع پائگاہ، حاتم دوراں، نوشیرواں
زماں جناب مہاراج صاحب بہادر، مہاراج اندر سوائی بلونت سنگھ
بہادر، وائی بھرت پور، بتقریب مبارکباد زیب صفحہ اخبار ہوا تھا۔''

(کوہ نور ۱۲ جولائی ۱۸۵۱ء بحوالہ اردو صحافت میں اظہار وابلاغ: ڈاکٹر صالح عبداللہ، ص:۴۳)

''حکم ہوا کہ اگلے دن بھی رام لیلا کا تماشا دیکھا جائے۔
چنانچہ دوسرے دن چکلے کی رنڈیوں اور بھانڈوں، بھگتے بازی گر،
نٹ بھائیوں کے گروہ، کشمیریوں کے چھوکرے، ہجرے سب
فرمات ارباب، نشاط کے حکم کے مطابق گومتی یار مبارک منزل کے
سامنے اکٹھا ہوئے اور بادشاہی کارخانہ جات کے ہاتھی گھوڑے،
آراستہ کر حاضر ہوئے۔ اسیر درس نانک شاہی نے رام لیلا کا تماشا
شروع کیا۔ حضرت دیر تک تماشہ دیکھا کئے۔ اسیروں درس کے
فقیروں کے بھنڈارے کے لئے ہزاروں روپئے مرحمت فرمائے
گئے۔''

(جام جہاں نما، شمارہ ۱۲۸، مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۲۵ء)

''جام جہاں نما'' کی دود ہائی کے بعد اردو دنیا میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ کیونکہ ۱۸۳۰ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا۔ اردو کے اخبارات تیزی سے نکلنے لگے۔

۱۸۴۰ء کے بعد شمالی ہند میں بہت سے اخبار کا اجرا ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں دہلی سے ''دلی اردو اخبار'' مولوی محمد باقر کی ادارت میں نکلا۔ اس میں سلیس اور رواں دواں زبان استعمال ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''جیون لال منشی صاحب کلال بہادر نے باریاب مجرا ہوکر
کچھ کاغذات ملاحظہ کروا کر ایک عورت کو سامنے کر کے عرض کیا کہ
یہ عورت کہتی ہے کہ میری بیٹی محل حضور والا میں ہے۔ اسماع
فرمائے۔ ایک خواجہ سرا ہمراہ کر دیا کہ محل میں ہو تو فوراً دلوادو۔ خواجہ
سرا نے مع عورت کے محل میں بہت تلاش کی مگر اسے نہ پایا۔''

(ہندوستانی اخبار نویسی، محمد عتیق صدیقی، بحوالہ اردو صحافت میں اظہار وابلاغ، ص:۳۸)

اس دور کے اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں ادبی انداز میں لکھے ہوئے واقعات کی شکل میں ہوتی تھیں۔

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے ہندوستانی اخبار نویسوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ بہت سے صحافیوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ یہاں تک کہ ''دلی اردو اخبار'' کے مدیر مولوی باقر کو پھانسی دے دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء یعنی پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد بہت دنوں تک اخبار کی سرگرمیاں تقریباً بند رہیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اخبارات منظر عام پر آنے لگے۔

ملک کی آزادی تک کئی اہم اخبار منظر عام پر آکر اپنی اہمیت کا احساس دلانے میں کامیاب ہوئے۔ ان اخبارات کے مدیروں نے عوام کی رائے ہموار کرنے اور ان کے اندر

قومی یکجہتی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ان میں ''پیسہ اخبار''، ''اودھ اخبار''، ''اخبار عام''، ''زمیندار''، ''الہلال''، ''البلاغ''، ''سیاست''، ''مسلم گزٹ''، ''زمانہ''، ''صدائے عام''، ''قومی تنظیم''، ''قومی آواز وغیرہ اہم ہیں۔

ڈاکٹر شاہد حسین لکھتے ہیں:

''آج سے تقریباً دوسو برس قبل جب اردو صحافت کی ابتدا ہوئی تھی تو کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ اردو صحافت وہ تاریخ رقم کرے گی، جس پر دوسری زبان کی صحافت کو بھی ناز ہو۔ اردو صحافت بے سروسامانی کے عالم میں بھی اپنی پیدائش سے وہ کچھ کرتی چلی گئی ہے، جو غیر معمولی ہے۔ انیسویں صدی ہو کہ بیسویں صدی، ہر زمانے میں اردو صحافت کا دائرہ بڑھنے لگا تھا۔ آزادی سے قبل ہی اردو اخباروں کا جال بچھنے لگا۔ اخبارات ہی نہیں بلکہ رسائل و جرائد بھی سامنے آنے لگے۔ جنہوں نے اپنی اپنی نگارشات سے عوام کی رہنمائی کی، ان میں سیاسی اور ثقافتی شعور بیدار کیا۔ الہٰ آباد، لکھنؤ، آگرہ، ممبئی، امرتسر، لاہور، جے پور، کشمیر غرض کہ پورے ہندوستان میں اردو صحافت پر بیداری کی لہر چلنے لگی۔ روزناموں میں ''پیسہ'' (لاہور) ''وکیل'' (امرتسر)، ''زمیندار'' (لاہور) ''پرتاپ'' (لاہور) وغیرہ سرفہرست تھے۔ ان سب نے صحافتی دنیا میں بڑا نام کمایا۔''

(ڈاکٹر شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص:۷۶)

بلاتفریق مذہب صحافیوں نے اردو صحافت کے ذریعہ سماج کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اردو صحافت کے فروغ میں انہوں نے تقریباً یکساں حصہ لیا۔ آزادی سے قبل لگ بھگ اردو ملک کے ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طبقہ اپنے خیالات ونظریات کی تبلیغ واشاعت کے لئے اردو کا انتخاب کرنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ چندسال کا عرصہ گزرا نہیں کہ اردو صحافت کو منفرد مقام نصیب ہوا، اس کو ملک گیر حیثیت حاصل ہوگئی۔

عام صحافت کی پیدائش تقریباً دو ہزار سال قبل ہوئی۔ جب کہ اردو صحافت **دوسوسالہ تاریخ** کی گواہ ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اردو صحافت، عام صحافت کی ابتدا سے تقریباً ۱۸ سو سال چھوٹی ہے۔ تاہم اردو صحافت کو ابتدائی دنوں میں جن مسائل ور پرخطر حالات سے سابقہ پڑا، وہ روم میں شروع ہونے والے پہلے اخبار کے سامنے نہیں تھے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو صحافت کا پورا کارواں سنگلاخ وادیوں سے ہو کر گزر رہا ہے۔

آزادی کے بعد جن رسائل نے اپنی جگہ مستحکم کر لی ان میں ''مخزن''، ''معارف''، ''مریخ''، ''الناظر''، ''اردوئے معلیٰ''، ''ادبی دنیا''، ''ادب لطیف''، ''اردو دنیا''، ''آج کل''، ''ایوان اردو''، ''آواز''، ''الندوہ''، ''نگار''، ''نیرنگ خیال''، ''نیا ادب''، ''نیا دور''، ''ندیم''، ''تناظر''، ''تعمیر''، ''زمانہ''، ''جامعہ'' ''عصر جدید''، ''ساقی''، ''بہارستان''، ''نگار''، ''ہمایوں''، ''عالمگیر''، ''شمع''، ''شاہراہ''، ''شاعر''، ''کارواں''، ''زبان وادب''، ''روح ادب''، ''کتاب نما''، ''پاسبان'' اور ''تعمیر'' وغیرہ اہم ہیں۔

ان رسائل کے علاوہ خواتین اور بچوں کے کچھ اہم رسائل بھی آزادی کے بعد منظر عام

پر آئے۔ ان رسائل و جرائد میں سے کچھ آزادی سے قبل ہی سے ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے تھے۔

آزادی کے بعد جن اخباروں نے خاص و عام میں مقبولیت حاصل کی ان میں ''سیاست''، ''سنگم''، ''ہند سماچار''، ''آزاد ہند''، ''انقلاب''، ''اخبار مشرق''، اخبار نو' ، ''اقرا''، ''پرتاپ''، ''راشٹریہ سہارا''، ''نقیب''،سنگم''، ''قومی تنظیم''، ''قومی آواز''، ''ملاپ''، ''قومی جنگ''، ''بلٹز''، ''نشیمن''، اور ''عزائم'' وغیرہ اہم ہیں۔ان میں سے بیشتر کی اہمیت وافادیت آج بھی مسلم ہے۔ان کا سرکولیشن بھی اچھا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے میں اردو اخبارات پڑھے جاتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو جاننے والوں کا ایک بڑا طبقہ ہندوستان میں موجود ہے۔

اردو صحافت کے عمومی پس منظر پر نظر ڈالنے سے انداز ہوتا ہے کہ ہر لحاظ سے اردو صحافت نے ترقی کی ہے اور تمام تر پر خطر حالات میں اس نے باطلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اردو اخبارات نے اپنے ابتدائی زمانہ میں جو کچھ کیا ہے،اس کی مثال کسی بھی زبان کی صحافت میں نہیں ملے گی۔اردو صحافت کی دیگر تاریخ سے قطع نظر، فقط سیکولرزم کے فروغ میں اس کے حصے کو دیکھیں تو مسرت کا احساس ہوتا ہے. اردو صحافت کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے اول دن سے ہی لوگوں کو جوڑنے اور ملک کی تعمیر کا کام کیا ہے۔اس حوالے سے ایک اقتباس:

''جس نازک دور میں اردو صحافت کا آغاز ہوا، اس دور میں ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی جانبداری کو ہوا دی جائے۔

چنانچہ اردو صحافت نے اس ماحول یعنی اپنے ابتدائی دور میں جو کچھ کیا اسے فروغِ سیکولرزم کے تناظر میں انتہائی کامیاب کردار کہا جاسکتا ہے۔ خاص طور سے صحافت کی آڑ میں اردو صحافیوں نے اسلامی حمیت کو بیدار کر کے آزادی کی شمع فروزاں کرنے کی جو کوشش کی، اس کی مثال کسی بھی زبان کی صحافت میں نہیں ملے گی۔صحافت کے علاوہ کسی زبان کی صحافت کو شاید یہ فخر بھی حاصل نہیں ہے کہ اس نے اول دن سے ہی توپوں کا مقابلہ کیا ہو۔اردو صحافت کو یہ بھی ناز کہ اس نے حب الوطنی کی قربان گاہ پر اپنی تاریخ کے اولین صحافیوں کی قربانی دی۔''

(مضمون نگار، سلمان عبدالصمد، روزنامہ دائی پرواز،نوئیڈا،18 جولائی 2015)

اردو صحافت کی تاریخ سے ذرا بھی باخبر رہنے والوں پر یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اردو صحافت اپنے ابتدائی زمانے سے لے کر گذشتہ صدی کے آخر تک بحیثیت مشن سفر کرتی رہی ہے۔تاہم آج صحافیوں کی ذہنیت بدلی ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی بھی ذہنیت بدلی ہے، جو کبھی اردو صحافت کو منہ تک نہیں لگانا چاہتے تھے۔ مثلاً، ایک وہ دور تھا، جب کارپوریٹ گھرانے اردو اخبارات میں اشتہارات دینا معیوب سمجھتے تھے،لیکن آج اردو صحافت ان کی نظر میں حسین معلوم ہونے لگی ہے۔ان تمام باتوں کے مدنظر ہم آج کی اردو صحافت کے سفر کا بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں۔ اردو صحافت کے متعلق بدلتی ہوئی اس ذہنیت سے بھی آئندہ

برسوں میں اردو صحافت کی تابناکی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

چند لفظوں میں اردو صحافت کی تاریخ یعنی آج اور کل کا موازنہ کچھ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں اپنا سفر طے کرنے والی اردو صحافت نے بلند حوصلگی کا ثبوت دیتے ہوئے، وہ کرشمہ دکھایا ہے، اس سے جہاں اردو کی شان میں اضافہ ہوا ہے، وہیں اردو صحافت اعتبار کی نظر سے دیکھی جانے لگی۔ بیسویں صدی میں آنے کے بعد اردو صحافت نے آزادی کی جنگ میں شریک ہو کر اپنی جوانی کا احساس دلایا ہے۔ لیکن اکیسویں میں داخل ہوتے ہی صارفیت کا غلبہ صحافت پر ہو گیا، جس کی وجہ سے اردو صحافت بہت بدل گئی اور قاری سے بھی دور ہوتی چلی جا رہی ہے اور صحافیوں کے افکار و نظریات بھی بدلے ہیں۔ تین دہائی سے اردو صحافت سے جڑے رہنے والے صحافی سہیل انجم لکھتے ہیں:

''صحافیوں کا فرض منصبی جہاں ملکی حالات و واقعات، سماجی اتار چڑھاؤ، سیاسی اتھل پتھل اور عالمی تبدیلیوں کا دیانتداری، بے باکی اور گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر کے مثبت نتائج اخذ کرنا ہے، وہیں اپنے قارئین کو گمراہ ہونے اور طالع آزما اور ابن الوقتوں کے ہاتھوں آلہ کار بننے سے بچانا، ان کی رہنمائی کرنا اور انھیں سیدھی اور سچی راہ دکھانا بھی ہے۔ ایک صحافی اس کسوٹی پر اسی وقت کھرا اتر سکتا ہے جب وہ ہر قسم کی طمع سے بے نیاز ہو کر دیانت داری اور بے باکی و بے خوفی کے ساتھ اپنا فرض ادا کرے۔''

(مضمون نگار، سہیل انجم، ماہنامہ نیا دور لکھنو، اردو صحافت نمبر 2012)

جہاں تک بہار میں اردو صحافت کی بات ہے تو صوبہ بہار اپنے سیاسی، معاشی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی، لسانی اور مذہبی پس منظر کی وجہ سے قدیم ہندی تواریخ میں بھی

اہمیت کا حامل رہا ہے۔ متعلقہ ابواب میں دانشوروں نے بہار کے علمی مندرجات کو خوب موضوع بنایا اور کئی اہم کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جن سے ہم یہ جان پاتے کہ اس ریاست کو علم و ادب میں کس قدر مرکزیت حاصل رہی ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے اس کی تشکیل و تعمیر میں اردو صحافت کا بڑا اہم اور کلیدی کردار رہا ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ بہار میں اردو صحافت کا آغاز ہندوستان کے پہلے اخبار ''جام جہاں نما'' (۱۸۲۲ء) کے محض اکتیس سال بعد یعنی ۱۸۵۳ء میں ''نور الانوار'' (آرہ) کی اشاعت سے ہوتا ہے۔ اہل علم و دانش کے لئے یہ بات انتہائی قابل فخر ہے کہ بہار میں صحافت کی ابتدا اردو صحافت سے ہی ہوتی ہے۔ اس سے قبل بہار سے کسی زبان میں کوئی اخبار نہیں نکل رہا تھا۔ اس کی اشاعت کے تقریباً انیس سال بعد یعنی ۱۸۷۲ء میں پٹنہ سے پہلے انگریزی اخبار Bihar Herald کی اشاعت ہوئی اور اس کے دو سال بعد ہندی اخبار ''بہار بندھو'' کی اشاعت بھی پٹنہ سے شروع ہوئی۔ دراصل یہ صوبہ علم و دانش کی تدبیر سازی میں کبھی پسماندہ نہیں رہا۔ ہاں بعض سیاسی حالات نے اس کی سنہری تاریخ کو پس انداز کر دیا ہے۔ بعض ایسی ہی باتوں کے پیش نظر آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان تمام حوالوں کو کھنگالیں جن میں گیان اور درشن کی عبارتیں درج ہیں۔ ان عبارتوں کی تشکیل نو سے ہم بہار کو از سر نو علم و ادب کی بلندی سے آشنا کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی تشکیل و ترتیب کا مقصد یہی ہے، حالانکہ یہ بہت چھوٹی سی کوشش ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر ہم اردو صحافت کے بعض حوالوں کو یہاں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء تک بہار سے چار اردو اخبارات ''نور الانوار'' (آرہ) ''ہرکارہ'' (پٹنہ)، ''اخبار بہار'' (پٹنہ) اور ''ویکلی رپورٹ'' (گیا) شائع ہونے لگتے

ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں بہار سے پیر علی اور ان کے ساتھی اور علمائے صادق پور جس جذبے اور جوش کے ساتھ شریک ہوئے وہ بھی ہندوستانی تاریخ کا روشن حصہ ہیں۔ جنگ آزادی میں یہاں صحافت کی سمت ورفتار کیا تھی؟ اس باب میں عام طور سے مؤرخین نے خاموشی کو راہ دی ہے۔ پہلی جنگ آزادی کے وقت اردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس لیے اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ بہار کی صحافت نے بھی آزادی کی اس جنگ میں اہم رول ادا کیا ہوگا۔ اس وقت جنگ آزادی میں بہار سے پیر علی اور ان کے ساتھ، مولانا عبدالحکیم صادق پوری اور مولانا یحییٰ علی وغیرہ کی قیادت اور رہنمائی میں عوام کی ایک جماعت شامل ہوئی تھی، جنگ آزادی کے لیے ماحول بنانے میں اس وقت کی صحافت سے ان مجاہدین نے بھی خاطر خواہ کام لیا ہوگا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے باشندوں پر جو قیامت ٹوٹی اس کے اثرات کی سیاسی، سماجی، معاشی اور صحافتی دنیا پر بھی مرتسم ہوئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۸ء تک بہار کی صحافت کے پردے پر کوئی نیا اخبار یا رسالہ نمودار نہیں ہوا۔ یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ بہار کی صحافت نے پہلی جنگ آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ جنگ آزادی کے ہنگامے کے بعد بہار کی اردو صحافت نے نئی آب وتاب کے ساتھ ایک مرتبہ پھر نئے رنگ دکھائے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء سے ۱۹۱۲ء کے دوران بہار میں ۵۰ سے زائد اخبارات نظر آئے۔ ان میں سے خاص خاص اخبارات کے نام اس طرح ہیں:

۱۔ نیر الفوائد	آرہ	۱۸۶۷ء
۲۔ اخبار الاخبار	مظفر پور	۱۸۶۸ء
۳۔ چشمۂ علم	پٹنہ	۱۸۶۹ء

۴۔ شعاع مہر	مظفر پور	۱۸۷۱ء
۵۔ نادر الاخبار	مونگیر	۱۸۷۲ء
۶۔ ضیاء الاخبار	آرہ	۱۸۷۳ء
۷۔ سفر سفیر	آرہ	۱۸۷۴ء
۸۔ نسیم سحر	پٹنہ	۱۸۷۴ء
۹۔ بہار پنچ	پٹنہ	۱۸۷۷ء
۱۰۔ نسیم سارن	چھپرہ	۱۸۷۸ء
۱۱۔ مشیر بہار	گیا	۱۸۸۰ء
۱۲۔ نور الاسلام	گیا	۱۸۸۶ء
۱۳۔ انڈین کرانیکل	پٹنہ	۱۸۸۱ء
۱۴۔ شریف الاخبار	بہار شریف	۱۸۸۲ء
۱۵۔ مہر نور	مظفر پور	۱۸۸۴ء
۱۶۔ اخبار الپنچ	پٹنہ	۱۸۸۵ء
۱۷۔ صدق	بہار شریف	۱۸۸۵ء
۱۸۔ گلدستہ سارن	سارن	۱۸۸۵ء
۱۹۔ نوائے عشق	پٹنہ	۱۸۸۵ء
۲۰۔ انسٹی ٹیوٹ	پٹنہ	۱۸۸۶ء
۲۱۔ اسٹار آف انڈیا	آرہ	۱۸۸۶ء

۲۲۔عالم آرا	پٹنہ	۱۸۸۶ء
۲۳۔انیس	پٹنہ	۱۸۸۷ء
۲۴۔شہر آفاق	گیا	۱۸۹۵ء
۲۵۔الہادی	پٹنہ	۱۸۹۷ء
۲۶۔ادیب	پٹنہ	۱۸۹۷ء
۲۷۔مخزن	پٹنہ	۱۸۹۷ء
۲۸۔تحفۂ حنیفیہ	پٹنہ	۱۸۹۷ء
۲۹۔اسپنچ	پٹنہ	۱۸۸۵ء
۳۰۔گیا پنچ	گیا	۱۹۰۱ء
۳۱۔نسیم سحر	پٹنہ	۱۹۰۱ء
۳۲۔تاج	پٹنہ	۱۹۰۲ء
۳۳۔رفتار زمانہ	پٹنہ	۱۹۰۳ء
۳۴۔دامن بہار	سیوان	۱۹۰۶ء

جنگ میں ناکامی کے بعد باشندگان بہار میں جو مایوسی پیدا ہوئی ان اخبارات نے اس کو دور کرنے میں بنیادی رول ادا کیا اور حب الوطنی کے ساتھ ساتھ جوش جہاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ آزادی تک چلتا رہا۔۱۹۱۲ء سے جنگ آزادی تک بہار سے متعدد اخبارات نکالے گئے۔ حالانکہ اس وقت اخبار کو جاری رکھنا صحیح معنوں میں جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ بہت سے اخبارات ضمانتوں کا بار نہ اٹھانے کی وجہ سے تعطل کے شکار ہوئے۔

لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور وقفہ وقفہ سے بڑی تعداد میں اردو اخبارات نکلتے رہے اور انہوں نے عوام کی رہنمائی اور اس وقت کے حالات سے باخبر رکھنے کا کام کیا۔

۱۹۱۲ء سے آزادی تک جو اخبار نکلے ان میں سے کچھ کے نام اس طرح ہیں:

۱۔اتحاد	پٹنہ	۱۹۱۲ء
۲۔بہار گزٹ	پٹنہ	۱۹۱۲ء
۳۔آئینہ	کشن گنج	۱۹۳۵ء
۴۔استقلال	پٹنہ	۱۹۳۵ء
۵۔المبشر	پٹنہ	۱۹۴۲ء
۶۔صدائے عام	پٹنہ	۱۹۴۲ء
۷۔الہلال	پٹنہ	۱۹۴۶ء
۸۔روشنی	پٹنہ	۱۹۳۹ء
۹۔بزم سخن	گیا	۱۹۴۴ء
۱۰۔دیہات	پٹنہ	۱۹۴۰ء
۱۱۔بشریٰ	دربھنگہ	۱۹۲۸ء
۱۲۔حسن وشباب	دربھنگہ	۱۹۴۵ء
۱۳۔نسیم شمال	مظفر پور	۱۹۴۶ء

ان اخبارات میں صرف چند اخبارات خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔ بہار سے

بہت سے اردو اخبارات و رسائل پہلی جنگ آزادی کی ناکامی سے لے کر ملک کی آزادی تک نکلے لیکن ان میں زیادہ تر کی فائلیں تلف ہو چکی ہیں۔

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے لے کر ملک کی آزادی ۱۹۴۷ء تک ان اخبارات نے لوگوں کے اندر کتنا جوش و خروش بھرا، ہندوستانیوں پر انگریز حکمرانوں نے کس کس قسم کے مصائب ڈھائے اور ان سے وہ کس طرح نبرد آزما رہے، ان سب کا اب تک ذکر ہی کیا جا سکتا ہے۔ خدا بخش لائبریری میں ان اخبارات میں سے صرف آٹھ دس اخبارات ''اتحاد''، ''امارات''، ''الپنچ''، ''پیغام''، ''دیہات''، ''روشنی'' گیا پنچ''، ''المبشر'' اور ''نقیب'' وغیرہ موجود ہیں۔

آزادی کے بعد جب دوہری قومیت کا مسئلہ کھڑا ہوا تو بہار سے شائع ہونے والے اکثر اخبارات نے متحدہ قومیت کی حمایت کی اور اس دوہری قومیت کے تصور کو قبول نہیں کیا۔ تقسیم کی پاداش میں جو حالات رونما ہوئے، ان سب کا منصفانہ تجزیہ کیا اور ایک مثبت رویہ اختیار کرتے ہوئے بہار کے مسلمانوں کو اپنے وطن سے وابستہ رہنے کی تلقین کی اور دونوں قوموں کے درمیان قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ بنائے رکھنے کی جدوجہد کی۔

بہار کی صحافت کی یہ اہم خصوصیت رہی ہے کہ آزادی سے تاحال اس نے بہار کے عوام کو ہندوستان کے مرکزی و قومی دھارے سے مربوط رکھنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ معاشی وسائل کی وجہ سے یہاں کے اخبارات زیادہ لمبی زندگی نہیں جی سکے۔ اس کے باوجود یہاں کی اردو صحافت نے اردو صحافت کے کئی بڑے نام پیدا کئے۔ اردو صحافت کی ان بڑی شخصیتوں نے صحافت کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں تک لے جانے کی کوشش کی اور بہار کی اردو صحافت نے

انصاف پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ محمد مرغوب لکھتے ہیں:

''1914 میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس وقت بہار سے کئی اخبارات نکلتے تھے جو زیادہ تر حکومت مخالف رویہ رکھتے تھے، چنانچہ 1910 کے پریس ایکٹ کے تحت ان کے خلاف سخت کارروائی کی گئی۔ بڑی تعداد میں اخبارات و رسائل بند بھی ہو گئے۔ جن کی ضمانتیں ضبط ہوئیں، ان میں بہار کے دو اخبارات ''مشیر'' اور ''اتحاد'' بھی تھے''۔

(محمد مرغوب، مضمون: بہار کی اردو صحافت آزادی سے پہلے، مشمولہ: زبان و ادب، اردو صحافت نمبر جنوری تا اپریل 2006، ص8۔)

اس پیراگراف سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ آزادی کی سرگرمیوں کو مضبوط کرنے میں بہار کے اخباروں کا بھی کا خاصا کردار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے پہلے بھی یہاں سے نکلنے والوں اخبارات نے حکومت وقت سے لوہا لیا اور انھیں سرنگوں کرنے میں قابل ذکر رویہ اپنایا۔ جس کی بنیاد پر ان اخبارات کو سرکار کی نگاہ مغوض ہونا پڑا۔

بہار کی اردو صحافت نے مسائل و موضوعات کے ساتھ اردو زبان کی ترقی میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی تحریک میں بھی یہاں کے اخبارات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بہار میں اردو تعلیم و تعلم کا ہی وسیلہ نہیں بلکہ کسی قدر دفتری کاموں میں بھی اردو کی ایک حیثیت ہے۔ اس ریاست سے ایک ساتھ کئی اخبار نکلنے کے باوجود ان کا سرکولیشن کبھی مایوس کن نہیں رہا ہے۔ یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ بہار میں اردو صحافت مقبول ہے۔

لیکن اس روشن تاریخ کے باوجود بہار کی اردو صحافت کا یہ المیہ رہا ہے کہ مؤرخین نے

اسے نظر انداز کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔اس کی جانب ڈاکٹر سید احمد قادری نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صوبہ بہار میں سیاسی وسماجی سطح پر جس طرح سے آزادی ہند کی جنگ لڑی گئی، اس کی تفصیلات مختلف کتابوں اور رسالوں میں موجود ہیں۔ خاص طور پر پٹنہ یونیورسیٹی کے شعبہ تاریخ کے استاد (اور اسی یونیورسیٹی کے سابق وائس چانسلر) ڈاکٹر کالینکر دت کی کتاب History of freedom movement in Bihar کے تین حصہ میں کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور ہندی اور انگریزی کے اخبارات پر انگریزوں کے سخت قوانین اور پابندیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔لیکن صحافتی جنگ میں پیش پیش اردو کے کئی اخبارات کا ذکر بشمول ڈاکٹر دت بہار کے کئی مورخوں نے نہیں کیا ہے اور نہ ہی اردو کے دوسرے صحافی یا دانشور نے اس جانب توجہ کی ہے۔ حالانکہ بہار کے کئی اردو اخبارات کے صفحات اس امر کے شواہد ہیں کہ محدود وسائل کے باوجود انہوں نے جنگ آزادی میں نہ صرف نمایاں رول ادا کئے بلکہ انگریزوں کے سخت قوانین اور پابندیوں کے وہ شکار بھی ہوئے۔''

اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک قومی سیمینار کے ذریعہ بہار کے اردو صحافت کا جائزہ لے کر ملک کی ترقی اور جمہوریت کے استحکام میں بہار کی اردو صحافت کی خدمات کا

تعین کیا جائے۔اس کے علاوہ موجودہ صحافت کے سمت و رفتار کا جائزہ لیا جائے تاکہ اسے مزید مہمیز مل سکے۔ساتھ ہی ساتھ بہار کی اردو صحافت کو جو مسائل ومشکلات درپیش ہیں ان کو سامنے لایا جائے اور ان امکانات کا تعین کیا جائے۔ بہار میں اردو صحافت کی تاریخ انتہائی روشن اور تابناک رہی ہے لیکن افسوس کہ بہار میں اردو صحافت کے تعلق سے کوئی قابل ذکر تحقیقی کام اب تک نہیں ہوا ہے۔اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ محسوس ہوا کہ سیمینار میں پیش کئے گئے تحقیقی مقالوں کو یکجا کیا جائے اور کتابی صورت دی جائے تاکہ اس سمت میں تحقیقی کام کرنے والوں کو کچھ رہنمائی مل سکے۔

بہار کی صحافت میں دربھنگہ کو کئی معنوں میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اس لیے ہم یہاں بعض باتوں کو اشاریہ کی صورت میں پیش کررہے ہیں۔حالانکہ کئی مقالات میں تفصیل سے ان باتوں پر توجہ کی گئی ہے۔تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ پٹنہ اور گیا ہی کی طرح دربھنگہ بھی عہد قویم ہی سے اردو زبان وادب اور صحافت کا ایک بڑا مرکز رہا ہے۔دربھنگہ میں اردو صحافت کی تاریخ شروع سے عروج و زوال کی مختلف منزلیں طے کرتی رہی ہیں۔دربھنگہ سے مختلف دور میں مختلف رسالے جاری کئے گئے لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے کئی رسائل زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکے۔آزادی سے قبل زیادہ تر مذہبی جریدے شائع کئے گئے جس کی کتابت وطباعت عموماً دربھنگہ سے باہر ہوتی تھی کیونکہ اس وقت کاتبوں اور اردو پریس کی خاص سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ اس کے باوجود دربھنگہ کی اردو صحافت کی تاریخ میں مولانا عبدالحلیم آسی مرحوم، سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری، محمد قمرالدین قمر، محمد نظیر وکیل، ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی، حکیم سوزاں سہسرامی، شمیم سیفی، عمر فرید، مجاز نوری، حکیم عبدالمنان صدیقی وغیرہ نے اہم رول

ادا کئے ہیں۔

سرزمین دربھنگہ کی گود سے کچھ ایسے صحافی اٹھے ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو صحافت کی کوئی تاریخ مکمل نہیں کی جاسکتی۔ دربھنگہ سے شائع ہونے والے رسالے ''الہدیٰ''، ''جہانِ اردو''، ''تمثیل نو'' اور ''دربھنگہ ٹائمس'' بھی آج کی ادبی صحافت میں تحسین کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آزادی کے بعد ''نئی کرن''، ''رفتار نو'' اور ''توازن'' وغیرہ جیسا معیاری رسالہ ناقدری کا شکار ہوگیا۔ اس علاقے سے شائع ہونے والے سیاسی اور مذہبی رسالے کی بھی عمر بہت مختصر رہی ہے جس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ دربھنگے میں ہمیشہ سے اردو پریس کی کمی اور اچھے کاتبوں کی قلت رہی ہے۔

ہندوستان کے دیگر اردو اخبارات و رسائل کے سامنے جو مسائل ہیں، دربھنگہ کی اردو صحافت بھی انہیں بنیادی مسائل سے دوچار ہے۔ دربھنگہ اور اس کے گرد و نواح میں اچھے مترجم اور تربیت یافتہ صحافی دستیاب نہیں ہیں چونکہ اچھی اجرت نہیں ملتی اس لئے اردو تعلیم یافتہ طبقہ اردو صحافت کو بحیثیت پیشہ اختیار کرنے کے لئے متوجہ نہیں ہوتا۔ اخباری کاغذ اور سرکاری اشتہارات بھی خاطر خواہ نہیں مل پاتے۔ اردو میں صحافت کی تعلیم کی عدم دستیابی بھی ایک اہم سوال ہے۔ اردو نیوز ایجنسی، نیوز سروس، ٹیلی پرنٹر، لیتھو طباعت کی بوسیدہ تکنیک، کالم نویسی، فیچر نگاری، رپورٹنگ اور اداریہ نگاری وغیرہ کا حال بھی تشفی بخش نہیں ہے۔ اردو میں عموماً ایڈیٹر ہی کو ساری ذمہ داری سنبھالنی پڑتی ہے۔ اسی لئے دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو صحافت کا معیار مشکوک ہے۔

میرے خیال میں ان تمام دشواریوں پر رفتہ رفتہ قابو پایا جاسکتا ہے جن کی مادری زبان

اردو ہے وہ اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنا شروع کردیں تو اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت میں خاطر خواہ ترقی ہوسکتی ہے اور ذرائع آمدنی سے اردو کے اخبارات و رسائل کے پست معیار اور خامیوں کو دور کر کے دیگر زبانوں کے اخبارات و رسائل کے شانہ بشانہ کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

اب دو باتیں اس کتاب میں شامل مقالے کے سلسلے میں عرض کردوں کہ ان میں سے بہت سے مقالے بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں اور بعض مقالات نئے لوگوں کے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ بعض مقالات کی شمولیت نے اس کتاب کو تحقیق و تنقید کی شعریات میں بھی بامعنی بنانے کی سعی کی ہے۔ اگر میں بغیر کسی ترتیب کے ان پر باتیں کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ اردو اخبارات اور قومی یکجہتی کے عنوان سے جو مقالہ ڈاکٹر عبدالحنان سبحانی نے قلم بند کیا ہے اس میں تاثراتی تنقید کی لہریں متوجہ کرتی ہیں۔ حالانکہ انہوں نے عملی مثالوں کو جمع کرنے میں بہت کوشش نہیں کی ہے اس کے باوجود اس مضمون کا رکھ رکھاؤ اور اسلوب بیان علمی ہے۔ صحافت، صارفیت اور صہیونیت کے عنوان سے ممتاز نقاد حقانی القاسمی نے بہت ہی علمی انداز میں یہ مضمون لکھا ہے اور کہیں نہ کہیں آج کی صحافت کی شعریات میں ان باتوں کو بیان کیا ہے جن کو نظر انداز کر کے آج کی صحافت کے منصب کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

''صحافت میں اخلاقیات کی جگہ اب صارفیت نے لے لی ہے جس کی وجہ سے صحافت کا انسانی چہرہ مسخ ہوگیا ہے۔ آزاد اور شفاف صحافتی قدروں کی خلاف ورزی عام ہوگئی ہے۔ لوگ کہنے لگے ہیں کہ صحافت اب خبروں کی تجارت بن گئی ہے اور تجارتی مفادات کا تحفظ ہی صحافت کا مقصد اولیں بن گیا ہے۔ اس کی بدترین شکل پیڈ نیوز ہے۔ ادارتی صفحات

کی خرید و فروخت کا یہ معاملہ نہایت خطرناک اور صحافتی اخلاقیات کے منافی ہے۔ پیڈ نیوز کا کینسر اتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ پریس کونسل آف انڈیا نے نہ صرف اس پر تشویش ظاہر کی ہے بلکہ اس پر نکیل کسنے کے لیے سرکار سے سخت اقدامات کی اپیل بھی کی ہے۔''

اس طرح ادبی صحافت کے اغراض و مقاصد کے عنوان سے ممتاز شاعر اور صحافی عطا عابدی نے بھی اپنے صحافتی تجربات کی روشنی میں ادبی صحافت کے ان مندرجات کو مرتب کیا ہے جن سے ہم اس کے اغراض و مقاصد کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح بہار میں اردو صحافت: ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک میں فکشن نویس اور ''ثالث'' کے مدیر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے مختصراً بعض ایسے اشاریئے فراہم کیے ہیں جن کی مدد سے ہم اردو صحافت کے تسلسل کو سمجھ سکتے ہیں۔ سمی اقبال نے کلام حیدر کی اداریہ نگاری کے تعلق سے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام کیا ہے اور ان کی اداریہ نویسی کا تجزیہ کیا ہے اور اپنی تنقیدی فہم کے ساتھ ان متعلقات کو بھی موضوع بنایا ہے جن سے ہم اداریہ نگاری کے خصائص کو سمجھ پاتے ہیں۔ بہار میں جرائد نسواں: صحافت کا ایک گمشدہ باب، جمیل اختر کا تحقیقی اور علمی مقالہ ہے۔ اس میں انہوں نے بعض اہم رسائل کے تعارف و تجزیہ کو روشن کیا ہے۔ یہ مقالہ بھی کئی معنوں میں نئے ذہنوں کے لیے رہنما ہے۔ ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر سید احمد قادری نے ''بہار کی اردو صحافت آزادی کے بعد'' کے عنوان سے بعض ایسی باتوں کو شرح و بسط سے قلم بند کیا ہے جن سے عام طور پر ہم واقف نہیں ہیں۔ ہمارے زمانے کے جید ناقد اور ادیب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے بہار میں اردو صحافت: سمت و رفتار کے عنوان سے کئی فکر انگیز باتیں لکھی ہیں اور اپنے خاص اسلوب و انداز میں موضوع کا حق ادا کیا ہے۔ بہار میں اردو صحافت: منظر، پس منظر، صفی اختر صاحب کا مقالہ

ہے۔ وہ خود ایک صحافی ہیں اس لیے ان کے مضمون میں وضاحتی انداز ایک بنیادی خوبی ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر نے اپنے مقالہ ''بہار میں اردو صحافت: مسائل اور امکانات'' میں بہار کی اردو صحافت، اس کے مسائل اور امکانات پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے ''بہار میں اردو صحافت کی تاریخ، ٹکنک اور معیار کا جائزہ لیا ہے۔'' ''بہار میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقا'' پر ڈاکٹر احسان عالم نے اچھی گفتگو کی ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ ''بہار میں اردو صحافت آزادی کے بعد'' انور الحسن وسطوی، ''سول معاشرہ: اردو میا کا کردار'' ڈاکٹر ریحان غنی، ''بہار میں اردو صحافت کے خدو خال'' شمیم قاسمی، ''بہار کی موجودہ اردو صحافت'' عبدالمتین قاسمی، ''بہار کے اردو اخبارات کا رول'' فردوس علی، ''متھلانچل کے پانچ رسائل'' سلمان عبدالصمد، ''اردو اخبارات کو درپیش مسائل'' محمد عبدالرحمٰن ارشد، ''اردو میڈیا اعتبار و معیار'' شکیل احمد سلفی، ''دربھنگہ ٹائمز: کی خدمات'' ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ''جدید ادب کے روشن مستقبل کا استعارہ: دربھنگہ ٹائمز ڈاکٹر محمد آصف ''اردو صحافت کی تاریخ نویسی میں بہار کا حصہ'' نور الاسلام ندوی، ''بہار میں اردو صحافت، مسائل، حل اور.... کامران غنی صبا، ''بہار میں اردو صحافت کی زبان کا معیار'' محمد فہام الدین (صدف فہام) ''بہار میں اُردو صحافت کا عصری منظر نامہ'' شاہد الاسلام وغیرہ کے مقالے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تمام مقالوں میں کچھ نہ کچھ ایسا ہے جن سے اتفاق اور اختلاف کی راہیں نکلتی ہیں۔ ہمارا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مقالات سے بہار کی ادبی صحافت موضوع بنے اور علم و ادب کے وسیع حلقے میں اس پر باتیں ہوں۔ اس کتاب کا ایک بڑا مقصد یہی ہے اور اس کا اشاعتی جواز بھی۔ حالانکہ یہ موضوع بڑا ہے اور ہم اس کا حق بھی ادا نہیں کر پائے ہیں اس لیے اس سلسلے کی ایک دوسری کتاب عنوان کی تخصیص اور مقالہ جات

کے اصول وآداب کے ساتھ منظر عام پر آئے گی۔اس سلسلے میں ملک بھر کے دانشوروں سے رابطہ کیا جا چکا ہے اور وہ تحقیق وتنقید کی روشنی میں دئے گئے موضوعات پر لکھ رہے ہیں۔

بہر کیف !اس کتاب کے مشمولات سے نہ صرف بہار کی اردو صحافت کی سمت ورفتار سامنے آتی ہے، بلکہ عمومی صحافت کا بھی چہرہ ہمارے سامنے نمایاں ہوجاتا ہے،جس سے ہم صحافت کے مستقبل کا صحیح اندازہ کرلیتے ہیں۔ یوں تو مختلف خطوں میں صحافت کے مختلف مسائل ہوسکتے ہیں،تاہم عمومی نظریہ سے دیکھنے کے بعد مشترکہ مسائل سے بھی آگاہی ہوجاتی ہے۔اس لیے ہمیں صحافت کے معیار ومقام کو بلند کرنے کے لیے ہر سطح پر شفافیت لانے کی کوشش کرنے کی چاہئے۔

منصور خوشتر

ڈاکٹر عبدالحنان سبحانی

اُردو اخبارات اور قومی یکجہتی

''اُردو اخبارات اور قومی یکجہتی'' کے عنوان پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ ''قومی یکجہتی'' کی اہمیت کو اُجاگر کیا جائے۔ہم جانتے ہیں کہ فرد سے گروہ اور گروہ سے سماج اور قوم کی تشکیل ہوتی ہے۔گویا افراد کی تنظیم ہی قوم کا دوسرا نام ہے جو بظاہر مختلف الخیال اور جدا جدا مکتبہ ہائے فکر ونظر کا مجموعہ ہوتی ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک ایسی مضبوط جماعت ہوتی ہے جو مصیبت اور احتیاج کے وقت ایک ناقابل تسخیر قلعہ بن کر محفوظ و مامون ہوتی ہے۔ جماعت میں طاقت، برکت اور استحکامت ہوتی ہے جو بیرونی حملوں کا پائے استقلال سے مقابلہ کرکے اپنا تحفظ کرتی ہے۔اس لئے ملک کی سلامتی وآزادی اور تحفظ کے لئے باہمی اتحاد اور یگانگت کی اشد ضرورت ہے۔ہمیں صوفی سنتوں اور اعلیٰ تعلیمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اتحاد ویکجہتی کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے۔

اگر ماضی میں گزرے ہوئے واقعات کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات آئینہ کی طرح سامنے آجائے گی کہ جو حالت مغلوں کے ایام حکومت میں انگریزوں کے باعث ہوئی تھی۔آج اسی طرح کا ماحول موجودہ دور میں بھی بنتا جارہا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ اُس زمانہ میں فتنہ خیزوں کا تعلق فرنگیوں سے تھا مگر آج کے فتنہ پروروں کا تعلق اُسی ملک، اسی مٹی اور اسی معاشرے سے ہے۔ لہٰذا اس ملک کی ہم آہنگی، قومی یکجہتی، اس کی ترقی اور سلامتی کے لئے ان شر پسندوں کے خلاف ادیبوں، شاعروں، مصنفوں، اخبار نویسوں، صحافیوں، سیاسی رہنماؤں اور طالب علموں کو خودغرضی سے پاک ہوکر سامنے آنا ہوگا اور اُنہیں قلمی، سیاسی، تدریسی اور اصلاحی جہاد چھیڑ کر ایسے لوگوں کو جگانا ہوگا جو آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں، زبان رکھتے ہوئے بھی گونگے ہیں، کان رکھتے ہوئے بھی بہرے ہیں، ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے بھی لولے لنگڑے ہیں، عقل رکھتے

ہوئے بھی بے وقوف ہیں، علم رکھتے ہوئے بھی جاہل ہیں اور کسی کے بہکاوے میں آ کر تشدد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اِن برائیوں کو دُور کرنے میں اخبارات کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اخبار ۱۸۵۷ء سے آج تک عوام کے دلوں کی دھڑکن کا فرض انجام دیتا آ رہا ہے اور قومی یکجہتی کے جذبات کو اُجاگر کرنے میں ہراوّل دستے کا کردار نبھاتا رہا ہے۔

جہدِ آزادی کے آغاز سے آج تک اُردو اخبارات نے قومی یکجہتی کے فرائض کو بحسن خوبی ادا کیا ہے کیوں کہ اُردو زبان جس کی بنیاد ہی قومی یکجہتی کے لئے پڑی اور ایسے ہاتھوں، زبانوں اور دِماغوں سے پڑی، جن کی انسان دوستی اور وطن پروری کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بج رہے تھے اور سیکڑوں سال گزر جانے کے بعد بھی جن کی یادیں بلا تفریق مذہب و ملت۔ مرجع خاص و عام ہیں۔ جن زبان کو خواجہ معین الدین چشتیؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فریدؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے فیوض و برکات کے وارث امیر خسروؒ نے سب سے پہلے اظہار محبت و خلوص کا وسیلہ بنایا اور ہندوستان کی عظمت و شوکت اور حسن و رعنائی کے سامنے عقیدت سے سر جھکاتے ہوئے اسے دنیا کا سب سے اعلیٰ اور افضل ملک گردانا اور یہاں کے باشندوں کو حسن اخلاق کا پیکر بتایا، خود کو کافر عشق کہنے پر فخر حاصل کیا اور فنون لطیفہ کے ذریعہ بھی اس میں نئی جان ڈالنے اور یک رنگی پیدا کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی، جس زبان میں محمد قلی قطب شاہ نے محبت کے گیت گائے اور یکجہتی کا سبق پڑھایا، جس کے ماتے پر میرؔ نے قشقہ لگایا اور جس زبان میں مصحفی نے ہندوستانیوں کو سب سے پہلے بتایا کہ:

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی   ظالم فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی

جس میں غالبؔ نے مٹی ہوئی ملتوں کو اجزائے ایماں کہا، اکبر الہ آبادی نے انگریزی تہذیب و تمدن کے غلبے کا سینہ طنز و مزاح کے تیر سے چھلنی کیا۔ جس میں انگریزوں کے سامراجی غلبہ کے دنوں میں منشی سجاد حسین کے ''اودھ پنچ'' اور سیماب اکبر آبادی کے ''شاعر'' نے ہجو ملیح کے ذریعہ ان کی رعب و داب کی کشتی میں سوراغ کئے ہوں، جس میں انیسؔ نے عرب تہذیب و تمدن کو ہندوستان کے رنگ میں رنگ کر داد پائی ہو، جس میں جوشؔ ملیح آبادی نے سماج کو للکار کر کہا ہو:

اے ہندوستان جس وقت کو مجھ کو پکارے گا ☆ مری تلوار غیروں کے سروں پر جگمگائے گی جس میں رام پرشاد بسمل نے وطن پر جان دینے والوں کے یہ ترانہ لکھا ہو:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے ☆ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اور جسے گاتے ہوئے وہ خود اور ان کے علاوہ اشفاق اللہ خاں، بھگت سنگھ، راج گرو، سکھ دیو، ہنستے ہوئے پھانسی پر جھلوے ہو۔ جس میں سب سے پہلے وہ تصور پیش کیا گیا ہو جس نے علامہ اقبال سے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' لکھوایا اور ان کے ذریعہ فلک پیما فلسفے کا درس دیا گیا ہو کہ:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ☆ ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور اس سے بھی بڑھ کر وطن دوستی کا یہ نعرۂ مستانہ بلند کیا ہو:

''خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے''

جس کو خونِ جگر پلا کر پروان چڑھانے والے ہزاروں میں سے ایک ہندو سپوت برج نرائن چکبست نے حب وطن پر یوں فخر کیا ہو:

دل کئے تسخیر، بخشا فیض روحانی مجھے ☆ حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

اور جس کا نعرہ ''انقلاب زندہ باد'' آزادی اور انصاف طلبی کے لئے سارے ملک میں آج بھی گونجتا ہو، ایسی زبان سے متعلق یہ لکھنا کہ اس کی صحافت کا قومی یکجہتی سے کیا تعلق ہے؟ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ دراصل اُردو زبان کا وطن دوستی اور قومی یکجہتی سے گوشت اور ناخن کا رشتہ ہے۔ ایسے عالم میں اُردو صحافت بھلا کیوں کر ان صفات سے محروم رہ سکتی تھی!!

جب ہم پیش رَو صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اُردو کا پہلا اخبار دو شریف ہندوؤں نے مل کر کلکتہ سے ''جام جہاں نما'' کے نام سے ۱۸۲۲ء میں نکالا۔ شروع میں اگرچہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہم زبان رہا مگر کمپنی کی شاطرانہ ہوسِ ملک گیری سے اُسے پیچھا چھڑانے اور قومی یکجہتی کے راستے پر آنے میں دیر نہیں لگی، جس کے پاداش اس کے مالک اور ایڈیٹر کو بڑی دُشواریوں اور قربانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اُردو کا دوسرا اخبار ''دہلی اخبار'' کے نام سے ۱۸۳۸ء میں مغلیہ دربار کی سرپرستی میں محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے نکالا، جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی پرزور حمایت کی اور جس کے نتیجے میں انگریزیوں نے مولوی محمد باقر کو شہید کر ڈالا۔ اس طرح حصولِ آزادی اور قومی یکجہتی کے لئے سب سے پہلے اُردو کے ایک صحافی ہی نے اپنی جان دی اور آزادی کے بعد بھی حیدر آباد کے اُردو اخبار ''اِمروز'' کے ایڈیٹر شعیب اللہ خاں نے اتحادالمسلمین کے رضا کاروں کے ہاتھوں خون میں نہا کر شہادت کا شرف حاصل کیا۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جن لوگوں نے لوگوں قومی یکجہتی کا بیڑا اُٹھایا، اُن میں پہلا نام نول کشور کا ہے جنھوں نے ''اودھ'' اخبار نکال کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے علوم وفنون اور مذہبی اعتقادات کی کتابیں شائع کیں۔ اِسی بناء پر اخبار ''اودھ'' اور منشی نول کشور کو ہندوستانی تہذیب و تمدن اور قومی یکجہتی کا مینارۂ نور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُسی زمانے میں سرسید احمد خاں نے بھی اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے قومی یکجہتی کا پیغام دیا۔ مولانا حسرت موہانی کا رسالہ ''اُردوئے معلی'' اس راستے پر انقلابی جوش وخروش کے ساتھ چلا اور نتیجے کے طور پر ان کو بھی ضبطی اور قید کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال''، ''منشی دیانرائن نگم کا رسالہ ''زمانہ'' اور نیاز فتح پوری کا ''نگار'' بھی اس سلسلے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیتے رہے جب گاندھی جی کی قیادت میں ۱۹۲۰ء کی سوراج اور خلافت تحریک چلی تو اُس وقت ملک کے تمام اُردو اخبارات نے آزادی اور قومی یکجہتی کے لئے ایسے حیرت انگیز کام کئے کہ انگریزوں کے دانت کھٹے ہوگئے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد مسلم لیگ کے زمانے میں ایسے اُردو اخباروں کی کمی نہیں تھی جو آزادی اور یکجہتی کے علمبردار وطرفدار نہ بنے رہے ہوں۔ ایسے اخبارات میں لاہور کے ''زمیندار''، ''سیاست''، ''بندے ماترم'' اور ''ملاپ'' دہلی کے ''الجمعیۃ''، ''انصاری''، ''تیج'' اور ''وطن'' لکھنؤ کے ''اودھ اخبار'' اور ''حقیقت'' کلکتہ کے ہند اور جمہوریت۔ پٹنہ کے ''صدائے عام'' اور ''ساتھی'' بمبئی کے خلافت''، ''ہلال'' اور ''اجمل'' حیدرآباد کے ''پیام'' اور حیات اللہ انصاری کا ہفتہ وار ''ہندوستان'' وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

الغرض ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لئے برسرپیکار رہنے کا سہرہ زیادہ تر اُردو اخبارات کے سر رہا ہے مگر آزادی کے بعد سیاسی جماعتوں کی کثرت، بغض، بدخواہی، غیر ملکی سازش اور اقتصادی کشمکش میں اضافے کی وجہ سے اخبارات بری طرح تقسیم ہوکر رہ گئے۔ پھر بھی ملک میں اکثریت ایسے ہی اخبارات کی ہے جو ملک اور قوم کو یکجہتی کے راستے پر چلانے کے لئے کوشاں ہیں۔

آج ہمارا ملک جس بحران سے گزر رہا ہے، اس میں قومی یکجہتی وقت کی اہم ضرورت بن گئی ہے۔ گرچہ اس کی ضرورت کا احساس ہماری حکومت کو بھی ہو رہا ہے اور وہ قومی یکجہتی کے لئے مسلسل کوشاں بھی ہے۔ اس کے باوجود بھی حالات جوں کے توں نظر آتے ہیں۔ آج ہمارے سامنے فرقہ وارانہ، صوبہ دارانہ اور مذہبی منافرت ایک بھیانک عفریت کی طرح منھ کھولے کھڑی ہے۔ دوسری طرف اکیسویں صدی اطلاعاتی ٹکنالوجی کی صدی بنتی جارہی ہے۔ اطلاعاتی انقلاب کے اس دور میں آج کا انسان خود کو ہمہ وقت تمام حالات و واقعات سے واقف رکھنے کے لئے موبائل، ٹل وی، انٹرنیٹ اور اخبارات سے خود کو جڑا رکھتا ہے۔ انسان کی تمام تر ذہنی اور مادی فتوحات کے حصول میں میڈیا فیصلہ کن رول ادا کر رہا ہے۔ الکٹرانک میڈیا کے اس مقبول دور میں بھی پرنٹ میڈیا کی اپنی ایک الگ شناخت اور مقبولیت ہے۔ لہٰذا آج کے عصری تقاضوں کے پیش نظر اخبار کی اپنی اہمیت مسلم ہے۔

کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ:

"What people learn, they should learn from news paper"

اسے اخبارات پڑھ کر جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہ ان کو اس لئے مفید سمجھتا ہے کہ وہ ان کو محفوظ رکھ سکتا ہے اور کسی کو بھی پڑھ کر سنا سکتا ہے۔ اس دور میں اُردو صحافت کے ہر شعبے میں جدید تر ٹکنالوجی کا استعمال ہو رہا ہے، کئی اُردو اخبارات کے انٹرنیٹ ایڈیشن بھی دستیاب ہو رہے ہیں۔ بہار اور جھارکھنڈ کی بات کی جائے تو فی الحال راجدھانی پٹنہ سے روزنامہ ''قومی تنظیم''، ''راشٹریہ سہارا''، ''فاروقی تنظیم''، ''پندار''، ''امین''، ''سنگم''، ''پیاری اُردو''، ''ہمارا سماج''،

''انقلاب''، ''صدائے عام'' وغیرہ اُردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں جو حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کر کے اتحاد و یکجہتی کے مختلف مسائل کو اُبھار کر اپنے اداریوں کے ذریعہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اور قارئین کو تعلیم دینے کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ گرچہ صحافت کو تعجیلی ادب (جلدی بازی میں تخلیق کئے گئے) کا نام دیا گیا ہے پھر بھی اس میں فرقہ پرستی، صوبائی تعصب، نفرت وتشدد، سرکاری بدعنوانیوں، غیر جمہوری اقدامات، وطن دُشمن حرکات، مہنگائی، قتل و غارت گری اور عصمت دری جیسے مسائل پر بھرپور مضامین اور تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں اور دُنیا کے کروڑوں عوام تک اُس کے مثبت پیغام پہنچتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ صحافی کا قلم قوموں کی تقدیم بناتا ہے، سماجی برائیوں کا قلعہ قمع کرتا ہے، عوام کے اتحاد، بھائی چارے اور یکجہتی کو مضبوط بناتا ہے اور اُنہیں تقویب پہنچاتا ہے۔

اُمید یہی کی جانی چاہئے کہ جوں جوں قومی شعور میں اضافہ ہوگا، اُردو اخبارات اپنی زبان کے بنیادی مقاصد اور روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنا فرض منصبی کو زیادہ جوش اور خلوص سے ادا کریں گے اور اس حقیقت کو فراموش نہ کریں گے کہ ہندوستان کے اتحاد، یکجہتی اور ترقی میں ملک کے سارے باشندوں کا فائدہ ہے۔ اس وقت چونکہ بعض قوتیں قومی یکجہتی کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس لئے اُردو اخبارات کی ذمہ داری کافی بڑھ جاتی ہے۔ اُردو صحافت کی روایت ہی قومی یکجہتی ہے اور اس کا ملک :ع

''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے''

☆☆☆

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

بہار میں اُردو صحافت: سمت ورفتار

دنیا کا سب سے پہلا اخبار ''ایکٹا ڈیمنا (Acta Dimna)'' ملک روم کے قدیم باشندوں نے حضرت عیسیٰ مسیح سے 751 برس پہلے جاری کیا تھا۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ Acta Dirna سے مرکب ہے۔ اوّل الذکر کے معنی کارروائی اور موخر الذکر کے معنی روزنامہ ہیں۔ اس قلمی اخبار میں سرکاری اطلاعات اور میدان جنگ کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔

دُنیا کا پہلا مطبوعہ اخبار ۱۶۰۹ء میں Avis a relation order zeilling کے نام سے جرمنی سے نکلا، ۱۶۱۱ء میں News from spain کے نام سے انگلستان سے شائع ہوا، لیکن انگریزی کا باضابطہ مطبوعہ اخبار ''ویکلی نیوز'' ۱۹۶۰ء میں اور فرانس میں ''گزٹ دی فرانس'' ۱۶۳۱ء کے نام سے ۱۶۹۰ء میں نکلا۔ دوسرا اخبار ''بوسٹن سے Public occurance کے نام سے ۱۶۹۰ء میں نکلا، دوسرا اخبار ''بوسٹن نیوز لیٹر'' ۱۷۰۴ء میں شمالی امریکہ سے شائع ہوا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت سے پہلے کوئی اخبار نہیں تھا۔ ''انڈیا گزٹ'' پہلا ہندوستانی اخبار تھا۔ انگریزی میں ہی ''بنگال گزٹ'' ۱۸۱۶ء میں نکلا۔ اسی کا بنگلہ نام ''بنگال سماچار'' رکھا گیا۔ ۱۸۱۸ء میں عیسائی مشنریوں نے ''سماچار درپن'' بنگالی میں جاری کیا، ۱۸۲۱ء میں ایک اور بنگلہ ہفتہ وار اخبار ''سمبد کمودی'' کا اجرا ہوا۔ اپریل ۱۸۲۲ء میں راجہ رام موہن رائے نے فارسی ''مراۃ الاخبار'' جاری کیا۔ لیکن اس سے قبل منشی سدا سکھ مرزا پوری نے ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے ہی اُردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' شائع کیا تھا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ ابتداء میں 8x11 انچ تقطیع کے چھ صفحات پر طبع ہوتا تھا۔ ہر ہفتہ پر دو کالم اور ہر کالم میں عموماً ۲۲ سطریں ہوتی تھیں ''جام جہاں نما'' اور ''مراۃ الاخبار'' کے بعد ایک فارسی اخبار ہفتہ وار ''شمس الاخبار'' نکلا۔ ۱۸۲۷ء میں نکلنے والے اس اخبار کی ضخامت ۱۲ صفحات ہوتی تھی۔ ''آئینۂ سکندر'' بھی ہفتہ وار تھا جو ۱۸۳۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۶ صفحات

کے اس اخبار میں مرزا غالب کا کلام چھپتا تھا۔ ہفتہ وار ''عالم افروز'' مارچ ۱۸۳۳ء میں نکلا جو ۱۶ صفحات پر شائع ہوا تھا۔۱۸۳۳ء میں لدھیانہ سے ''لدھیانہ اخبار'' نکلا۔ یہ بھی ہفتہ وار تھا۔اسی طرح کلکتہ اور آگرہ سے مختلف فارسی اخبارات نکلتے رہے۔''سلطان الاخبار'' کلکتہ سے ۱۹۳۵ء میں اور ''زبدۃ الاخبار'' آگرہ سے ۱۸۳۳ء میں نکلا۔''سراج الاخبار'' دہلی سے ۱۹۶۱ء میں اور ''احسن الاخبار'' بمبئی سے ۱۸۴۴ء میں جاری ہوا۔ان سے پہلے ''دہلی اخبار'' ۱۸۳۷ء میں، ''سید الاخبار''، ۱۸۳۷ء میں اور اسی سال ''دہلی اردو اخبار'' نکلا تھا اور لکھنؤ سے اُردو کا پہلا اخبار ''لکھنؤ اخبار'' لال جی نے ۱۸۴۷ء میں نکالا تھا۔

ان سب کے بعد صوبہ بہار سے اُردو کا پہلا اخبار جولائی ۱۸۵۳ء میں آرہ سے ''نورالانوار'' کے نام سے نکلا جس کے مالک سید محمد ہاشم بلگرامی اور مدیر سید خورشید احمد تھے۔۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۶ء تک یعنی تین سال کی مدت میں مزید تین اخبار ''ہرکارہ'' (پٹنہ ۱۸۵۵ء)، ''اخبار بہار'' (پٹنہ ۱۸۵۶ء) اور ''ویکلی رپورٹ'' (گیا، ۱۸۵۶ء) شائع ہوئے جن کا سہرا شاہ ابوتراب لالہ بندا پرساد حسرتی اور منشی جے جے رام کے سر ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت بہار کی اُردو صحافت کی عمر صرف تین چار سال تھی اور جو ایسے نومولود بچے کی طرح تھی جس نے چلنا تو دور کھسکنا ہی شروع کیا تھا اور پھر اس وقت حالات بھی ایسے تھے کہ اردو صحافت پر انگریزوں کے ظلم و ستم کی تلوار لٹک رہی تھی۔ محققین نے بہار کی ابتدائی اُردو صحافت پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ امداد صابری نے ''تاریخ صحافت'' میں ''نورالانوار'' کے متعلق اپنی رائے نہیں دی ہے۔ کتاب ''ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)'' میں عتیق صدیقی نے بہار کے کسی اخبار کا ذکر نہیں کیا ہے۔عتیق صدیقی کی ایک دوسری کتاب ''اٹھارہ سو ستاون: اخبار اور دستاویز'' میں بیس اخبار کا تذکرہ ہے مگر اس فہرست میں بہار کا ایک بھی اخبار شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب ''صحافت پاکستان و ہند میں'' بھی بہار کی صحافت کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ ہاں ''روزناموں کی ابتدا'' کے باب میں (صفحہ ۱۶۴) ۱۸۷۶ء میں پٹنہ سے جاری ایک روزنامہ ''انیس بہار'' کا ذکر ملتا ہے۔لیکن نادر علی خاں کی

تصنیف ''اُردو صحافت کی تاریخ'' میں بھی بہار کی اُردو صحافت کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ حالاں کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۸ء کے غدر تک بہار کے چار اخبار کی نشاندہی بعض محققوں نے مضامین لکھ کر اور اپنی کتابوں میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ ڈاکٹر مظفر اقبال نے اپنی کتاب ''بہار میں اُردو نثر کا ارتقاء'' میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۶ء تک کے نثری دور کا احاطہ کرتے ہوئے صحافت کے ارتقا کا بھی جائزہ لیا ہے اور انہوں نے ۱۵۸ ایسے اخبار و رسائل کی نشاندہی کی ہے جو اس دوران یعنی ۱۹۱۶ء تک منظر عام پر آتے رہے۔ ڈاکٹر ریحان غنی نے ''اُردوئے معلیٰ کی ادبی خدمات'' میں ''ہرکارہ'' پٹنہ کے چند شمارے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہونے کی بابت بتایا ہے۔ ڈاکٹر محمد نورالاسلام نے اپنی کتاب ''معاصر کا توضیحی اشاریہ'' میں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۹۹ء تک کے کئی اخبار و رسائل کی تفصیل دی ہے اور ڈاکٹر سید احمد قادری کی کتاب ''اردو صحافت بہار میں'' مزید جانکاری مہیا کرتی ہے۔ اس میں ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک بہار کے ۱۴۳۸ اخبارات و رسائل کی فہرست حروف تہجی سے، مقام اشاعت، سنہ اشاعت، میقاتی اور نام مدیر کے کالم کے تحت دی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر اخبار و رسائل کے سرنامے کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن غوثی کی کتاب ''بہار میں بچوں کا ادب'' میں بھی بعض اخبار و رسائل کا ذکر ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر عشرت آرا سلطانہ کی کتاب ''اُردو ادب کی تاریخ میں نالندہ ضلع کی خدمات'' میں پندرہ اخبار و رسائل کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

اس طرح یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۳ء سے بہار میں اردو صحافت کا باب روشن ہے۔ ''نورالانوار''، ''ہرکارہ''، ''اخبار بہار'' اور ''ویکلی رپورٹ'' کے بعد ''اخبار الاخبار'' (مظفر پور۔ ۱۸۶۵ء)، ''عظیم الاخبار'' (پٹنہ ۱۸۶۷ء)، ''نیر الفوائد'' (آرہ۔ ۱۸۶۷ء)، ''نادر الاخبار'' (مونگیر ۱۸۷۲ء)، ''دینی بہار'' (آرہ۔ ۱۸۷۶ء) ''انیس بہار'' (پٹنہ۔ ۱۸۷۶ء)، ''مجمع الفوائد'' (مونگیر۔ ۱۸۷۶ء)، ''قاصد'' (پٹنہ ۱۸۷۶ء)، ''بہار پنچ'' (پٹنہ ۱۸۷۶ء)، ''نسیم سحر'' (۱۸۷۷ء)، ''نظائر ہند'' (صاحب گنج ۱۸۷۶ء)، ''مشیر بہار'' (پٹنہ ۱۸۸۰ء)، ''صبح وطن'' (پٹنہ ۱۸۸۱ء)، ''انڈین کرانیکل'' (پٹنہ ۱۸۸۱ء)، ''گلدستہ بہار'' (بہار شریف ۱۸۸۳ء)، ''مہر منور'' (مظفر پور ۱۸۸۴ء)، ''الپنچ'' (پٹنہ ۱۸۸۵ء)، ''نورالاسلام'' (پٹنہ ۱۸۸۵ء)، ''صدق'' (بہار

شریف ۱۸۸۵ء)، ''نالہ عشاق'' (پٹنہ ۱۸۸۵ء)، ''تحفیہ حنفیہ'' (پٹنہ ۱۸۸۷ء)، ''انیس'' (پٹنہ ۱۸۸۷ء)، ''الہادی'' (پٹنہ ۱۸۹۶ء)، ''اصلاح'' (پٹنہ ۱۸۹۷ء)، ''ادیب'' (پٹنہ ۱۸۹۷ء)، ''اشرف'' (بہار شریف ۱۸۹۷ء)، ''مخزن تحقیق'' (پٹنہ ۱۸۹۷ء)، ''نغمۂ آرزو'' (بہار شریف ۱۹۰۱ء)، ''نسیم سحر'' (گیا ۱۹۰۱ء) ''تاج'' (پٹنہ ۱۹۰۲ء)، ''رفتار زمانہ'' (پٹنہ ۱۹۰۳ء)، ''بہار اور دامن بہار'' (پٹنہ ۱۹۰۳ء)، ''شیعہ'' (کھجوہ، سارن ۱۹۰۴ء)، ''الشمس'' (کھجوہ، سارن ۱۹۰۶ء)، ''تعارف'' (پھلواری شریف، ۱۹۱۲ء)، ''بے باک'' (پٹنہ ۱۹۱۴ء) وغیرہ۔

آج ۲۰۱۴ء ہے۔ ایک سو سال سے پہلے بہار میں اُردو صحافت تسلسل اور رفتار کا آئینہ تھا۔ میں نے چند اخبار و رسائل کے نام گنوائے ہیں۔ اس کے بعد ایک سو سال کے اندر بے شمار اخبار و رسائل بہار سے نکلے۔ بہت سے بند ہو گئے لیکن ان گنت ابھی بھی شائع ہو رہے ہیں۔

بہار کی اُردو صحافت نے مفلسی، پس ماندگی اور ناخواندگی کے عیوب کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کے تدارک کی راہ سجھائی ہے۔ اصلاح معاشرہ کا کام کیا ہے۔ قارئین میں سائنسی فکر پیدا کی ہے۔ سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی بصیرت کے لئے مواد فراہم کیا ہے۔ باشعور اور ذمہ دار شہری بننے کے لئے ہمنوائی کی ہے۔ سماجی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے۔ حصولِ علم کی افادیت بتائی ہے۔ اعتبار اور وقار بڑھایا ہے۔ توازن اور توقیر عطا کی ہے۔

بہار کی ابتدائی اردو صحافت نے غلامی سے تنگ آئے ہوئے عوام کی ترجمانی کی ہے۔ آزادی کی روح پھونکی ہے۔ وطن پرستی کی جوت جگائی ہے، انقلابی آواز پیدا کی ہے۔ انگریزی حکومت کو حواس باختہ کیا ہے۔ قوم کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کی ہے۔ اُردو زبان کے دائرہ کو وسیع کیا ہے اور سرفروشانہ سرگرمیوں کی مثال قائم کی ہے۔ ساتھ رہی مذہبی روایات اور تاریخی واقعات کے باب کو زریں بنایا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ بہار کے اُردو صحافیوں نے ہر دَور میں دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ بنایا ہے۔ ظلم و جور اور استبداد کو بھی برداشت کیا ہے۔ لیکن ان سب کے تنقیدی شذرات حکومت کے لئے ناقابل برداشت بھی ہوئے ہیں۔ صحافت ایسا بیابان جنگل ہے جہاں نوکیلے کانٹے جسم کو لہولہان

کرنے کے لئے ناخن تیز کر کے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس آگ کے دریا میں دل تڑپ کر باہر آنا چاہتا ہے۔ سوز اپنا اظہار چاہتا ہے، درد دوسروں کے دل میں منتقل ہونا چاہتا ہے تاکہ قوم میں بیداری آسکے۔ سیکولرزم بحال رہ سکے اور عوام کے ذہن کو تعمیری بنایا جاسکے۔ دراصل صحافت میں زندگی کے سیاسی، سماجی، ثقافتی قومی، بین الاقوامی، سائنسی مذہبی، کھیل کود، عورتوں کے مسائل، بچوں کے بالواسطہ امور سبھی قسم کے افکار و خیالات جگہ پاتے ہیں، جس کا تعلق اطلاعات کی فراہمی اور رائے عامہ کی ترتیب و تشکیل سے ہوتا ہے۔ اس میں کسی ادیب کا ادب، مفکر کا خیال، مبصر کا تبصرہ، مدبر کی تدبیر، فلسفی کا فلسفہ، مولوی کا وعظ، مصلح کی اصلاح اور لیڈر کی تقریر سبھی کچھ جگہ پاتی رہی ہیں۔

بہار کے اخبار و رسائل نے جذبہ حریت بیدار کرنے کا فرض انجام دیا ہے۔ بے باک، جری، بے خوف اور نڈر ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلۂ جوالہ بنایا ہے۔ سماج کی آئینہ داری کی ہے اور ادب کی خدمت کی ہے، اُردو زبان کی جڑ کو مستحکم کیا ہے اور معنی آفرینی کے قفل کھولے ہیں، جس کے اندرون میں تعلیمی، تاریخی، تہذیبی، لسانی، ادبی اور انقلابی آواز اور وحدت کی جلوہ نمائی دیکھی جاسکتی ہے۔

لیکن حالیہ برسوں کے بہار میں بھی زرد صحافت نے پر پرزے نکالے ہیں، اُردو صحافیوں کی بیشتر تعداد، خدمت خلق کے جذبے سے محروم ہوتی جارہی ہے، محرکات و مقاصد میں تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی نشاندہی بہت قبل کر دی تھی۔

''اخبار نویس کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے اور چاندی اور سونے کا تو سایہ بھی اس کے لئے سم قاتل ہے جو اخبار نویس رئیسوں کی ضیافتوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی اعانت، قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں۔ وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نورِ ایمان کو بیچیں، بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر، رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچے ''کام ایڈیٹری کا'' کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔
(الہلال، ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء)

جب صحافت تجارت بن جاتی ہے تو اس میں زرد صحافت کا پیدا ہونا فطری ہے۔ دوسری

تجارت کی طرح صحافت میں سرمایہ لگانے والے یا بغیر سرمایہ لگائے ہوئے دُکان سجانے والے
تاجر، چاہے وہ فرد ہوں یا کمپنی، عوام کی خدمت کے بجائے اپنے منافع کو اوّلیت دیتے ہیں، قلم کو اور
اخبار کے صفحات کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں تو یہی زرد صحافت ہے۔ معیار کی پستی اور بے
ذوقی کے ساتھ دورِ حاضر کے پرآشوب حالات، زندگی کے گونا گوں مسائل اور الجھنوں نے بھی
لوگوں کے ذوق مطالعہ کو متاثر کیا ہے۔ تعلیم کی کمی، مذاق اور سوچ کی پستی، سطحیت پسندی اور زندگی
کی کشاکش کے ساتھ حرص، ڈر اور دباؤ کی وجہ سے زرد صحافت پنپتی ہے جس کے نمونے ہم اپنے
آس پاس دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔

لیکن بہار میں اُردو صحافی ایماندار رہے ہیں اور خود کو زرد صحافت سے دور رکھنے میں بہت حد
تک کامیاب ہیں۔ ایسے چند صحافیوں میں مولوی عبدالغنی (کرن، گیا)، سلطان احمد (سیرت،
پٹنہ)، مطیع الرحمٰن شمیم (سویرا، روشنی، پٹنہ)، اکمل یزدانی (ساحل، کشن گنج)، قیوم خضر (اشارہ،
پٹنہ)، سید عمر فرید، اشرف فرید، اجمل فرید (قومی تنظیم، دربھنگہ، پٹنہ)، ولایت علی اصلاحی (انسان کی
آواز، گیا)، سہیل عظیم آبادی (ساتھی، تہذیب، حال وغیرہ پٹنہ)، رضی حیدر۔ محمد مرغوب (صدائے
عام، پٹنہ)، خالد رشید صبا (ساتھی، پٹنہ)، غلام سرور (سنگم، پٹنہ)، رضوان احمد (عظیم آباد
ایکسپریس، پٹنہ)، عثمان غنی۔ شاہین محسن (قومی آواز، پٹنہ)، ریاض عظیم آبادی (سیکولر محاذ، پٹنہ)،
سید مشتاق احمد (امن چین، پٹنہ)، ظفر فاروقی (فاروقی تنظیم، پٹنہ)، وفا ملک پوری (صبح نو، پٹنہ)،
ضیاء الرحمٰن غوثی (مسرت، پٹنہ)، ادریس سنہاروی (سہیل، گیا)، کلیم الدین احمد (معاصر، پٹنہ)،
قاضی عبدالودود (معیار، پٹنہ)، وہاب اشرفی (صنم، مباحثہ، پٹنہ)، کلام حیدری (مورچہ، آہنگ،
گیا)، عبدالمغنی (مریخ، پٹنہ)، ہوش عظیم آبادی۔ مشتاق احمد نوری (بہار کی خبریں، پٹنہ)،
ظفر ادگانوی (اقدار، پٹنہ)، شاہد جمیل (جدید اسلوب، سہسرام)، سید احمد قادری (بودھ دھرتی، ادبی
نقوش، گیا)، رضوان رضوی (بچوں کا ڈائجسٹ، بہار شریف)، معین شاہد (آدرش، گیا)، ریحان
غنی (پندار، پٹنہ)، شمس الہدیٰ استھانوی (کوہکن، ہمارا نعرہ، پٹنہ)، اظہار احمد (پیاری اُردو، پٹنہ)،
سید شہباز (انقلاب جدید، پٹنہ)، مشتاق احمد (جہانِ اُردو، دربھنگہ)، امام اعظم (تمثیل نو،

دربھنگہ)، منصور خوشتر (دربھنگہ ٹائمز، دربھنگہ)، علیم اللہ حالی (انتخاب، پٹنہ)، رضی احمد تنہا (ابجد،
ارریہ)، خورشید اکبر (آمد، پٹنہ)، حسن رضا (اصناف ادب، مظفر پور)، مناظر عاشق ہرگانوی
(کوہسار جرنل، بھاگلپور) وغیرہ اپنی پہچان رکھتے ہیں۔

بہت ساری خوبیوں کے باوجود بہار کی اُردو صحافت میں بہت سی خامیاں، کمیاں اور کمزوریاں بھی
ہیں۔ جن سے معیار اور وقار پر اثر پڑتا ہے۔ ایک وجہ صحافت کی تکنیکی تعلیم کا فقدان ہے۔ خصوصی طور
پر نہ اس کا نظم ہے اور نہ ہی اس تعلیم کو حاصل کرنے کا جذبہ ہے۔ بعض یونیورسٹیوں میں صحافت
پڑھائی ضرور جاتی ہے لیکن نہ اس سبجیکٹ کے لئے کوئی استاد ہے اور نہ ہی سکھانے کا کوئی اہتمام
ہے۔ طالب علم بندھے بندھائے نوٹس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ نہ کبھی کسی اخبار کے دفتر جاتے ہیں
اور نہ ہی پریس کے کام کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ بس خانہ پری ہو جاتی ہے۔ اس طرح بالغ نظری نظر
نہیں آئی ہے، قدر و قیمت کا بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور نہ ہی رجحان یا میلان کا پتہ چلتا
ہے۔ ایک اور وجہ اردو اخبار کے مالکان کے ذریعہ اُردو صحافیوں کا استحصال ہے۔ اخبار کے مالکان
زیادہ تر ایسے لوگوں کو کام دیتے ہیں جو بے روزگار ہیں اور جنہیں معمولی تنخواہ دے کر زیادہ سے زیادہ
محنت کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ پڑھے لکھے یہ لوگ ترجمہ کرنے اور نیوز بنانے سے لے کر پروف
ریڈینگ تک کا کام کرتے ہیں۔ اداریہ تو لکھتے ہی ہیں جس پر کسی کا نام نہیں ہوتا۔ اس کا سارا
کریڈٹ اخبار کے ایڈیٹر یا مالک کو جاتا ہے۔ مالک سرمایہ لگاتا ہے اور اشتہار حاصل کرنے کے
لئے تگ و دو کرتا ہے۔ اخبار میں کام کرنے والوں کے مسائل سے انہیں دلچسپی نہیں رہتی۔ معمولی
تنخواہ دیتے وقت ان کا خون جلتا ہے۔ یہ بھی دلچسپ حقیقت ہے کہ عام طور پر اُردو اخبار کے مالکان
ہی مدیر بھی ہوتے ہیں۔ ان کا صرف نام ہوتا ہے۔ باقی تمام کام معمولی تنخواہ پانے والے صحافی
انجام دیتے ہیں۔ اُردو اخبارات چوں کہ منظم طریقے اور مطلوبہ سرمائے سے نہیں نکالے جاتے اس
لئے اکثر مالی بحران کا شکار رہتے ہیں۔

ایک وجہ عالموں اور دانشوروں کی اُردو صحافت سے عدم وابستگی بھی ہے۔ صوبہ بہار میں بھی
دانشور طبقہ اخبار سے وابستہ نہیں ہے۔

''قومی تنظیم''، پٹنہ کے مدیر اشرف فرید نے دوسری وجہ بتائی ہے:

''اُردو صحافت کی لاچاری کی وجہ صرف اور صرف ترجمہ نگاری ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی فکر متاثر ہوتی ہے۔ بلکہ پوری اُردو صحافت نقالی یا چربہ معلوم ہوتی ہے جو صحافت کی روح کے منافی ہے۔ اُردو صحافت میں اجتہاد کے علاوہ، الفاظ کی یکسانیت کے بجائے محاوراتی یکسانیت ضروری ہے تاکہ اُردو صحافت کے تار و پود ایک نظر نہ آنے والے دھاگے سے بندھ سکیں اور غیر ارادی طور پر اس کی اجزائے ترکیبی میں یکسانیت کا احساس ہو......ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مغرب زدہ اصطلاحات یا مغربی میڈیا کی تھوپی گئی اصطلاحات سے بچیں۔ اس طرح کی اصطلاحات کو ہم خود وضع نہیں کررہے ہیں بلکہ ان کا ترجمہ کررہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک معیاری صحافتی زبان دریافت کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور ہم نے ترجمہ کرکے اپنا دامن جھاڑ لیا ہے جس سے اخبار پڑھنے والا ایک بھٹکاؤ میں مبتلا ہے۔ وہ اس بات سے قطعاً ناواقف رہتا ہے کہ ان مغربی اصطلاحات کو مغربی میڈیا کس سیاق وسباق میں استعمال کرتا ہے اور آیا ہمیں اسے قبول کرنا چاہئے یا نہیں؟''

ڈاکٹر ریحان غنی (پٹنہ) نے بھی ایسی ہی وجہیں بتائی ہیں۔ ان کے الفاظ اس طرح ہیں جن سے دیگر وجوہ پر روشنی پڑتی ہے۔

''اُردو اخبارات میں فیچر لکھنے والوں اور اسٹاف رپورٹر کی کمی ہے جس کی وجہ سے وہ چیزیں اخبارات میں آنے سے رہ جاتی ہیں جو خبر رساں ایجنسیوں سے خبریں حاصل کی جاتی ہیں......اس وقت بہار میں حکومت سے منظور شدہ ۵۰ سے زیادہ اردو اخبارات ہیں جنہیں محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ اور دوسرے سرکاری محکموں سے اشتہارات ملتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اُردو اخبارات کے مالکان خود ہی ایڈیٹر بھی ہوتے ہیں خواہ وہ صحافت کی ''الف''، ''ب'' سے بھی واقف نہ ہوں۔ دراصل ان کی نظر اخبار کے معیار پر نہیں بلکہ اشتہارات پر ہوتی ہے......اُردو اخبارات چوں کہ کالم نویسوں کو معاوضہ نہیں دیتے اس لئے سیاسی، معاشی، تعلیمی، اقتصادی اور دوسرے اہم موضوعات پر انہیں معیاری فیچر یا مضامین نہیں ملتے جس کی وجہ سے وہ انگریزی اور ہندی اخبارات

سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ حالاں کہ اُردو صحافیوں میں سیاسی، معاشرتی اور سماجی شعور کی کمی نہیں ہے، کمی اُجرت کی ہے۔''

ریاض عظیم آبادی (پٹنہ) وجہ بیان کرنے کی مثال دیتے ہوئے تلخ لہجے میں بتاتے ہیں:

''۲۱ روزناموں کے مالک اُردو نہیں جانتے۔ ۱۳ روزناموں کے ایڈیٹر اُردو سے واقف نہیں۔ مزید ۱۳ روزنامے ایسے ہیں جن کے ایڈیٹر نام سے مسلمان ہیں مگر مالک غیر اُردو داں ہیں۔ اس طرح بہار میں ۴۷ روزنامے شائع ہورہے ہیں جن میں ہر ایک ۱۵ ہزار سے ۴۰ ہزار تک شائع ہونے کا دعویٰ کررہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں پچاس سے زیادہ نہیں چھپتے۔ اس طرح جاہلوں کی پوری فوج اُردو صحافت کا شیرازہ بکھیر رہی ہے۔''

ایسی صورت حال بہار سے باہر بھی ہے۔ لیکن بہار میں اُردو صحافت نئے رجحانات، تحریک، تنظیم، نظریات، فکری نظام اور پیکری صورت کے ساتھ وسیع طبقے کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے جس میں پورا معاشرہ ہے۔ اور جس کے اغراض ومقاصد کی حصولیابی کے لئے اپنے طریقے، نکتے اور باز آفرینی ہے۔ ساتھ ہی سماج کی خاص گرہیں کھولنے کی سعی بھی ہے۔

(کوہسار، بھیکن پور ۳، بھاگلپور، بہار)

☆☆☆

ڈاکٹر سیّد احمد قادری

ے نیو کریم گنج۔ گیا (بہار)

بہار کی اردو صحافت آزادی کے بعد

بہار کی اردو صحافت کی ایک شاندار تاریخ رہی ہے۔ اپنے ملک کی آزادی کے لئے بہار کی اردو صحافت، ۱۸۵۳ء سے اعلان آزادی تک جن مصائب اور دشوار گزار راستوں سے گزری ہے، انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس اردو صحافت نے بہار میں صحافت کی داغ بیل ڈالی، آج وہی اردو صحافت زبوں حالی کی شکار ہے۔ یہ اطلاع یقیناً دلچسپ ہوگی کہ صوبہ بہار میں اردو اخبار '' نورالانوار '' نے ہی ۱۸۵۳ء میں صحافت کی نیو ڈالی، اس اردو اخبار کے اجرأ کے عرصہ بعد یعنی ۱۸۷۲ء سے انگریزی صحافت'' بہار ہیرالڈ ''(Bihar Herald) سے شروع ہوئی اور اس کے ٹھیک دو سال بعد یعنی ۱۸۷۴ء سے ہندی صحافت '' بہار بندھو '' کے ذریعہ بہار میں متعارف ہوئی، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو صوبہ بہار میں اردو زبان نے صحافت کی نیو ڈالی، لیکن چونکہ اس وقت میرا موضوع بہار کی اردو صحافت آزادی کے بعد ہے، اس لئے اب میں اپنے اصل موضوع پر آتا ہوں۔

آزادئ ہند کے اعلان سے قبل ۱۹۴۶ء اور اس کے بعد بھی ملک کے اندر جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، اس سے پنجاب اور بنگال کے ساتھ ساتھ بہار بھی بری طرح متاثر ہوا۔ برسہا برس لڑی جانے والی جنگ اور ایثار و قربانی کی کامیابی کی خوشی بے روح، بے رنگ، پھیکی اور مدھم تھی۔ جس مقصد کے حصول کے لئے مختلف مذاہب اور فرقہ کے لوگوں نے پورے اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ قربانیاں دیں، اس کی کامیابی کا جشن تو منایا گیا، لیکن زخم خوردہ اور روتے ہوئے دلوں کے ساتھ! آزادی کی صبح کا المیہ تو یہ تھا کہ ہمارے ایک بڑے شاعر نے اسے ''داغدار اجالا'' کے لقب سے نوازا، اور شاعر کی آواز ہر دل کی آواز محسوس ہو رہی تھی۔

اس المیہ نے بہار کے عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے اردو صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے حسّاس وجود کو بھی متزلزل کر دیا۔ ہر طرف انتشار، خلفشار، بدامنی، بے بسی، بے پناہی، ظلم و تشدد، قتل و غارت گری، افراتفری، خوف و ہراس اور سراسیمگی کا ماحول تھا۔ بہار کے مسلمانوں کے لاکھوں گھروں کی تباہی کی کہانیاں اخباروں کے صفحات پر چھائی ہوئی ملتیں۔ اُجڑنے والوں میں عام مسلمانوں کے علاوہ بڑے بڑے نواب، رؤسا، ادیب، شاعر، دانشور اور صحافی بھی تھے، جن کے نہ صرف احساسات، بلکہ ان کا وجود پارہ پارہ ہو گیا تھا اور ان کے سامنے اپنے وجود کی بقاء کے لئے ہجرت (پاکستان) کے سوا دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ پاکستان جانے والوں کو ایک طرف جہاں یہ ملال تھا کہ تحریک آزادی کے اوائل اور درمیانی دور میں جو اتحاد، یکجہتی، دوستی، اخوت اور بھائی چارگی تھی، وہ مسلم لیگ اور کانگریسی رہنماؤں کی کرسی کی ہوس کے نتیجہ میں تحریک آزادی کے آخری اور فیصلہ کن دور میں قائم نہیں رہ سکی اور پوری فضا کو فرقہ واریت کے زہر سے بھر دیا گیا۔ دوسری جانب اس بات کا بھی افسوس تھا کہ وہ اپنے اس ملک، اس جگہ کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہیں، جہاں ان کی اپنی تہذیب، معاشرت، روایات، تمدن اور ثقافت کی جڑیں گہرائی تک پیوست ہیں۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جن کے راستے، ان کے آبا و اجداد کی قبریں، ان کی یادیں، ان کی وراثت روک رہی تھیں۔ بے سروسامانی کا عالم اور وجود کی بقاء۔ سرحد کے اُس پار جہاں ان کی جڑیں پیوست ہیں، یا سرحد کے اِس پار، جہاں اجنبی لوگ، اجنبی تہذیب، اجنبی جگہ۔ تذبذب کے ان جان لیوا لمحات میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دلی کی جامع مسجد سے انہیں للکار۔

مولانا آزاد نے گویا ہجرت (پاکستان) پر آمادہ بہت سارے لوگوں کی عقل و فراست کو روشنی بخش دی، بہرحال بدلتے وقت اور حالات کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اپنے حق اور اپنے وجود کی بقاء کے لئے ان لوگوں نے ہمّت اور جرأت کے مضبوط ستون کو تھام لیا۔ اس فیصلے کا بھارت کی سیکولر قوتوں نے خیر مقدم کیا اور نیشنلسٹ مسلم رہنماؤں نے اُن لوگوں کے لئے موافق فضا ہموار

کرنے، اور ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی کے لئے پوری سیاسی بصیرتوں کا ثبوت دیتے ہوئے حالات کو خوشگوار بنانے میں منہمک ہو گئے۔

ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر نئے حوصلے اور عزم کے ساتھ بہار کے اردو صحافی اور دانشور، قومی مفاد میں جٹ گئے اور مسلم لیگ کے ہمنوا روزنامہ ''صدائے عام'' کو بھی یہ فکر لاحق ہوئی کہ ''نیشنلسٹ مسلمان کیا کریں'' (اداریہ، مورخہ ۲۸/اگست ۱۹۴۷ء) اور حالات جیسے جیسے موافق اور سازگار ہوتے گئے، ان کی سوچ اور فکر کے زاویے بھی بدلتے گئے اور جہاں ''اتحاد'' جیسا اخبار تقسیم ہند کے بعد اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ سکا، وہیں ''صدائے عام'' نے ۱۹۴۷ء کے بعد نہ صرف اپنا نظریہ بدل کر کانگریس کا ہمنوا بن کر بلکہ پورے اعتماد کے ساتھ عوام اور حکومت کے درمیان کی اہم کڑی بن گیا۔

چراغ سے چراغ جلنے لگے اور ۴۷ء کے اختتام تک کافی حد تک کالے بادل چھٹ گئے، ایک نئی روشنی اور نیا اجالا پھیل گیا۔ نئے حالات میں نئے خیالات سے موجزن لوگوں نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیا اور ادیب وشاعر اور صحافی، جو وقت کا نباض ہوتا ہے، ان لوگوں کے ذہن میں فکر واحساس کے نئے دروازے وا ہونے لگے ایسے ہی نئے احساسات وجذبات سے مغلوب ہو کر دربھنگہ سے تعلق رکھنے والے دو نوجوان شاعر مظہر امام اور منظر شہاب نے آزاد ہندوستان کے صوبہ بہار میں اردو صحافت کی ایک نئی شمع روشن کرتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ ''نئی کرن'' کا اجراء کیا۔ دوسری طرف پٹنہ میں ایک حساس افسانہ نگار اور صحافی سہیل عظیم آبادی نے اپنے ہم خیال دوست اور نیشنلسٹ مسلم رہنما عبدالقیوم انصاری کے تعاون سے اپریل ۱۹۴۹ء میں روزنامہ ''ساتھی'' نکالا۔

اس طرح یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے ۱۹۵۰ء تک پہنچا، اس دوران یعنی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک جو اہم اخبارات ورسائل نکلے، ان میں ماہنامہ ''نئی کرن'' (۱۹۴۷ء میں دربھنگہ سے مظہر امام اور منظر شہاب کی ادارت میں)، دوماہی ''آکاش'' (۱۹۴۸ء میں پٹنہ سے ارشد کاکوی کی ادارت میں) ''آفتاب'' (۱۹۴۸ء میں پورنیہ سے)، روزنامہ ''ساتھی'' (۱۹۴۹ء میں پٹنہ سے سہیل عظیم آبادی کی ادارت میں)، رسالہ ''صبح زندگی'' (۱۹۴۹ء میں دربھنگہ/ پٹنہ سے محمد

ہاشم/ سلطان احمد کی ادارت میں)۔ ماہنامہ ''کرن'' دسمبر (۱۹۴۹ء میں گیا سے مولوی عبدالغنی کی ادارت میں) ماہنامہ ''پرچم'' (مئی ۱۹۵۰ء میں اورنگ آباد (بہار) سے محمد شوکت کی ادارت میں) ہفتہ وار ''سیرت'' (۱۹۵۰ء میں پٹنہ سے سلطان احمد کی ادارت میں) ہفتہ وار ''سویرا'' (۱۹۵۰ء میں پٹنہ سے مطیع الرحمٰن شمیم کی ادارت میں) ماہنامہ ''نئی راہ'' (اگست ۱۹۵۰ء میں گیا سے بدیع مشہدی کی ادارت میں) ''ساحل'' (۱۹۵۰ء میں کشن گنج سے اکمل یزدانی کی ادارت میں) ہفتہ وار ''عمل'' (۱۹۵۰ء میں کشن گنج سے) ماہنامہ ''اشارہ'' (اگست ۱۹۵۰ء میں گیا سے قیوم خضر کی ادارت میں) ہفتہ وار ''انسان کی آواز'' (۱۹۵۰ء میں ولایت علی اصلاحی کی ادارت میں) اور ''طالب'' (فروری ۱۹۵۰ء میں گیا سے انور انصاری/ یعقوب ناز کی ادارت میں) وغیرہ کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

اخبار ورسائل کی اس مختصر سی فہرست دیکھنے سے ایک بات جو بڑی اہمیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ ہے ۱۹۴۸ء کے بعد اردو کے شاعروں اور افسانہ نگاروں کا بہار کی صحافتی دنیا میں قدم رکھنا۔ مظہر امام، منظر شہاب، ارشد کاکوی، سہیل عظیم آبادی، سلطان احمد، بدیع مشہدی اور قیوم خضر وغیرہ جیسے سرکردہ لوگوں کی شمولیت نے یقینی طور پر اس دور کی اردو صحافت کو ایک خاص معیار اور وقار بخشا، اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ مشاہیر ادب جیسے جیسے بہار کی اردو صحافت سے منسلک ہوتے گئے، ویسے ویسے اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوتا گیا، اس ضمن میں وفا ملک پوری، کلام حیدری، محمد اسمٰعیل ناصح، قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، شمس گیاوی، شمس الہدیٰ استھانوی، ادریس سنہاروی، غیاث احمد گدی، غلام سرور، شکیل الرحمٰن، ضیاء عظیم آبادی، رضی عظیم آبادی، بیتاب صدّیقی، ارشد فہمی، عطا کاکوی، تاج انور، وہاب اشرفی، نادم بلخی، طیب عثمانی، عبدالمغنی، علی حیدر نیر، ہوش عظیم آبادی، شاہد رام نگری، مختار احمد عاصی، معین شاہد، ظفر اوگانوی، شین مظفر پوری وغیرہ کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان لوگوں کی لگن، سماجی، سیاسی اور معاشرتی بصیرت اور ان کی ادبی وصحافتی صلاحیتوں نے بہار کی اردو صحافت کو فکری اور فنّی سطح پر بھی اعجاز بخشا۔

بہار کی اردو صحافت نے ہر قسم کی آزمائشوں پر قابو پا لینے کے بعد، اس نے اپنا مقام متعین

کرلیا اور اسکی روشنی جو شروع میں مدھم تھی، تیز لو کے ساتھ پھیلتی رہی۔ اردو کے اخبارات و رسائل نکلتے رہے، بند ہوتے رہے۔ ایسے اخبارات و رسائل کی فہرست کافی طویل ہے، یہاں پر میں ان اخبار و رسائل کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی ایک پہچان بن سکی اور جنہوں نے کسی نہ کسی طور پر اردو صحافت پر گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں اس ضمن میں سب سے پہلے ادبی رسائل کا ذکر ضروری ہے۔، اس لیے کہ آزادی کے بعد ادبی رسالوں نے ہی اردو صحافت کی شمع روشن کی تھی۔

اس سلسلے میں ۱۹۴۸ء میں دربھنگہ سے نکلنے والا ادبی ماہ نامہ ''نئی کرن'' کا نام سامنے آتا ہے جس کا پہلا شمارہ پٹنہ سے دربھنگہ لے جانے کے دوران گنگا کی نذر ہو گیا، لیکن اس کے بعد نئے حوصلہ کے ساتھ تین شمارے شائع ہوئے۔ اس رسالہ کو نکالنے والے مظہر امام اور منظر شہاب اردو شاعری میں نہ صرف اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ''نئی کرن'' کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۸ء میں پٹنہ سے ارشد کاکوی کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ''آکاش'' اور پورنیہ کا رسالہ ''آفتاب'' بھی اہمیت رکھتا ہے۔

ان کے بعد جو ادبی رسالے بے اختیار ذہن کے پردے پر اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے ابھرتے ہیں، ان میں سہیل عظیم آبادی کا رسالہ ''تہذیب اور'' حال'' وفا ملک پوری اور کلام حیدری کا رسالہ ''صبح نو'' قیوم خضر کا رسالہ ''اشارہ'' انجم مانپوری کا رسالہ ''ندیم'' ادریس سنہساروی کا رسالہ ''سہیل'' رضوان احمد کا رسالہ ''زیور'' عظیم الدین احمد اور کلیم الدین احمد کا رسالہ ''معاصر'' ادریس سنہساروی اور شکیل الرحمٰن کا رسالہ ''زمین'' ''قاضی عبدالودود کا ''معیار'' رفیع احمد اور وہاب اشرفی کا رسالہ ''صنم'' ''نادم بلخی کا رسالہ ''کوئل'' انیس جاجزی کا رسالہ ''راوی'' کلام حیدری کا رسالہ ''آہنگ'' مختار احمد عاصی کا رسالہ ''سریر'' عبدالمغنی کا رسالہ ''مریخ'' ''منظر امام اور سید احمد شمیم کا رسالہ ''ترسیل'' بہار اردو اکاڈمی کا رسالہ ''زبان و ادب'' سرور عثمانی کا رسالہ ''مفاہیم'' (گیا) مناظر عاشق ہرگانوی کا رسالہ ''کوہسار'' تاج انور کا رسالہ ''ترسیل'' (گیا) اور محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ: بہار کا رسالہ ''بہار کی خبریں'' (موجودہ نام ''بہار'') وغیرہ نے یقینی طور پر اردو زبان و ادب کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اور ادبی صحافت کا معیار بلند کیا ہے۔ خا طور پر سہیل عظیم آبادی کا رسالہ ''تہذیب'' اور ''حال'' کا ذکر اب

بھی نقادوں کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ''معاصر'' جس کی ادارت میں عظیم الدین احمد، عبدالمنان بیدل اور کلیم الدین احمد جیسے مشاہیر ادب وابستہ ہوں، اس کے معیار کا کیا کہنا اس نے تحقیقی و تنقیدی مقالوں کی اشاعت میں اعلیٰ معیار کا ثبوت دیکر تحقیقی و تنقیدی ادب میں اپنا نام نمایاں کیا ہے۔ ''قاضی عبدالودود نمبر'' اس کا ایک یادگار خصوصی نمبر ہے انجم مانپوری اور ان کے بعد ریاست علی ندوی جیسی قد آور ادبی شخصیتوں کی ادارت میں ماہنامہ ''ندیم'' نے بھی ادبی دنیا میں کافی نام کمایا۔ خاص طور پر اس کے ۱۹۳۳ء ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء کے ''بہار نمبر'' دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''ندیم'' کی ادبی اور لسانی خدمات پر مگدھ یونیورسٹی میں ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح ''صنم'' کے جنوری تا اپریل ۱۹۵۹ء کے ''بہار نمبر'' نے بھی ادبی حلقوں میں کافی دھوم مچایا تھا۔ ''ساغر نو'' کا اختر اور ینوی نمبر بھی ایک یادگار نمبر ہے۔ جنوری ۱۹۳۹ء سے نکلنے والا ''سہیل'' صرف صوبہ بہار کا نہیں بلکہ پورے ملک میں ماہ نامہ ''شاعر'' (بمبئی) کے بعد دوسرا قدیم ادبی رسالہ ہے، جس نے ایک لمبے عرصے تک بہار کی ادبی صحافت کی خدمات انجام دی ہے ''سہیل'' نے ''بھاگلپور کا ادبی ماحول نمبر'' کے علاوہ پریم چند، سہیل عظیم آبادی، کلام حیدری، شفیع مشہدی قیصر عثمانی، کلیم الدین احمد جیسی اہم ادابی شخصیتوں کے فکر و فن پر اعلیٰ درجے کے خصوصی نمبر شائع کیے ہیں۔ ''سہیل'' نے اپنے کئی شماروں کو مشاہیر ادب کے نام نکال کرانہیں دستاویزی شکل دی ہے۔ ''مریخ'' بھی ایک معیاری رسالہ ہے۔ جس کا ''پرویز شاہدی نمبر'' توجہ طلب ہے۔ ماہنامہ ''آہنگ'' ہندو پاک کے ادبی رسالوں میں صف اول کا مقام رکھتا تھا۔ اس کے ''احتشام حسین نمبر اور'' فکشن نمبر'' کو آج بھی لوگ تلاش کرتے ملتے ہیں ،کئی نئے فنکاروں پر خصوصی گوشہ بھی اس نے شائع کیا ہے ''صبح نو'' نے علی عباس حسینی، ڈاکٹر ذاکر حسین، غالب اور ڈاکٹر نذر امام کی شخصیت اور فن پر جو خصوصی نمبر نکالے، وہ بھی کئی اعتبار سے معیاری نمبروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

بہار اردو اکادمی کا رسالہ ''زبان و ادب'' جسے سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، رضوان احمد، اور مشتاق احمد نوری جیسے نامور صحافی اور افسانہ نگاروں نے ترتیب دیا ہے۔ اسکے بھی کئی اہم خصوصی نمبر مثلاً ''شاد عظیم آبادی نمبر''، ''پرویز شاہدی نمبر'' ''سہیل عظیم آبادی نمبر'' ''اطفال نمبر'' حفیظ

بنارسی نمبر، احمد یوسف نمبر وغیرہ شائع ہوکر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

حکومت بہار کے محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہّ کا اردو رسالہ ''بہار کی خبریں'' (موجودہ نام ''بہار'') جسکی ادارت ولایت علی اصلاحی اور ہوش عظیم آبادی جیسے مشاہیر سنبھال چکے ہیں اور ان کے بعد ایس ایم قیصر نے ترتیب دیا۔ اسکے ابتدائی شماروں کا جو معیار تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا اور موجودہ صورت حال یہ ہے کہ یہ کب نکلتا ہے اور کہاں پڑھا جاتا ہے، اس کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ حالانکہ حکومت، بہار کا رسالہ ہونے کی وجہ سے اسے ہر طرح کی سہولیات میسر ہے۔ پھر بھی اس کا کوئی معیار نہ بن سکا، مشتاق احمد نوری نے جب اس کی ادارت سنبھالی تو اسے نیا رنگ و روپ دینے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ دوسرے صوبے سے نکلنے والے رسالے جیسے ''نیا دور'' پاسبان ''، تعمیر ہریانہ وغیرہ ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہیں۔ رسالہ ''بہار'' کا ہر سال یوم جمہوریہ اور یوم آزادی کے موقع پر شائع ہونے والے شمارے کچھ اعتبار سے اچھے شمارے ہیں۔ اسکے سیاحت اور دیگر نمبر بھی منظر عام پر آئے ہیں۔

ان رسالوں کے علاوہ بھی بہار کے مختلف شہروں سے مختلف، اوقات میں مختلف ادبی رسالے نکلتے رہے، ان میں سے بعض رسالے ایسے ہیں، جن کے چند ہی شمارے منظر عام پر آئے لیکن اپنی بعض خصوصیت کی بنا پر یادگار نقش چھوڑ گئے اور بہار سے شائع ہونے والے رسالوں کی فہرست میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہے۔ ان میں گیا کا ماہنامہ ''کرن'' (عبدالغنی عزیزی) اورنگ آباد (بہار) کا ماہنامہ ''پرچم'' (سردار محمد شوکت) گیا کا ماہنامہ ''نئی راہ'' (بدیع مشہدی)، گیا ہی کا ماہنامہ ''رفیق'' (ایس۔ ایم عبداللہ، معین شاہد)، دربھنگہ کا سہ ہی ماہی رسالہ ''رفتار نو'' (سید منظر امام) جمشید پور کا ''آئندہ'' (سہیل واسطی) کٹیہار کا ماہنامہ ''غالب'' اور فانوس '' (علی حیدر نیّر)، پٹنہ کا ماہنامہ ''اقدار'' (ظفر ادگانوی)، پٹنہ کا ماہنامہ ''حال'' (سہیل عظیم آبادی)، ''میراث''، (غیاث احمد گدی) دربھنگہ کا ''توازن'' (قمر اعظم ہاشمی) سہسرام کا ''اسلوب'' (شفق) گیا کا ماہنامہ ''اصناف'' (عشرت ظہیر)، دھنباد کا ''کنول'' (شان بھارتی)، پٹنہ کا ماہنامہ ''رفیق''، (محمد جعفر اور محمود عالم)، رانچی کا ''ابلاغ '' (احمد سجاد)، حمزہ پور (شیر گھاٹی، گیا) کا ''قوس

'' (افسر حمزہ پوری) گیا کا ''مرغِ چمن'' (حسن امام) داؤدنگر (اورنگ آباد) کا سہ ماہی ''حالی'' (منہاج نقیب)، بھاگلپور کا سہ ماہی ''اندیشہ'' (قیصر جمال، ارشد رضا) رانچی کا سہ ماہی ''حصار'' (انور ایرج) داؤدنگر (اورنگ آباد) کا ماہنامہ ''راہی'' (ساحر داؤدنگری) گیا کا سہ ماہی ''ادبی نقوش'' (بدر اورنگ آبادی اور سید احمد قادری) رانچی کا ''روشنی'' (شمس جاوید اور اختر پیامی) رانچی کا ہی ''کارواں'' (شاہد ابراہیم) سہسرام کا ''جدید اسلوب'' (شاہد جمیل) بھاگلپور کا ''کوہسار جرنل'' (مناظر عاشق ہرگانوی) پٹنہ کا سہ ماہی رسالہ '' مباحثہ '' (وہاب اشرفی) وغیرہ ایسے ادبی رسالے ہیں، جو یادگار بن گئے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ بہار کی ادبی صحافت کو ہمیشہ وسائل کی کمی اور جدید اشاعتی سہولیات کا فقدان رہا، جس کی وجہ سے معیاری مشتملات دینے میں ادبی رسالے تو کامیاب رہے، لیکن دیدہ زیب نہیں بنا سکے۔ اس کے باوجود بہار کی ادبی صحافت کا معیار پورے ملک میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پورے ملک میں آزادی کے بعد صحافت کے معاملے میں بہار کا مقام سرفہرست ہے۔ تہذیب، ندیم، صنم، صبح نو، اشارہ وغیر کے بعد سہیل، مریخ اور آہنگ نے ادبی صحافت کو اعلیٰ مقام بخشا ہے۔ جس کا اعتراف ہندو پاک کے مشاہیر ادب اکثر کرتے ہیں۔ ان دنوں علیم اللہ حالی کا سہ ماہی رسالہ '' انتخاب '' مناظر عاشق ہرگانوی کا سہ ماہی رسالہ '' کوہسار '' امام اعظم کا سہ ماہی رسالہ '' تمثیل '' مشتاق احمد کا سہ ماہی رسالہ '' جہان اردو '' رضی احمد کا سہ ماہی رسالہ '' ابجد '' انور شمیم کا سہ ماہی رسالہ '' کسوٹی جدید'' منصور خوشتر کا رسالہ ''دربھنگہ ٹائمس'' اور خورشید اکبر کا رسالہ ''آمد'' وغیرہ بہار کی ادبی صحافت کی بھرپور نمائندگی کر رہے ہیں۔

آزادئ ہند کے بعد بہار کے اردو روزناموں، ہفتہ واروں اور پندرہ روزہ اخباروں کی کثیر تعداد ملتی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے بیشتر اردو اخبارات بےسمتی اور بے راہ روی کے شکار رہے، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آزادی کے بعد کوئی بڑا مشن سامنے نہ تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کم سے کم لاگت میں زیادہ سے زیادہ حصول زر کی کوشش نے بہار کی اردو صحافت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ اس میدان میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جو صحافت کی ابجد سے

واقفیت تو دور، اردو کی بنیادی تعلیم سے بھی نابلد تھے۔ ذاتی مفاد کی کارفرمائی نے قوم وملک کے مفاد کو پس پشت ڈال دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہار کی اردو صحافت کا معیار آزادی کے بعد گرتا چلا گیا۔ اب آیئے پہلے ہم ان اخبارات کا جائزہ لیتے ہیں، جن کی صحافتی دنیا میں کسی حد تک ایک نمایاں پہچان بن سکی، گرچہ آزادی کے بعد ایسے اخبارات کی تعداد، بس انگلیوں پر شمار کی جاسکتی ہے۔

اس فہرست میں شامل اخبارات میں چند روز نامے اور ہفت روزہ یقیناً ایسے ہیں جن میں شائع شدہ اہم خبروں، تبصروں اور قابل قدر اداریوں نے ایک خاص وقت میں بہار کی اردو صحافت کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔

ان میں صدائے عام، ساتھی، سنگم، عظیم آباد اکسپریس، قومی تنظیم، قومی آواز، ہمارا نعرہ، سارا بہار، ایثار، فاروقی تنظیم اور انقلاب جدید وغیرہ جیسے روز ناموں کے نام کئی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ہفتہ وار اخبارات میں الکلام، مورچہ، ہاتف، زمین، انسان کی آواز، اتحاد وطن، کوہکن، بودھ دھرتی، آدرش، مسائل، اورنگ، انسان دوست، پندار، ایک قوم، عظیم آباد اکسپریس، کوہسار جرنل، گرم ہوا، ہمزاد، لال مرچ، خبر نامہ، قومی دھارا، چٹنی، تکون، حق شناس، سیکولر محاذ اور نقیب وغیرہ۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ آزادی کے بعد بہار سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس طویل فہرست میں یقینی طور پر بہت سارے اخبارات ایسے ہیں، جنہوں نے پرانی روایت کو توڑنے کی کوشش کی، حکومت وقت کی بے جا تعریف وتوصیف سے اپنے دامن کو بچایا اور قلم کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے اردو صحافت کو ایک بلند مقام دینے کی کوشش میں سرگرداں رہے لیکن مالی مشکلات کے ساتھ ساتھ اردو دوستوں کی بے توجہی اور وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کا سفر ادھورا ہی رہا۔ بہت سارے اخبارات کے ایسے بھی مالک و مدیر تھے جن کے اندر سیاسی بصیرت، سماجی شعور، اقتصادی آگہی اور صحافتی ادراک تھا، لیکن وہ حالات کی ستم ظریفی کے شکار ہوکر، دوسرے اخباروں میں کام کرنے لگے، ان کی شمولیت سے وہ اخبارات چل نکلے، جو مالی

طور پر تو مستحکم، لیکن صحافتی طور پر کمزور تھے—— اور وہ ریاست بہار کے عوام کی آواز بن کر رہنمائی کرنے لگے، سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی اور تہذیبی تغیّرات، قومی مسائل، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ملکی مفاد کے ساتھ ساتھ مختلف شعبۂ زندگی کے درپیش مسئلوں اور عوامی دلچسپیوں کا اظہار بڑے مؤثر اور مثبت انداز میں کرنے لگے، جس کی وجہ سے ان اخبارات کی مقبولیت بڑھنے لگی۔

روزنامہ ''صدائے عام'' جس کی جنگ آزادی کے آخری ایّام میں بہت اہم اور نمایاں رول رہا ہے، اس کی ادارت سے نظیر حیدر کے الگ ہونے کے بعد، ان کے بھتیجے رضی حیدر نے سنبھالی اور انہوں نے محمد مرغوب اور شبیر احمد جیسے باصلاحیت صحافیوں کا تعاون حاصل کیا۔ اس اخبار میں اپنے زمانے کے بہار کے کئی ذی شعور، دانشور اور ادباء لکھنے والوں میں شامل تھے۔ ''صدائے عام'' آزادی ہند کے بعد پوری طرح سے کانگریس کا ہمنوا بن گیا، اور چونکہ مرکز اور ریاست بہار میں عرصہ دراز تک کانگریسی حکومت رہی، جس کی پشت پناہی سے بھی اس اخبار کو کافی مالی فائدہ پہنچا۔

دوسرا اخبار ''ساتھی''، جس کا اجراء سہیل عظیم آبادی جیسے نامور صحافی اور افسانہ نگار نے کیا اور جس کی ادارت غلام سرور اور ولایت علی اصلاحی جیسے باشعور صحافیوں نے سنبھالی اور پھر جس کے مدیر نور محمد اور ان کے بیٹے ڈاکٹر خالد رشید صبا جیسے سیاسی وسماجی بصیرتوں کی حامل شخصیتیں رہی ہیں، حق ندوی اور شاہد رام نگری جیسے نامور صحافیوں کے علاوہ بہار کے کئی مشاہیر علم وادب کا اسے تعاون حاصل رہا ہو، تو اس کے معیاری ہونے میں شک کی گنجائش کہاں؟ ایک زمانہ تھا کہ ''صدائے عام'' اور ''ساتھی'' کی عوام میں کافی دھوم تھی۔ ''ساتھی'' کے یوم جمہوریہ نمبر اور یوم آزادی نمبر کے علاوہ دیگر موضوعات پر کئی خصوصی نمبر شائع ہوئے ہیں، جن میں ۱۹۵۲ء میں شائع ہونے والا تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ''سالنامہ'' کئی اعتبار سے ایک تاریخی نمبر ہے۔

روزنامہ ''ساتھی'' اسی شان اور تزک واحتشام سے نکلتا رہا۔ اس کا دفتر تو ایک زمانے میں متعدد ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کا مرکز تھا، جہاں سے مختلف ادبی، لسانی، سماجی و سیاسی تحریکیں جنم لیتی تھیں، لیکن یہ امتیاز زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ غلام سرور کے بعد نور محمد اور

ڈاکٹر خالد رشید صبا کی ادارت میں یہ کانگریس کا پوری طرح سے ہمنوا ہو گیا اور کانگریسی حکومت کی تعریف وتوصیف اس کا شعار بن گیا۔

''صدائے عام'' اور ''ساتھی'' جو حکومت وقت کی ہم نوائی کے باعث ایسے نامناسب اقدام کو بھی نظر انداز کر دیتے جو اردو داں آبادی کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتے تھے۔لہٰذا نگاہیں ایسے اخبار کی متلاشی تھیں، جو حکومت کے غلط اقدام پر انگلی اٹھا سکے اور اردو اور اردو داں حضرات کے حقوق کے لئے جمہوری انداز میں آواز بلند کر سکے۔ ''صدائے عام'' اور ''ساتھی'' سنیچر کو شائع نہیں ہوتے تھے،اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین ہفت روزہ ''سنگم'' (غلام سرور،۱۹۵۳ء) ''روشنی'' (مطیع الرحمٰن شمیم۔ ۱۹۵۰ء) اور ''صداقت'' (مولانا محی الدین ندوی-۱۹۵۵ء) منظر عام پرآئے جن کے باصلاحیت مدیر اور باشعور صحافیوں کی صلاحیت اور سلیقے نے اردو داں طبقہ کو متوجہ کیا اور فرقہ پرستی،نفرت اور خوف و ہراس کی جو مسموم فضا پھیلی، اسے کم کرنے میں اپنی صحافتی ذمہ داریوں کا ثبوت فراہم کیا۔

غلام سرور زمانہ طالب علمی ہی سے اچھے مقرر کی حیثیت سے مقبول تھے۔ان کی تحریریں حکومت وقت کی کوتاہیوں اور غلط فیصلوں کو بڑی بے باکی سے بے نقاب کرتیں،اس لیے ''سنگم'' کو عوام نے بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا،غلام سرور کے اداریوں اور تبصروں کو ذوق وشوق سے پڑھا جانے لگا اور پھر ۱۹۶۲ء سے ''سنگم'' کو روزنامہ بنا دیا گیا۔۱۹۶۲ء میں بھارت پر چین نے حملہ کر دیا،اس وقت غلام سرور کو عوامی احساسات وجذبات کے اظہار کا اچھا موقع ملا اور وہ اپنی تحریر وتقریر سے لوگوں کے دلوں میں جگہ پانے میں کامیاب ہوئے،

غلام سرور اپنے اخبار میں آئے دن بہار کے مسلمانوں کے مسائل، اردو کشی کی سازش اور دن بدن ملک میں پھیلتی جارہی فرقہ پرستی پر بڑے جذباتی انداز میں اداریے وتبصرے لکھتے ،جس کی وجہ سے ''سنگم'' کی عام لوگوں میں مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔''سنگم'' کو بیتاب صدیقی ،شاہ مشتاق احمد، شہباز حسین اور عبدالمغنی جیسے سرکردہ لوگوں کا بھی تعاون حاصل رہا۔''سنگم'' کے مدیر غلام سرور جب جیل گئے تو ان کی عدم موجودگی میں عبدالمغنی ہی اس

کے اداریے لکھا کرتے تھے۔

شاہین محسن کی سربراہی میں ''قومی آواز'' جیسا مقبول روزنامہ پٹنہ سے اپریل ۱۹۸۱ء سے شائع ہونا شروع ہوا،اس کی اشاعت ہوتے ہی،ایسا لگا جیسے بہار میں اردو صحافت پر بہار آ گئی ہو،عثمان غنی اور شاہین محسن جیسے باصلاحیت صحافیوں نے ''قومی آواز'' (پٹنہ) کے ذریعہ بہار کی اردو صحافت کو ایک خاص اور اہم مقام پر لا کھڑا کیا،اس اخبار سے جہاں ایک طرف صحافتی معیار اور وقار بلند ہوا وہیں دوسری جانب اس اخبار سے منسلک صحافیوں،کاتبوں اور دیگر ملازمین کے معاشی حالات میں بہتری آئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے اس آرگن کی مالی حالت کافی مضبوط تھی۔سرکاری،نیم سرکاری اور غیر سرکاری اشتہارات کے علاوہ اس اخبار کو حکومت کا مالی تعاون بھی حاصل تھا،یہی وجہ تھی کہ انتظامیہ ''قومی آواز'' (پٹنہ ایڈیشن) نے اپنے صحافی اور غیر صحافی ملازمین کو بچھاوت اجرت بورڈ کی سفارشات کے مطابق تنخواہیں اور دیگر سہولیات دیں،جو بہار کی اردو صحافت کی تاریخ میں پہلی اور آج کی تاریخ میں آخری بار ایسا ہوا۔اس کے اداریے،مضامین اور تبصرے گرچہ کانگریس حکومت کی پالیسیوں کی ترجمانی کرتے،لیکن ان میں بھی ایک معیار اور حسن تھا۔اس لیے بہار کے اردو عوام میں اسے کافی پسند کیا گیا۔افسوس کہ آہستہ آہستہ یہ اخبار بھی سستی سیاست اور سازش کا شکار ہونے لگا،اختلافات بڑھتے گئے۔دھیرے دھیرے اس کی مقبولیت کم ہونے لگی اور آخر کار اس نے بھی دم توڑ دیا۔

''قومی آواز'' سے شاہین محسن نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔مولانا منت اللہ رحمانی کی ایما پر اوران کے مالی معاونت سے ایک دوسرا روزنامہ ''ایثار'' کا ۲۶؍فروری ۱۹۸۵ء سے اجراء ہوا، جسے شاہین محسن اور شاہد رام نگری نے اپنی صحافتی سوجھ بوجھ سے ایک معیاری روزنامہ بنا کر پیش کیا لیکن خاندانی اختلافات نے اس اخبار کو بھی زیادہ دن تک چلنے نہیں دیا اور آخر کار ۸؍اپریل ۱۹۸۷ء کے بعد یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔

۲؍دسمبر ۱۹۸۰ء سے ہفتہ وار ''عظیم آباد ایکسپریس'' بھی روزنامہ میں تبدیل ہوا تو رضوان احمد جیسے نو جوان اور باصلاحیت صحافی کی ادارتی خوبیوں کے باعث اسے سنجیدہ حلقوں میں پسندیدگی

کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔اس اخبار کے اداریئے بالخصوص توجہ کا مرکز بنتے ،بہار اور بیرون بہار کے اردو اخبارات اس کے اداریوں کو ڈائجسٹ کرتے اور کئی ہندی روزناموں میں اس کے اداریوں پر تبصرے شائع ہوتے۔

روزنامہ ''فاروقی تنظیم ''بھی، جو کہ پہلے ہفتہ وار کی شکل میں ۱۹۸۴ء سے نکلا،اس کے بعد یہ اخبار جون ۱۹۹۲ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس اخبار کو خورشید پرویز صدیقی جیسے بے حد مقبول ااور مشہور صحافی کی خدمات حاصل ہیں،اسی اخبار سے نوجوان اور باصلاحیت صحافی سراج انور بھی منسلک ہیں۔روزنامہ ''قومی تنظیم'' اپنے معیار اور مواد میں نمایاں تبدیلی لاکر عوام کے بڑے حلقہ کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہے، اس اخبار سے پرانے اور معروف صحافی عبدالرافع اور نوجوان صحافی راشد احمد کی شمولیت سے اس کا ایک خاص معیار قائم ہے۔روزنامہ ''انقلاب جدید'' ۱۰ر ستمبر ۱۹۹۵ سے جدید ٹکنالوجی مثلاً یو.این.آئی.کی اردو نیوز سروس ،فیکس ،کمپیوٹر کمپوزنگ ،آفسیٹ کی طباعت اور باصلاحیت وتجربہ کار صحافیوں کی ٹیم اور خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ منظر عام پر آیا،جس کا اردو داں حلقے میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا ۔''انقلاب جدید'' کے آجانے سے ''قومی تنظیم'' کو اپنی کمیوں اور خامیوں کو دور کرنے کا موقع ملا،اور اس نے بھی فیکس ،یو.این.آئی.کی اردو نیوز سروس ، کمپیوٹر کمپوزنگ اور آفسیٹ کی جدید ٹکنالوجی کو اپنا لیا۔لیکن ''انقلاب جدید'' اپنے ابتدائی سفر میں ہی لڑکھڑا گیا۔اس کے بعد سید شہباز عالم کی سربراہی میں پٹنہ سے ۲۰ر جولائی ۲۰۰۶ء سے سہارا گروپ کا اخبار ''راشٹریہ سہارا'' کا اجرا ٔہوا، جو اپنے مخصوص معیار کے ساتھ بہار کے بڑے حلقہ تک پہنچنے میں کامیاب ہے۔ممبئ سے شائع ہونے والا اپنے زمانے کا مشہور روزنامہ '' انقلاب '' کو دینک جاگرن گروپ نے اپنا کر پٹنہ سے ۲۷ر مئی ۲۰۱۳ء سے جاری کیا ہے،شکیل شمسی کی ادارت میں دہلی سے جاری اس اخبار کے پٹنہ بیورو چیف معروف صحافی احمد جاوید اور خورشید ہاشمی بنائے گئے ہیں،جن کی صحافتی صلاحیتوں کا پرتو اس روزنامہ میں نمایاں ہے۔روزنامہ ''پندار'' سے مشہور صحافی ریحان غنی منسلک ہیں ،جن کے اداریئے اور دیگر کالم وغیرہ قارئین کو بہر حال متوجہ کرتے ہیں۔معظم حیدری اپنے صحافتی تجربات کا اظہار ان دنوں اپنے اخبار روزنامہ 'امین' میں

کر رہے ہیں۔دہلی سے شائع ہونے والا روزنامہ 'ہمارا سماج' بھی پٹنہ سے نکل رہا ہے۔ڈاکٹر اظہار احمد کی سربراہی میں ان کا روزنامہ 'پیاری اردو' بھی گزشتہ کئی برسوں سے پٹنہ سے شائع ہو رہا ہے۔اپنے زمانے کا مشہور اخبار 'سنگم' بھی نکل رہا ہے،لیکن افسوس کہ اس اخبار کی پرانی شان برقرار نہیں رہی۔پٹنہ سے 'المومن' 'انقلاب جدید' 'خواب کی منزل' کے ساتھ ساتھ بھاگلپور سے 'دیس بدیس' مظفر پور سے 'گرم ہوا' اورنگ آباد سے 'حلیم' وغیرہ بھی شائع ہو رہے ہیں،لیکن یہ اخبارات اپنے وسائل کی کمی اور صحافتی خامیوں کی وجہ کر عوام تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہیں۔ پٹنہ سے ایک ہفتہ وار ''امن چین ''اور مقبول صحافی ریاض عظیم آبادی کا پندرہ روزہ 'سیکولر محاذ' اپنی چند خوبیوں کی بنا ٔ پر اپنی موجودگی کا احساس کراتا ہے۔اس طرح بہار کی اردو صحافت کا سفر کبھی تیز اور کبھی مدھم رفتار سے جاری ہے،لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہار کی اردو صحافت کو آزادی سے قبل جو معیار اور وقار حاصل تھا،آج وہ معیار اور وقار میسّر نہیں ہے،جس کی بہت ساری وجوہات ہیں،ان میں سے ایک وجہ اردو زبان کی زبوں حالی ہے،جس کے ذمّہ دار حکومت وقت کے ساتھ ساتھ ہم اردو والے بھی یقینی طور پر ہیں۔

☆☆☆

Mob:09934839110

email: squadri806@gmail.com

حقانی القاسمی

صحافت، صارفیت اور صہیونیت

اخلاقیات اور اقدار سے جب صحافت منحرف ہونے لگتی ہے تو پھر وہ مشن نہیں مادیت کی مشین بن جاتی ہے!

صحافت کے آغاز سے ہی اس کے لیے ایک ضابطہ اخلاق کا تعین کرلیا گیا تھا جس کی روشنی میں مدتوں مثبت اور صحت مند صحافت کی مشعل جلتی رہی اور معاشرہ میں اس کی معتبریت مستحکم ہوتی رہی۔ مولانا محمد علی جو ہر جیسے شعلہ بیاں مقرر نے بھی 'ہمدرد' نکالتے وقت ضابطہ اخلاق کا پاس رکھا اور یہ واضح کیا کہ اخبار کو ذاتیات سے مبرا ہونا چاہیے۔ نہ کسی دشمن کے خلاف زیادہ لکھنا چاہیے نہ کسی کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے چاہئیں۔ مخالفت ہمیشہ اصول کے دائرے میں محدود رہے۔ اخبار کا مقصد یہ ہو کہ اپنے قوم کو فائدہ پہنچایا جائے نہ یہ کہ کسی دوسری قوم کو نقصان پہنچایا جائے۔ مذہبی مباحث سے بھی اخبار کو مبرا ہونا چاہیے۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی صحافتی منصب کا تعین کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے۔ چاندی اور سونے کا سایہ بھی اس کے لیے سم قاتل ہے۔''

صحافت سے جڑے ہوئے ان بڑے اذہان اور دانشوروں نے صحافتی اخلاقیات کا تادم آخر خیال رکھا اور اپنے قلم کی حرمت کو بحال بھی مگر اب بدلتے وقت اور تبدیل ہوتی ترجیحات کی وجہ سے صحافتی قدریں مسخ کی جارہی ہیں۔ صحافت کو جس 'عدل' سے مشروط کیا گیا تھا اب اسی شرط سے انحراف کی صورتیں صحافت میں نمایاں ہونے لگی ہیں جس کے نتیجے میں تحفظات اور تعصّبات کا رنگ بہت ہی گہرا ہو گیا ہے اور مختلف قوموں کے مابین منافرت بڑھ گئی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک سبب متعصّبانہ اور فرقہ وارانہ صحافت

بھی ہے۔

صحافت میں اخلاقیات کی جگہ اب صارفیت نے لے لی ہے جس کی وجہ سے صحافت کا انسانی چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔ آزاد اور شفاف صحافتی قدروں کی خلاف ورزی عام ہو گئی ہے۔ لوگ کہنے لگے ہیں کہ صحافت اب خبروں کی تجارت بن گئی ہے اور تجارتی مفادات کا تحفظ ہی صحافت کا مقصد اولیں بن گیا ہے۔ اس کی بدترین شکل پیڈ نیوز ہے۔ ادارتی صفحات کی خرید وفروخت کا یہ معاملہ نہایت خطرناک اور صحافتی اخلاقیات کے منافی ہے۔ پیڈ نیوز کا کینسر اتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ پریس کونسل آف انڈیا نے نہ صرف اس پر تشویش ظاہر کی ہے بلکہ اس پر نکیل کسنے کے لیے سرکار سے سخت اقدامات کی اپیل بھی کی ہے کیونکہ یہ پیڈ نیوز دراصل عوام کے ساتھ ایک طرح کا فراڈ ہے۔ جو چیزیں اشتہارات کے ذریعہ سامنے آنی چاہیے تھیں وہ خبروں کے صفحات پر جگہ پاتی ہیں۔ یہ ایک طرح سے انکم ٹیکس کی کی چوری بھی ہے ہندوستانی میڈیا سے جڑے ہوئے سرکردہ اور حساس صحافیوں میں سے پربھات جوشی اور سری پی سائی ناتھ نے پیڈ نیوز کے خلاف کھل کر لکھا مگر المیہ یہ ہے کہ میڈیا کا ایک بڑا طبقہ ابھی تک پیسے کی بنیاد پر عوام تک غلط اطلاعات پہنچانے کے جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ میڈیا کی اس طرح کی حرکت کی وجہ سے جہاں جمہوری قدروں کو نقصان پہنچا ہے وہیں عالمی سطح پر ہندوستان کی امیج مسخ ہوئی ہے کہ کرپشن کے خلاف جس میڈیا کو آواز اٹھانی چاہیے تھی وہ خود بدعنوانی میں ملوث ہے۔ کئی جرنلسٹ یونین نے بھی پیڈ نیوز کی ایسی تفصیلات پیش کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ صحافت میں یہ نیا فینومنا یا سنڈروم کس طرح اپنی جڑیں مضبوط کرتا جارہا ہے۔ 2009 سے قبل عام انتخابات میں پیڈ نیوز کی بابت تمام حقائق سامنے آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ساؤتھ ایشین فری میڈیا ایسوسی ایشن (SAFMA) نے مہاراشٹر اسمبلی الیکشن کی مثال دیتے ہوئے اس پر گہری تشویش ظاہر کی۔ گوہا ٹھکرتا نے تو پیڈ نیوز کے حوالے سے ایک دستاویزی فلم ہی بنادی جس کا عنوان تھا۔ Advatorial Selling News or products

خبروں کی خرید وفروخت کا معاملہ اتنا بڑھ چکا ہے کہ صحافت سے جڑے ہوئے دانشوروں

نے مین اسٹریم میڈیا کے کمرشیلائزیشن کو ایک بہت بڑے المیے سے تعبیر کیا ہے اور اسے صحافتی اخلاقیات کا زوال قرار دیا ہے۔ پیڈ نیوز نے کرپشن کے جس کلچر کو جنم دیا ہے اس کو ختم کیے بغیر آزاد اور شفاف صحافت ممکن ہی نہیں ہے۔

صحافت پر صارفیت کا یہ بھی منفی اثر پڑا ہے کہ ایک بڑا طبقہ یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اب صحافت صاحبان جاہ و ثروت کا سامان نشاط بن کر رہ گئی ہے۔ یہ صرف اشرافیہ اور اعلیٰ طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہے۔ ستیندر رنجن نے ایک بڑا اچھا سوال اٹھایا ہے کہ آخر قومی صحافت صرف انہیں شہروں اور مقامات پر مرکوز ہوکر کیوں رہ گئی ہے جہاں سے ان کی مالی منفعت یا تجارتی مفادات وابستہ ہیں۔ ان کا یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ اپریل 2009 میں ماؤنواز جھارکھنڈ سے لتیہر ضلع میں ایک پسنجر ٹرین کو ہائی جیک کر لیتے ہیں تو اخبارات اور نیوز چینل میں یہ بہت معمولی خبر بنتی ہے لیکن اکتوبر 2009 میں جب ماؤنواز بنگال میں راجدھانی ایکسپریس کو روک لیتے ہیں تو یہ ایک بڑی اور بریکنگ نیوز بن جاتی ہے۔ حادثے ایک جیسے ہیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ پہلی ٹرین کا تعلق غریب طبقہ سے ہے اور دوسری ٹرین کا تعلق دولت مند افراد سے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی صحافت کا رشتہ عوام سے زیادہ اشتہار دہندگان سے ہے یا انوسٹرس سے ہے۔ صارفیت صحافت میں اس طرح دخل انداز ہوگئی ہے کہ میڈیا کے لیے انسانوں کے بنیادی مسائل اہمیت کے حامل نہیں رہ گئے ہیں۔ پاپ میوزک، ڈسکو، فیشن پریڈ ہی اس کے ایشوز ہیں۔ ایک ممتاز صحافی پی سائناتھ نے یہ بڑا اہم سوال اٹھایا تھا کہ ودربھ میں زرعی بحران کو کور کرنے والے کتنے جرنلسٹ تھے۔ شاید صرف چھ جب کہ ممبئی کے Lakeme فیشن ویک کو کور کرنے کے لیے 512 جرنلسٹ تھے۔ کسی بھی ٹی وی چینل یا اخبار نے یہ نہیں بتایا کہ 1997 سے 2007 تک خودکشی کرنے والے کسانوں کی تعداد کتنی تھی۔ تیج پال کے مطابق ہندوستان کے ملین دلت اور قبائل کے مسائل کو اتنی بھی کوریج نہیں ملتی جتنا کہ تنہا کرینہ کپور کو ملتی ہے۔

میڈیا اپنے بنیادی مقاصد اور اغراض سے منحرف ہوگئی ہے۔ صحافت کا کام شخصیت کا ارتقا

اور بہتر انسانی معاشرے کی تشکیل ہے۔ روسو والٹیر اور تھامسن نے میڈیا کے ذریعہ ہی سماج میں انقلاب برپا کیا تھا۔ ذہنوں کے زاویے تبدیل کیے تھے۔ پہلے صحافت انسانی ذہنوں کو خواب عطا کرتی تھی مگر اب یہ خوف بانٹنے لگی ہے۔ نسلی، مذہبی، ثقافتی سیاسی تنازعات کی خبروں کے ذریعہ بدگمانی اور تشدد کو بڑھاوا دینے کی کوشش کرتی ہے۔ جھوٹ اور فریب کی تشہیر کرتی ہے، عوامی رائے عامہ کو مینی پولیٹ کرتی ہے۔ بازاری ترجیحات کا خیال کرتی ہے۔ خبروں کی صداقت اور معتبریت سے زیادہ اس کا ارتکاز ٹی آر پی پر ہوتا ہے اور المیہ یہ ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر صحافت نے جانب داری کو بڑھاوا دینے اور حقائق کو مسخ کرنے میں بھی اپنی ساری طاقت جھونک دی ہے۔ صحافت کا یہ سارا کھیل صرف اور صرف صارفیت کی وجہ سے ہو رہا ہے، مادیت نے صحافتی ضمیر کو مردہ کر دیا ہے۔ برنارڈ گلبرگ نے اپنی کتاب Bias: a CBS insider expose how the media distorts the news میں بہت سارے انکشافات کیے ہیں کہ کس طرح خبریں مسخ کی جاتی ہیں۔ اپنے حریفوں کو سبوتاژ کرنے یا بدنام کرنے کے لیے کس طرح کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ انہی وجوہات سے عالمی صحافت کی معتبریت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ عوام کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ اب عام انسان بھی خبروں کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا ہے۔ دراصل جب سے صحافت کو ایک خاص نظریے، طبقے کی تبلیغ و تشہیر اور دوسرے طبقے کی تذلیل کا ذریعہ بنایا جانے لگا ہے تب سے صحافت خود شکوک کے دائرے میں آ گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ صحافت پر صہیونیت کا بڑھتا اثر بھی ہے۔

عالمی صحافت میں صہیونیت ایک حاوی عنصر کی طرح شامل ہوتی جا رہی ہے، جس کی وجہ سے خبروں کی غیر جانبداری، عدل و انصاف اور شفافیت اور آزادی مجروح ہوئی ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ مغربی ذرائع ابلاغ یہودیوں کے زیر اثر ہیں اور پوری دنیا پر صحافت کی طاقت کی وجہ سے ہی یہودی چھائے ہوئے ہیں۔ صحافت میں صہیونی طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ حقائق کو مسخ کرتے ہیں، مفروضے کو حقیقت اور حقیقت کو مفروضہ بنانے میں بھی ماہر ہوتے ہیں۔ وہ مثبت کو منفی اور منفی کو مثبت

میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں۔ خبروں کو کچھ اس طرح کا زاویہ عطا کرتے ہیں کہ معصوم مجرم اور مجرم معصوم بن جاتا ہے۔ تازہ عالمی اور قومی واقعات اس کی مثال ہیں۔ صہیونی طاقتیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ خبروں کے رخ یا بین السطور کو بدل دیتی ہیں۔ مظلومیت کی آڑ میں ظلم اور جبر کو بڑھاوا دینا بھی صہیونیوں کا پرانا وطیرہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطینیوں کے قتل عام کی خبریں پوری دنیا میں پہنچ نہیں پاتی ہیں۔ ڈاکٹر Gideon پولیا نے اپنے ایک مضمون میں اس کا انکشاف کیا ہے کہ صہیونیت کے حامی ذرائع ابلاغ کس طرح مسلمانوں کے قتل عام کی خبروں پر سینسر شپ عائد کر دیتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اسرائیلی فوجیوں کی گولیوں کا شکار ہونے والے معصوم بچوں پر بھی دہشت گرد کا لیبل چسپاں کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ اب یہ حقیقت عام ہو چکی ہے کہ صہیونی ذرائع ابلاغ نے اپنے دائرہ کار کو بڑھایا ہے اور وہ علاقے بھی صہیونی حکمت عملی کے زیر اثر آ گئے ہیں جو پہلے آزادانہ اور منصفانہ صحافت پر یقین رکھتے تھے۔ صہیونیوں کی صحافتی حکمت عملی کے اثرات ہر اس جگہ نظر آتے ہیں جہاں مسلمان آباد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 9/11 یا اس طرح کے دہشت گردانہ واقعات جسے بہت سے لوگ صہیونی گلوبل میڈیا کے سیاسی کھیل سے بھی تعبیر کرتے ہیں اب دوسرے علاقوں میں بھی اس طرح کے کھیل کا آغاز ہو چکا ہے اور وہ مبہم اور موہوم دہشت گرد تنظیمیں جو میڈیا کی ذہنی اختراع ہیں اب صہیونی حکمت عملی کے زیر اثر کچھ اور علاقوں میں بھی پیدا کی جا چکی ہیں۔ جس کا مقصد ایک خاص طبقہ کے تشخص کو ختم کرنا اور اس کی امیج کو مسخ کرنا ہے۔ یہ سب صہیونی صحافت کے سیاسی کھیل ہیں۔ شاید صہیونی طریق کار کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی گرفتاری کی خبریں تو نیشنل میڈیا میں نمایاں طور پر شائع کی جاتی ہیں مگر رہائی کی خبر کے لیے اخبار کا دامن تنگ پڑ جاتا ہے اور ٹی وی میں تو اس کے لئے اسپیس ہی نہیں بچ پاتی ہے اور سب اسی صہیونیت کے زیر اثر ہوتا ہے جہاں حقیقتیں چھپائی جاتی ہیں اور مفروضات ذہن نشیں کرائے جاتے ہیں اور اب تو یہ حقیقت بھی مشتہر ہو چکی ہے کہ پریس اور پولیس کا اشتراک اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ صحافتی اور پولیس بیانیہ کے مابین حد فاصل ہی ختم ہو گئی ہے۔

صارفیت اور صہیونیت کی وجہ سے صحافت کا وہ چہرہ مسخ ہو گیا ہے جو کبھی عام انسانوں کے لیے ایک مشعل راہ اور مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا تھا جسے جمہوریت میں چوتھے ستون کا درجہ نصیب تھا۔ اسے واچ ڈاگ بھی کہا جاتا تھا مگر اب وہی صحافت واچ ڈاگ کے بجائے لیپ ڈاگ بن چکی ہے اور انسانی احساسات اور مسائل کی ترجمان ہونے کی بجائے جدید صارفیت کا آلۂ کار بن کر رہ گئی ہے۔

یاد رکھئے صحافت کا یہ گرتا ہوا معیار معاشرے کے ذہن اور ضمیر کے زوال کا بھی آئینہ دار ہے۔ اس لیے صحافتی اقدار کو زندہ رکھنے کے لیے معاشرے کو بیدار ہونا ہی پڑے گا۔ ورنہ صحافت میں تیرگی بڑھتی ہی جائے گی۔

☆☆☆

صفدر امام قادری
شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ (بہار)

بہار میں اردو صحافت

(تاریخ، تکنیک اور معیار کا جائزہ)

دنیا میں صحافت کی تاریخ آزادیِ اظہار اور ظلم و جبر سے نبرد آزمائی کے پہلو بہ پہلو اپنے مقاصد طے کرنے کی وجہ سے اعتبار حاصل کر سکی۔ صحافت کے مؤرخین نے بادشاہی نوشتہ جات اور مفادِ عامہ کے اعلان ناموں کو صحافت کا اوّلین نمونہ مانتے ہوئے قبل مسیح عہد ہی سے صحافت کا آغاز تسلیم کیا ہے۔ اس اعتبار سے یونان، قدیم ہندستان اور مصر میں تاریخی طور پر صحافت جیسی اوّلین شَے کی تلاش کی جاتی ہے لیکن جدید صحافت نے مفادِ عامّہ کی اُن تشہیری تحریروں کی اس شِق پر صحافت کی اصطلاح منطبق کی جس کی نقلیں عوام کو دستیاب کرائی جا سکیں۔ اسی سے صحافت کی کاروباری جہت بھی سامنے آئی اور کاغذ کے چند صفحات جن پر کچھ خبریں اور چند تاثرات مرقوم ہوں، انھیں دنیا اور ملک و قوم کے گوشے گوشے تک پہنچا دینے کی کوشش شروع ہوئی۔ اس سے صحافت کا دائرۂ کار تو بڑھا ہی، اُس کے حلقۂ اثر میں بھی گونا گوں اضافے ہوئے۔

ہندستان میں صحافت کی تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض اصحاب الرائے ملازمین کی مرہونِ منّت رہی۔ ولیم بولٹس اور پھر جیمس آگسٹس ہکّی اس اعتبار سے محترم ہیں کیوں کہ انھوں نے ہندستان میں صحافت کے موضوعات، مضامین اور مواد پر نہ صرف یہ کہ غور کیا بلکہ اس کے عملی نمونے ظاہر کر کے اٹھارویں صدی کے اواخر میں باضابطہ اخباری نمونے بھی پیش کیے۔ انگریزی کے بعد بنگلہ اور فارسی کے اخبارات بھی فوراً انیسویں صدی کے آغاز میں سامنے آ گئے۔ ''جامِ جہاں نما'' (1822) سے ''دہلی اردو اخبار'' (1836) تک باضابطہ طور پر اردو صحافت نے خود کو واضح سماجی

اور سیاسی نقطۂ نظر کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ اس دوران انگریزی، بنگلہ، فارسی، گجراتی، اردو اور ہندی زبانوں کی صحافت نے اپنا ایک قومی منظر نامہ مرتب کر لیا۔ دیکھتے دیکھتے کلکتہ، مدراس، بمبئی اور دلّی سے باہر علاقائی صحافت کا آغاز بڑی سُرعت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ انگریزی حکومت کے پھیلنے اور متعدد سماجی و حکومتی جبر ہی تھے جن کی وجہ سے ہندستان میں عمومی طور پر علاقائی اور کثیر لسانی صحافت کا فروغ ممکن ہوا۔ 1857 سے کافی پہلے اگر علاقائی اور کثیر لسانی صحافت کا فروغ نہیں ہوا ہوتا تو یہ ممکن ہے کہ 1857 کا انقلاب اور آزادی کی جنگ کا بہترین آغاز شاید ہی ہو پاتا۔ اردو اور ہندستانی صحافت کا یہ رُخ کم و بیش آج بھی اپنے واضح اور ہمہ گیر اثرات کے اعتبار سے قائم ہے اور انگریزی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں اور جغرافیائی خطّوں کی صحافت خوب پھل پھول رہی ہے۔

اخبارات کے مورّخین عام طور سے اردو صحافت کی جب تاریخ مرتّب کرتے ہیں تو پہلا دور 1857 سے قبل کا مانا جاتا ہے۔ صوبۂ بہار اس اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ بہار میں انگریزی اور ہندی صحافت سے قبل اردو صحافت کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ دوسرے صوبوں میں بالعموم پہلے انگریزی صحافت نے اپنی بنیاد رکھی اور تب علاقائی یا دیسی صحافت کا آغاز ہو سکا۔ شاید یہ اس لیے بھی ممکن ہوا کیوں کہ بہار میں 1850ء میں شاہ کبیر الدین احمد نے سہسرام میں ایک پریس قائم کر لیا تھا۔ شہرِ آرا سے اردو کا پہلا اخبار جولائی 1853 میں ''نور الانوار'' نام سے شائع ہوا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر سیّد خورشید احمد تھے اور مالک سیّد محمد ہاشم بلگرامی تھے۔ آرا اُس وقت شاہ آباد ضلعے کا مرکز تھا۔ اس اخبار کے سلسلے سے جن محققین نے بنیادی نوعیت کی اطلاعات فراہم کی ہیں، اُن میں سیّد محمد اشرف (اخترِ شہنشاہی)، محمد عتیق صدیقی (ہندستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں)، سیّد مظفّر اقبال (بہار میں اردو نثر کا ارتقا 1857 سے 1914 تک)، رخشاں ابدالی (مقالۂ مطبوعہ رسالہ 'ندیم' گیا۔ 1940) وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ بہار ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے صوبائی مدیر جناب این۔ کمار نے 1971 میں 'جرنلزم اِن بہار' نام سے جو کتاب شائع کی، اُس میں بھی 'نور الانوار' کو بہار کی تمام زبانوں کا پہلا اخبار تسلیم کیا گیا ہے۔ این۔ کمار نے اسے ہفتہ وار اخبار تسلیم کیا ہے لیکن دیگر ذرائع سے اس کی معیاد کا ٹھیک طریقے سے پتا نہیں چلتا۔ بدقسمتی سے ایسا کوئی

محقق اب تک سامنے نہیں آسکا جس نے یہ دعوا کیا ہو کہ اُس نے اِس اخبار کا مطالعہ کیا ہے۔ اکثر و بیش تر افراد کا ماخذ 'اخترِ شہنشاہی' مطبوعہ 1888 ہی ہے جہاں نہایت ہی مختصر اطلاع ملتی ہے۔ جس کی نقل یا نقل در نقل سے اکثر محققین نے اپنے چراغ جلائے ہیں۔ 'اخترِ شہنشاہی' میں 'نورالانوار' کے بارے میں لکھا ہے: ''نورالانوار: آرہ ضلع شاہ آباد محلہ پھاٹک سادات بلگرام، مالک سیّد محمد ہاشم بلگرامی اثنا عشری مہتمم سیّد خورشید احمد اثنا عشری اجرائے جولائی 1853ء'' (اخترِ شہنشاہی ص 275)۔ یہاں یہ بھی معلومات حاصل نہیں ہو پاتیں کہ یہ اخبار کس نقطۂ نظر کا تھا اور اس کا مزاج کیا تھا یا اس کے مشتملات کی نوعیت کیا تھی؟ کسی لائبریری یا ذخیرۂ دستاویز میں اب تک اِس کا کوئی شمارہ کسی محقق کو ہاتھ نہیں لگا جس کی وجہ سے خطۂ بہار میں اردو صحافت کی پہلی کڑی اب بھی معلومات کے اعتبار سے تقریباً گم شدہ ہی ہے اور ہم 'نورالانوار' کے نام سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔

صوبۂ بہار سے دوسرا اردو اخبار ''پٹنہ ہرکارا'' تین شعبان 1271ھ بمطابق 21 اپریل 1855 کو شائع ہوا۔ یہ مہینے میں تین بار انگریزی کی پہلی، گیارہویں اور اکیسویں تاریخوں کو شائع کیا جاتا تھا۔ اس اخبار کے مالک شاہ ابوتراب تھے جو پریس کے بھی مالک تھے۔ ایڈیٹر کا نام تو کہیں شائع نہیں ہوتا تھا لیکن سیّد مظفّر اقبال نے یہ قیاس کیا ہے کہ شاہ ابوتراب ہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ 1855 کے 21 اپریل، یکم مئی، 21 مئی، یکم جون، گیارہ جون اور 21 جون کے شمارے خدابخش لائبریری، پٹنہ میں موجود ہیں۔ مظفّر اقبال کی اطلاع یہ ہے کہ یہ اخبار یکم مارچ 1856 تک نکلتا رہا۔ 12 صفحات کے اس اخبار میں دو کالم ہوتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزی حکومت کی طرف داری میں یہ اخبار سرگرم معلوم ہوتا ہے۔ عیسائیت کی تبلیغ کے امور کی مخالفت میں اِس اخبار میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اس اخبار میں معاصر اخبارات سے خبریں اخذ کرنے کا خاص اہتمام ہے۔ کچھ خبریں اپنے مخصوص نمائندوں کی بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار نے اپنے نمائندوں کو 'مخبر' نام سے یاد کیا ہے جو موجودہ مذاق کے اعتبار سے ایک علاحدہ مفہوم کا لفظ ہے اور عام طور سے منفی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ 'پٹنہ ہرکارا' نے اپنی پالیسی کچھ اس طرح سے پیش کی تھی:

(I) ''جو خبر مثل ہجو کسی شخص کے جس میں تذلیل وہ تحقیر کسی کی ہو، ہرگز طبع نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے کہ جو خبر ایسی صحیح کہ وقوع اس واقع کا بلا تشکیل و تمہید ہو، ہر چند وہ محمول ہوا و پر قدح یا مدح کے، چارو ناچار طبع ہونا اُس کا ضرور ہوگا۔''

(II) اسی سبب سے حرماں متوسطین مخوف رہے کہ حاکم، اخبار نویس سے پوچھ بیٹھے کہ یہ خبر تم کو کہاں سے ملی جو مندرجِ اخبار کیا تو اُس وقت ایسا نہ ہو کہ حاکم تصوّر کریں ہم بچّہ شتریت (؟) وحالاں کہ یہ تصوّر مخبر کا غلط ہے کیوں کہ جو واقعہ صحیح و بلا تمہید نسبتِ رعایا یا حُکّام کے ہو، اُس کے لکھنے میں کچھ قباحت نہیں ہے مگر ہم کو وہ بات نہیں لکھنا چاہیے جس میں کسی طرح کا نقصان سرکار یا ملک کے حاکم کے برخلاف وقوع کی ہو۔''

(پٹنہ ہرکارا: 21 جون 1855)

اُس وقت کی عام روِش کے اعتبار سے یہ پالیسی کُچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہیں ہے کیوں کہ اُس زمانے میں اخباروں کا خاص کام حکومت کی خبروں اور خاص طور پر سرکاری احکامات کی تشہیر تسلیم کیا جاتا تھا۔ قاضی عبدالودود نے اِس اخبار کے 14 شماروں کی تلخیص اپنے مضمون مطبوعہ معاصر (عہد جدید حصّہ 15) میں پیش کی ہے۔ خبروں کے جو نمونے سامنے آئے ہیں، اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اِس اخبار میں پورے مُلک کی خبریں شائع ہوتی تھیں اور مختلف سماجی، سیاسی اور ادبی امور زیرِ بحث رہتے تھے۔ یہ اخبار ٹھیک غدر سے پہلے کی واقعی صورتِ حال کیا تھی، اِسے جاننے کے لیے بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے سلسلے سے جو یادداشتیں رقم کی ہیں، اُن میں 15 نمبر یادداشت سے لکھنؤ کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ دو خطوط کے حوالے سے قاضی عبدالودود نے یہ لکھا ہے:

''ایک خط کا یہ خلاصہ ہے کہ شاہ اودھ نے تمام شہر لکھنؤ میں منادی کی ہے کہ کوئی فرد بشر یہ لفظ زبان پر نہ لاوے کہ اب سرکار انگلشیہ .... اودھ کو اپنے تحت و تصرف میں لاوے گی ورنہ ناک کاٹ لی جاوے گی۔ چنانچہ دو آدمیوں کی ناک بہ علّت اسی جرم

کے کاٹی گئی..... خلاصہ دوسرے خط کا مطابق خلاصہ قطعۂ اوّل کے ہے مگر اسی قدر
اختلاف ہے جو کوئی ایسا لفظ زبان پر لاوے گا وہ بہ سواریِ خر شہر میں تشہیر کیا جاوے گا
چنانچہ کوتوالِ شہر نے حضور میں وزیر اعظم کے عرض کی کہ یہ خبر..... ہر خاص و عام کی
زبانوں پر جاری ہے، اس قدر گدھے کہاں سے میسّر آویں گے جو اس قدر عوام الناس
سزا پاویں گے۔''

[قاضی عبدالودود: چند اہم اخبارات و رسائل، ادارہ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ۔1993ء ص۔60]

اس اقتباس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ٹھیک غدر سے پہلے لکھنؤ کے حالات کیا تھے اور آخری نواب اس سلسلے سے کس سختی سے حالات پر قابو رکھنے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن چند دنوں میں ہی صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ یکم مئی 1855ء کے شمارے میں 'پٹنہ ہرکارا' میں یہ خبر شائع ہوئی:

ناظرین اخبار ظاہر ہے کہ اس امر میں کوئی
.... احکام..... صادر نہیں ہُوا۔ جیسا کہ زبان زد عوام
ہے، بلکہ اکثر خواص بھی یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ سرکار
بلند افتخار نے اب تک کوئی زبردستی بہ نسبت رعایا نہیں
فرمائی بلکہ ہمیشہ عدل و انصاف ہی رہا..... اور یہی
باعث تھا کہ قیام سلطنت تا ہنوز باقی نہ بچا۔''

[ص۔۱۱]

اس اقتباس سے یقین ہوتا ہے کہ یہ اخبار کم و بیش انگریزی حکومت کا طرف دار ہوتا تھا۔ ہر چند اس میں برطانوی حکومت کے خلاف پیدا ہو رہی صورتِ حال سے متعلق بھی کُچھ خبریں ضرور شائع ہوتی تھیں۔ قاضی عبدالودود نے اپنے تاثرات میں یہ جملہ درج کیا ہے: ''پٹنہ ہرکارا کسی نقطۂ نظر سے اچھے اخباروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا'' لیکن اُس عہد کی صحافت کے معیار کے پیشِ نظر اس کے مشتملات اسے معمولی اخبار قرار دینے سے گریز کرتے ہیں۔

'اخترِ شہنشاہی' سے بہار کے تیسرے اخبار 'ویکلی رپورٹ''، گیا کے بارے میں یہ اطلاع

ملتی ہے کہ یہ اخبار یکم مئی 1856ء کو شروع ہوا تھا۔ اس کی مدّت ماہانہ تھی اور 24 اوراق پر مشتمل تھا۔ اس کے مالک جے۔ جے۔ رام تھے۔ 'اخترِ شہنشاہی' کی اطلاع کو ہی بنیاد بنا کر عتیق صدّیقی اور سیّد مظفّر اقبال نے اپنی کتاب میں اس اخبار کا تذکرہ کیا ہے۔ سیّد احمد قادری [اُردو صحافت بہار میں، 2003] نے گیا ضلع کی مختلف لائبریریوں میں اس اخبار کی تلاش کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس اخبار کے اقتباسات یا یادداشتیں بھی کہیں دستیاب نہیں جس کی وجہ سے اس کے طرز تحریر اور صحافتی معیار پر گفتگو کی جا سکے۔

شاہ ابوتراب کے مطبع سے لالہ ہند اپرساد حسرتی کی ادارت میں یکم ستمبر 1856ء کو 'اخبارِ بہار' جاری ہُوا۔ اس کے کاتب کا نام فتح بہادر تھا۔ اس کے بیش تر شمارے 8 صفحات پر مشتمل ہیں مگر چند شماروں میں 10 سے لے کر 14 صفحات تک ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ 'پٹنہ ہرکارا' کی طرح ہی یہ اخبار بھی مہینے میں 3 بار یکم، گیارویں اور اکیسویں تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ 1856ء اور 1857ء کے 33 شمارے منیر شریف کی خانقاہ میں محفوظ تھے جن کے مطالعے کے بعد سیّد مظفّر اقبال نے یہ مشاہدہ درج کیا: ''پٹنہ ہرکارا کی طرح یہ اخبار بھی کمپنی کی حکومت کا خیر خواہ تھا۔'' سیّد احمد قادری نے اس اخبار کے جو چند اقتباسات پیش کیے ہیں، اُن سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے حالاں کہ اُنھوں نے قدیم خط پڑھنے اور نقل کرنے کے سلسلے سے فاش غلطیاں کی ہیں۔ اصل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) ''عنایات سرکار:۔ سرکار دولتمدار نے حُکم دیا ہے کہ جس وقت کسی شاہزادہ کی یا کسی
اور تنخواہ دار گورنمنٹ کی وفات کی خبر حکام مفصل کو معلوم ہو، فوراً دو سو روپے خزانۂ سرکاری
سے بلا انتظار اجازت و منظوری گورنمنٹ، تجہیز و تکفین کے واسطے دیا کریں۔ سبحان اللہ
کیا عنایات بے پایاں و الطاف بے کراں ہے.........''

[''اخبار بہار'' بتاریخ یکم فروری 1857ء ص۔10]

(۲) ''29 مئی کو کلکتہ سے یہ خبر پہنچی کہ الہٰ آباد و لکھنؤ میں کچھ فساد نہیں ہے اور لاہور
سے یہ خبر آئی ہے کہ چاروں طرف سے فوج سرکاری پہنچ گئی اور دہلی کا محاصرہ ہو گیا اور
اس مہینے کی 8 تاریخ سپاہیان باغی کی سزا دہی کے واسطے مقرر ہوئی، یقین ہے کہ

باغیوں کو سزائے اعمال مل گئی ہو......''

[''اخبار بہار'' بتاریخ 11 / جون 1857ء ص۔5]

مذکورہ اقتباسات اس بات کا واضح اشارہ کرتے ہیں کہ یہ اخبار پورے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی سامراج کی طرفداری پر قائم تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انقلاب جیسے جیسے قریب آتا گیا، انگریزی حکومت نے ذرائع ترسیل بالخصوص اخبارات پر اپنی مضبوط گرفت قائم کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ایک طرح سے یہ اخبارات بھی بلاواسطہ طور پر عوام اور ہندستانی مجاہدین کے واضح مخالف ہو چکے تھے۔ بعض دوسرے اخبارات کی طرح ''اخبارِ بہار'' اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

بہار کے قدیم اخبارات میں 'عظیم الاخبار' پٹنہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ غدر کے فوراً بعد جولائی 1859ء مطابق 1275ھ میں یہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کی اشاعت عبدالجلیل اور سیّد محمد اسمٰعیل کے پریس سے ہوئی۔ مظفر اقبال نے 4 ستمبر 1859 سے 5 مئی 1860ء کے درمیان کے 16 شمارے ملاحظہ کیے تھے اور اس پر اپنی کتاب میں تاثرات درج کیے ہیں۔ اس اخبار کے زیادہ تر شمارے 12 صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اتوار کو شائع ہوتا تھا۔ غدر کے بعد بہار سے شائع ہونے والا یہ پہلا اخبار تھا۔ اس کے بارے میں مظفر اقبال نے مزید تفصیلات یوں پیش کی ہیں:

''اس اخبار میں زیادہ تر قوانین وضوابطِ عدالت اور مختلف دیار وامصار کی خبریں درج ہوتی تھیں۔ یہ خبریں ہم عصر اخبارات سے نقل کی جاتی تھیں اور ان کا حوالہ بھی دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اخبار کے نامہ نگار بھی تھے اور ان کی بھیجی ہوئی خبریں بھی چھپتی تھیں۔ خبروں کے علاوہ اخبار میں مختلف موضوعات پر مضامین بھی چھپتے تھے۔''

(سید مظفر اقبال: بہار میں اردو نثر کا ارتقا، ص ۱۴۷)

بہار کے قدیم اخبارات میں 'اخبار الاخیار' مظفر پور کی واضح اہمیت تسلیم کی جاتی ہے کیوں کہ یہ اخبار سرسیّد کی تحریک سے متعلق تھا اور اس کا ایک قومی تناظر دکھائی دیتا ہے۔ 15 ستمبر 1868ء کو مطبع چشمۂ نور، مظفر پور سے یہ جاری ہوا تھا۔ عام طور پر ہر شمارے میں 16 صفحات شامل ہوتے

تھے۔ یہ اخبار 15 روزہ تھا اور اس کے صفحات بائیں سے دائیں جانب لکھے جاتے تھے۔ اس سلسلے سے اخبار میں کسی نے سوال کیا تو جواب میں ایڈیٹر نے 15 اپریل 1869ء کے شمارے میں یہ وضاحت کی کہ جلد ہی اس اخبار کو انگریزی میں بھی شائع کیا جائے گا۔ اس لیے پہلے سے ہی اس کے صفحات بائیں سے دائیں جانب کھلیں گے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر بابو اجودھیا پرشاد منیری تھے۔ آغاز سے 15 ستمبر 1870ء تک کے شمارے میں اجودھیا پرشاد کا ہی نام ملتا ہے۔ یکم ستمبر 1870ء سے دسمبر 1870 سے جو شمارے ملے، ان پر ایڈیٹر کی حیثیت سے منشی قربان علی خاں صاحب کا نام درج ہے۔

سرورق پر ہی اس اخبار میں یہ درج ہوتا تھا کہ یہ صوبۂ بہار کی سائنٹفک سوسائٹی کا ترجمان ہے۔ 15 جون 1869ء کے شمارے میں سائنٹفک سوسائٹی کی سالانہ روداد کی اشاعت سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے جس کا درج ذیل حصّہ تحقیقی جہت سے نہایت کارآمد ہے:

''پانچواں منشا اس سوسیٹی (؟) کا یہ ہے بملاحظہ اخبار انگلستان و ہندوستان اور دیگر ممالک واقالیم کے ایک اخبار جو واسطے ترقی فہم وفراست اہل ہند کے کافی ہو اور جس سے روز بروز اتحاد ومحبت فیمابین رعایہ اور گورنمنٹ کے زیادہ ہو، چھاپ کر مشتہر کیا جاوے۔ تاریخ 15 ستمبر 1868ء ایک اخبار باسم 'اخبار الاخیار' اسی صنعت کا مہینے میں دوبار اس سوسیٹی (؟) سے نکلتا ہے۔''

اس اخبار کے سلسلے سے قاضی عبدالودود نے دو مضامین 'فکر و نظر' علی گڑھ اور 'مجلس'، حیدرآباد، میں 1960ء میں شائع کرائے تھے۔ ان مضامین میں اس اخبار سے متعلق بے حد اہم اقتباسات درج ہوئے ہیں۔ غالب کی وفات پر ایک جون 1869ء کے شمارے میں شاہ محمد یحییٰ ابوالعلائی کا قطعۂ تاریخ شائع ہوا ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی وفات کے سلسلے سے اسی شمارے میں جو خبر شائع ہوئی، وہ کچھ یوں ہے:

''مرزا رجب علی بیگ، سرور کی وفات سے نہایت رنج ہوا۔ مرزا صاحب مہاراجہ بنارس کے پاس نوکر تھے، اور اس زمانے میں بڑے نامی گرامی شعرائے اردو میں شمار کیے

جاتے تھے، جن کی کتاب 'فسانۂ عجائب' بھی اردو میں شہرۂ آفاق ہے۔"

اس اخبار کے 15 جولائی 1869ء کے شمارے سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس سال انڈین سول سروس میں چار امیدوار کامیاب ہوئے۔ ان کے نام بھی اخبار میں شائع ہوئے ہیں: رمیش چندر دت، بہاری لال گپتا، سریندر ناتھ بنرجی، شری پدما باجی ٹھاکر۔ انگریزی اخبار پایونیر کے حوالے سے 15 جولائی 1869ء کے شمارے میں اس اخبار نے لکھا ہے کہ "وہابیوں سے جیل خانہ آباد ہوتا جا رہا ہے"۔ اسی طرح شمارہ بابت 25 اکتوبر 1869ء میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ "ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اس امر پر مامور ہوئے تھے کہ ایک کتاب تالیف کریں جس میں .... مشہور و شریف خاندان ہائے اہلِ اسلام کا احوال بخوبی بیان کیا جائے"۔ 15 اکتوبر کے شمارے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے: "بمبئی میں ایک نیا مذہب معراج پنتھ جاری ہوا۔ ہندو اور مسلمانی مت دونوں کی شرکت سے اور معتقدین اس کے شری کرشن جی کو بھی مانتے ہیں اور حضرت محمد کو بھی"۔

'اخبار الاخیار' چوں کہ سائنٹفک سوسائٹی، صوبۂ بہار کا ترجمان تھا، اس لیے اس اخبار کے مشمولات میں سرسید احمد خاں کے امور زیرِ بحث نہ آئیں، یہ کیسے ممکن تھا؟ قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون (اخبار الاخیار، مظفر پور اور سید احمد خاں) میں ایسے اہم نوشتہ جات جمع کرنے کی کوشش کی ہے جس سے سرسید، سائنٹفک سوسائٹی اور دیگر متعلقات واضح ہو جائیں۔ 'اخبار الاخیار' کی اشاعت کا یہ وہی زمانہ ہے جب سرسید احمد خاں ہندستان سے انگلینڈ گئے اور پھر واپس ہوئے۔ اس اعتبار سے اس اخبار کے بعض مندرجات قومی اور سماجی معاملات میں ہمیں نئے سرے سے تجزیہ کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ 15 جولائی 1869ء کے شمارے میں سرسید کو حکومتِ برطانیہ کی طرف سے کے۔ ایس۔ آئی۔ کا اعزاز ملنے پر مبارک باد دی گئی ہے اور پھر ولایت کے سفر کے اسباب وعللٖ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے سے یکم ستمبر کے اخبار سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"سفرِ ولایت کی ترغیب!"...فی زماننا ہماری سوسیٹی کے لیف آنریری سکریٹری جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر کے۔ ایس۔ آئی۔.... اپنی ذاتی ہمت کی بدولت لندن میں پہنچے اور اولوالعزمی ہندستانیوں کی جبلی عادت کے برخلاف

ہوئی،.... جب تک ہندستانی رعایا خاص لندن میں جا کر اپنی ملکہ معظّمہ کی دلی توجہ اور اہل یورپ کے اس ذاتی اخلاق کو جو وہ اپنے ملک میں مسافروں کے حال پر مبذول فرماتے ہیں، آنکھ سے نہ دیکھ لیں گے، ہرگز اس کے جی میں اپنی گورنمنٹ کا پکّا خلوص پیدا نہ ہوگا۔ اور جو حق گورنمنٹ کا اس پر واجب ہے، اس سے پورا ادا نہ ہوگا۔ جب مولوی صاحب لندن گئے تو تمام ممبران انڈیا کونسل سے ملاقات ہوئی اور چند ممبران پارلیمنٹ بھی ان سے ملے اور یہ سب صاحب نہایت... اخلاق کے ساتھ پیش آئے اور یقین ہے کہ اب وہ بہ حضور... سکریٹری آف اسٹیٹ بھی باریاب ہوئے ہوں گے۔ جب مولوی صاحب.. وہاں کسی جلسے میں بلائے جاتے ہیں تو ارباب جلسہ ان کی خاطر داری میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے۔ سرجان لارڈ بہادر گورنر جنرل سابق کی عنایتیں ہرگز بیان میں نہیں آ سکتیں۔ دو مرتبہ خاص مولوی صاحب کی فرودگاہ پر تشریف لائے اور ایک جلسے میں خاص مولوی صاحب کی نسبت اپنی ایک اسپیچ میں بہت کچھ فرمایا اور بدرجۂ غایت تعریف وتوصیف کی"

اس شذرہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ غدر کے بعد کے زمانے میں برطانوی حکومت سے تعاون کرنے کی جو مہم چلائی گئی تھی، اس کے پیچھے کون سے نفسیاتی عوامل کام کر رہے تھے۔ ہندستانِ جدید کی تاریخ سے نسبت رکھنے والوں اور بالخصوص علی گڑھ تحریک کے مورخین کے لیے مذکورہ عوامل تجزیے کی نئی راہ تلاش کرنے میں امداد پہنچائیں گے۔ 'اخبار الاخیار' میں خطباتِ احمدیہ کے اشتہارات اور اس کے مشمولات کے بارے میں بھی واضح طور پر گفتگو کی گئی ہے۔ پروفیسر شاہ مقبول احمد کلکتہ کی تحویل میں 'اخبار الاخیار' مظفر پور کے 43 شمارے بابت 15 اپریل 1869ء تا 15 دسمبر 1870ء محفوظ تھے جن سے قاضی عبدالودود اور سید مظفر اقبال نے استفادہ کیا تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اب وہ شمارے کس حال میں ہیں، اس کا اندازہ مشکل ہے۔

انیسویں صدی کے اخبارات میں بہار سے نکلنے والے 'انڈین کرانیکل' کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور 16 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر سوموار کو یہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے

اوّلین ایڈیٹر منشی رحمت اللہ تھے۔ کچھ زمانے تک یہ ہفتے میں دو بار بھی شائع ہوتا تھا۔ 1885 میں اس کا نام 'اردو انڈین کرانیکل' ہوا اور اس کے ایڈیٹر عبدالغنی استھانوی ہو گئے تھے۔ اس دوران یہ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہونے لگا تھا۔ 26 فروری 1886ء کے بعد کچھ دنوں کے لیے یہ اخبار بند ہو گیا۔ اور پھر 'اردو بہار ہرلڈ وانڈین کرانیکل' کے بدلے ہوئے نام سے جاری ہوا اور سوموار کی جگہ اس کی اشاعت کا دن سنیچر مقرر ہوا۔ اس اخبار کے مالک پٹنہ کے مشہور بنگالی وکیل بابو گرو پرساد ہوئے۔ یہ آخری طور پر کب بند ہوا، اس کی اطلاع کسی محقق کے پاس نہیں ہے۔

رسالہ معاصر، پٹنہ کے حصہ تین بابت ماہ دسمبر 1959ء میں قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے متعدد شماروں کا بہ تفصیل تعارف کرایا تھا۔ معاصر کے حصہ پانچ میں 'اردو بہار ہرلڈ وانڈین کرانیکل' کے چند شماروں کا تعارف قاضی عبدالودود نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں کرایا۔ یہ دونوں مضامین رسالہ معاصر کی تقطیع کے اعتبار سے 99 صفحات پر مشتمل ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ قاضی عبدالودود نے 1884، 1885، 1886 اور 1887 کی اشاعتوں کی معقول تلخیص اپنے اس مضمون میں پیش کردی ہوگی۔

اس اخبار کے ایڈیٹر کا نام شائع نہیں ہوتا تھا لیکن 13 اپریل 1885 کے شمارے میں اخبار کے مدیر کی ترجمہ شدہ ایک کتاب کا اشتہار چھپا ہے جس میں مدیر اور مترجم کا نام سید عبدالغنی درج ہے۔ قاضی عبدالودود نے یہ بھی قیاس کیا ہے کہ دسمبر 1884 میں شاد عظیم آبادی کی تصنیف 'نوائے وطن' پر جو تفصیلی تبصرہ شائع ہوا ہے، وہ بھی سید عبدالغنی کا ہی لکھا ہوا ہے۔ قاضی صاحب کا اندازہ ہے کہ ''یہ غالباً وہی بزرگ ہیں جو استھاواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے اور بعد کو ریاستِ حیدرآباد میں ملازم ہو گئے تھے۔ قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے مشتملات کی تعریف کی ہے اور اسے صحافت کے معیار پر تولنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے:

> ''کرانیکل خبریں بھی دیتا تھا اور جمہور کے خیالات کی ترجمانی اور رہنمائی بھی کرتا تھا۔ عموماً اہم امور کی طرف زیادہ اور غیر اہم کی طرف کم توجہ کی جاتی تھی۔ مگر خبروں کے متعلق اتنی احتیاط نہ ہوتی تھی کہ کوئی غلط بات شائع ہی نہ ہونے پائے.........

> مقالات افتتاحی عموماً بصیرت افروز ہوا کرتے تھے اور بڑی بے باکی سے لکھے جاتے تھے۔ میرے نزدیک اس زمانے کے اردو اخباروں میں شاید ہی کسی کے مقالاتِ افتتاحی کرانیکل کے مقالاتِ افتتاحی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور ان میں متعدد ایسے ہیں کہ اس زمانے میں بھی کسی کے قلم سے نکلیں تو مستحقِ تحسین قرار پائیں۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہندو مسلمان دونوں کا اخبار تھا۔''

1885 کے 21 ستمبر کے شمارے میں مدیر کی طرف سے جو مضمون بعنوان ''لڑکوں کے اخلاق اور ٹھیٹر'' شائع ہوا ہے، وہ مدیر کے بالغ نظر اور سنجیدہ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس مضمون سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ سرسید کی تحریک اور اس کے اثرات میں افادہ بخش ادب کی ترویج واشاعت کا زور یہاں بھی قائم تھا۔ مدیر اُن کے اثرات سے لاتعلق نہیں دکھائی دیتے۔ مدیر کے یہ خیالات جو ٹھیئٹر کے بارے میں ہیں، قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ یہ فنونِ لطیفہ کی دیگر شاخوں پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں۔

اس اخبار نے صحافت اور صحافیوں کے معیار اور مزاج کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ 2 مارچ 1885 کے اخبار میں دیسی اخباروں کے بارے میں لفٹیننٹ گورنر، بنگال کی رپورٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے مدیر نے دیسی اخباروں کے سلسلے سے سرکار کی لعنت وملامت پر اختلاف درج کرایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی اور دیسی دونوں اخبارات حکومت کے کاموں کے احتساب میں ایک جیسی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اس حالت میں صرف دیسی اخباروں کو نشانہ بنانا درست نہیں۔ قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے مدیر کے نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مدیرِ کرانکل کے نزدیک ایڈیٹر کو اعلا اخلاقی صفات کا حامل ہونا چاہیے...... اس کا خیال تھا کہ آزاد اخبار نویسی خطرے سے خالی نہ تھی، اس لیے کہ حکومت نکتہ چینی کو پسند نہیں کرتی''

اخبار 'رفیقِ ہند' کے مقدمے کے سلسلے سے، جس میں اخبار کے مدیر محرم علی چشتی کو ایک ماہ کی سزا ہوئی تھی، 13 اپریل 1885 کے کرانیکل میں مدیر نے بہت صفائی سے اپنی بات درج کی

ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ 'اردو کرانیکل' کیسا سلیقہ شعار اور ہوش منداخبار تھا۔ صحافت کے معیار اور ذمہ داریوں پر غور کرتے ہوئے اردو کرانیکل کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

'' 'رفیق ہند'، لاہور کے نوجوان ایڈیٹر محرم علی چشتی کا واقعہ ایسا نہیں ہے جس پر افسوس نہ آئے۔ جن لوگوں نے دیوان داس مل کے مقدمے کی کاروائیاں پڑھی ہیں، وہ بہ خوبی جانتے ہیں کہ یہ ایڈیٹر اس سزا کا مستحق نہ تھا۔ مسٹر پارکر کا دل بُرے جذبات سے خالی ہوتا تو صرف جرمانے کی سزا بھی کافی ہوتی، اور اگر ان کے دل کے پھپھولے بغیر قید کے نہیں ٹوٹ سکتے تھے، تو قید ہی کی ایسی سزا کیوں نہیں دی جو اپیل کے قابل ہوتی؟ عموماً اردو اخباروں اور پنجاب کے عوام وخواص نے مظلوم ایڈیٹر کی ہمدردی کی۔ جو دیسی ایڈیٹر آزادی کا دل دادہ، سچائی کا عاشق، پبلک کا بہی خواہ، حکّام کا نکتہ چیں، خوش آمد سے بیزار، جھوٹ سے متنفر ہوگا، وہ اس تعصب کے زمانے میں ضرور... ایسے روزِ بد کے لیے آمادہ ہوگا؛ البتہ جس نے اپنے اخبار کو صرف ٹکا کما کھانے کا ذریعہ اور بھیک کا ٹھیکرا بنا رکھا ہے، وہ اپنے کو محفوظ کر ایسے آزاد منشوں پر ہنسے گا۔ 'کوہ نور' کی جگر خراش تحریروں کو جو اس مقدمے کے بارے میں چھپی ہیں، ہم نے برابر نہایت حیرت وافسوس کے ساتھ پڑھا ..... کسی شریف اور فیاض دل سے ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی انسان کی مصیبت پر، گو وہ اس کا دشمن ہی کیوں نہ ہو، خوشی منائے۔''

'اُردو انڈین کرانیکل' کے 19 جنوری 1884ء کے شمارے میں ہندستان کی نوکر شاہی کے بارے میں خاصی تنقیدی گفتگو کی گئی ہے۔ سِول سروس کے عہدے داران کے مزاج پر اس اخبار نے ایک احتسابی رویّہ قائم کر رکھا ہے۔ اخبار نے شمارۂ مذکور میں لکھا ہے:

''ہندستان کی زندگی کے لیے سول سروس آفتِ ناگہانی ہے.... ہمارا مطلب خود سول سروس کا عہدہ نہیں ... بلکہ ایسے سویلین ہیں جن کے دماغ میں

خیالاتِ بے ہودہ بھرے ہوئے ہیں اور جن کا دبانا.... بڑے بڑے قوانین..... اور ملکی حقوق، باقاعدہ آزادی کی لمبی چوڑی تقریروں سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ سویلین کی زیادتیوں... کی مثالیں... فطرتِ انسانی کی معمولی ابتری وخرابی کی مثالیں نہیں بلکہ وہ لگاتار اور بلا ارادہ اصرار وہٹ کی مثالیں ہیں۔''

یکم جون 1884ء کے کرانیکل میں سول سروس کے افراد کے کام اور اُن کی تنخواہوں سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے پھر ایک تنقیدی خبر شائع کی گئی ہے۔ اسے ملاحظہ کیا جائے:

''باوجود اس کے کہ ڈال کے ٹپکے ہوئے سویلین اس قدر زیادہ تنخواہیں پاتے ہیں کہ کسی ملک میں نہیں ملتیں، اس پر بھی اپنی بدنصیبی کی شکایت ہی کرتے ہیں۔ آسام اور اضلاع متوسطہ کے چیف کمشنر اور کلکتہ ہائی کورٹ کے چھوٹے چھوٹے جج...... برطانیہ کے وزیر اعظم کے برابر اور اوّل درجے کے مجسٹریٹ ضلع........ جرمنی کے چانسلر کے برابر تنخواہیں پاتے ہیں۔''

اِن شذرات سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ اخبار معاملات کو غور وفکر کے ساتھ پیش کرتا تھا۔ 10 اگست 1884ء کی ایک خبر اور جس میں انگریز حاکم کی جانب سے ہندستانیوں کے بارے میں نامناسب الفاظ استعمال کرنے کا تنازعہ سامنے آتا ہے، اس کے مطالعے سے اخبار کے خبر نویس کی سُوجھ بُوجھ اور صحیح تناظر میں واقعات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ اصل اقتباس ملاحظہ ہو:

''سول سروس کے ایک لائق ممبر لیڈ مین کی عادت تھی کہ اُن کی عدالت میں جو... دادخواہ ہوا کرتے تو ان سے نہایت مہربانی کے ساتھ لفظ بدمعاش، سور، حرام زادہ وغیرہ سے خطاب فرمایا کرتے..... کپتان ہیرسے کو ایسے غیر مہذّبانہ الفاظ چند مقتدر دلیسیوں کے حق میں استعمال کرتے دیکھ کر رنج ہوا، اور انھوں نے....... گورنمنٹ... کو اطلاع دی۔ سرالفرڈ لائل صاحب نے یہ سمجھ کر کہ سول سروس کے ممبر پر ایسے سخت الزام لگانا نہایت

معیوب ہے، حکم دیا کہ کپتان پر ہتک عزّت کی نالش کریں.. مگر... کپتان
نے ثابت کردیا کہ مسٹر لیڈ مین فی الواقع الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، اور
مقدّمہ خارج ہوگیا۔ ہم کپتان . . . کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے
ہیں... دیکھا چاہیے کہ اب گورنمنٹ مسٹر لیڈ مین سے کیا برتاؤ کرتی ہے۔ اگر
وہ.... دیسی ہوتے تو ہم کہہ سکتے کہ گورنمنٹ... کیا.... کرے گی۔''

22 جنوری 1887ء کے شمارے میں ایک طویل مراسلہ ہندو مسلمانوں کے سلسلے سے بعض انگریزوں یا طرف دارانِ انگریز کے خیالات سے شدید اختلاف کرتے ہوئے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں سیّد احمد خاں کے اُس نقطۂ نظر سے بھی اختلاف کیا گیا ہے جو بالآخر دو قومی نظریے کی شکل میں آدھی صدی کے بعد اُبھر کر سامنے آیا۔ اخبار نے لکھا:

''اس سے بڑھ کر کوئی جھوٹ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں عداوت اس
سے بڑھ کر ہے جو انگلستان میں متفرق مذہبوں میں نظر آتی ہے، ہوگی یا ہو
سکے گی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ دس میں نو ہندو مسلمانوں میں کوئی عداوت نہیں
ہے، گو یہ .... چھوٹا سا فرقہ... ہر ایک کوشش اس کے پیدا کرنے کی کر رہا
ہے.. پھر یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ ایک پارلیمنٹ میں سب ہندو ایک
جانب ہوں گے اور مسلمان ایک جانب.... میں ایڈیٹر علی گڑھ اِنسٹی ٹیوٹ
گزٹ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ لکھ رکھے کہ، نہ تو کسی شخص نے اب تک تجویز
کی اور نہ خیال کیا اور نہ جہاں تک مُجھ کو واقفیت ہے ہندستان میں پارلیمنٹری
گورنمنٹ کا ذکر کیا ہے۔''

19 ویں صدی کے آخر میں نکلنے والے اُردو اخبارات جو بہار سے شائع ہوئے، اُن میں ''الپنچ'' کی واضح اہمیت ہے۔ یہ اخبار 5 فروری 1885ء کو پٹنہ سے نکلنا شروع ہوا؛ اور تھوڑے سے تعطّل کے ساتھ 1907ء تک شائع ہوتا رہا۔ 1890 سے لے کر 1907ء تک کے متعدد شمارے اور اخبار کی فائلیں خدا بخش لائبریری میں بہت حد تک محفوظ ہیں۔ اس کے مالکان اور ایڈیٹر

بدلتے رہے اور پریس میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ تعدادِ صفحات بھی مختلف اوقات میں چھ، آٹھ، دس اور بارہ ملتی ہے۔

''اودھ پنچ'' کو نگاہ میں رکھ کہ ہی یہ اخبار اس عجیب و غریب نام سے نکلنا شروع ہوا ہوگا، اس لیے اس اخبار کی دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی عمومی پالیسی میں حبّ الوطنی اور انگریزی حکومت کی نکتہ چینی شامل تھی۔ اسی کے ساتھ اس اخبار کے بیشتر مشمولات کا اسلوب ظریفانہ ہوتا تھا۔ اس اخبار نے بڑی تعداد میں لکھنے والوں کو متوجّہ کیا اور بعض اہلِ قلم بہت تواتر کے ساتھ یہاں شائع ہوتے تھے۔ اس میں ادبی حصّہ بھی اچھّا خاصا شامل ہوتا تھا۔ اُس زمانے کے شعرا میں صُوفی منیری، اکبر دانا پوری، فضلِ حق آزاد، نسیم بلسوی اور عبدالغفور شہباز عظیم آبادی کا کلام اور دیگر تخلیقات کی لگا تار اشاعت ہوتی تھی۔ اس کی زبان اور اندازِ تحریر کی ایک جھلک 4 فروری 1898ء کے شمارے سے ملاحظہ ہو:

''انگلشمین کا نامہ نگار بھی نرا گھامڑ رہا۔ جو دل میں آتا ہے، اُوٹ پٹانگ لکھ
مارتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ڈمراؤں کے آس پاس کے باشندے سورج گر
ہن کو انگریزی اقبال کے زوال کی نشانی سمجھتے ہیں۔ سبحان اللہ بھلا ہندیوں کا
یہ دماغ کہاں کہ ایسی پولیٹکل چٹکیاں لیں۔ ہاں یہ انگریزی سانچے کے
ڈھلے ہوئے خیالات البتہ ہو سکتے ہیں۔ ہندستانیوں کے دماغ میں تو یہ بات
گھُسی ہوئی ہے کہ ہندستان ہی میں کامل کسوف ہوا ہے۔ اس لیے
ہندستانیوں کا رہا سہا اقبال آفتاب کی طرح غروب ہو گیا اور انگریزی اقبال کا
کیا پوچھنا، اس کی عملداری میں تو آفتاب سرے سے غروب ہی نہیں ہوتا۔
آفتاب دولت و اقبال درخشاں باد۔''

قاضی عبدالودود نے 1902ء اور 1903ء کے بعض شماروں کا تعارف کراتے ہوئے 'معاصر'، پٹنہ اور 'چراغِ راہ'، کلکتہ میں دو مضامین شائع کیے تھے جن میں اس اخبار کے اصل اقتباسات موجود ہیں۔ 'اُردو انڈین کرانیکل' کے حوالے سے قاضی عبدالودود نے وہ عبارت بھی نقل

کی ہے جس سے 'الپنچ' اخبار کی ابتدائی حالت کے بارے میں واضح معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ 2 فروری 1885ء کے 'اُردو انڈین کرانیکل' میں یہ اطلاع شائع ہوئی:

''اس ہفتے میں ایک اور ظریف اخبار ''الپنچ'' کی آمد آمد ہے۔ اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بہ طور آزمایش چار مہینے کے لیے جاری ہوا ہے۔ مہتمم منشی محمد اعظم ہیں۔''

9 مارچ 1885ء کے اردو انڈین کرانیکل میں ''الپنچ'' کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی ہے:

''اس وقت تک اس کے چار پرچے شائع ہو چکے ہیں۔ چند تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ہفتہ وار پنجشنبے کو چار ورقوں پر شائع ہوتا ہے۔ نہایت معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ تیسرے ہی پرچے سے اشاعت 750 تک پہنچ گئی ہے۔''

اِن دونوں نوشتوں سے ''الپنچ'' کے بارے میں بنیادی نوعیت کی چند اطلاعات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار شائع ہونے کے ساتھ ہی قبولِ عام کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

''الپنچ'' کے بارے میں یہ بات اکثر و بیش تر کہی جاتی ہے کہ اس اخبار میں شاد عظیم آبادی کے سلسلے سے لگاتار مخالفانہ مضامین، شعری تخلیقات اور طنزیہ شذرات شائع ہوتے رہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ منشی محمد اعظم، جو اس کے مالک و مختار تھے، اُن سے ناول ''صورۃ الخیال'' کے سلسلے سے شاد عظیم آبادی سے معرکہ تھا۔ منشی محمد اعظم اور منشی حسن علی [مدیر بہار بندھو۔ ہندی اخبار] نے شاد پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اِن دونوں کی مشترکہ کوششوں کو شاد نے اپنے نام سے شائع کرالیا۔ اس وجہ سے یہ بات غیر فطری معلوم نہیں ہوتی کہ یہ اخبار شاؔد کی غیر ضروری طور پر بھی مخالفت کرے۔ شاؔد کی ''نوائے وطن'' کے سلسلے سے بھی 19ویں صدی کے آخر میں بعض افراد خفا تھے۔ ان وجوہات سے شاؔد کی بعض حلقوں میں مخالفت سمجھ میں آتی ہے۔ اس سلسلے سے قاضی عبدالودود کا کہنا ہے کہ ''1902 میں یا اس سے بھی پیش تر 'الپنچ' اور شاد میں صلح ہو چکی تھی۔'' 2 اگست 1902ء کے شمارے میں اس وقت کے مدیر سیّد رحیم الدین مجبور کی وفات پر شاؔد کے قطعاتِ

تاریخ شائع ہوئے تھے۔ 1 نومبر 1902ء کے شمارے میں عظیم آباد کے یادگار مشاعرے کے سلسلے سے جو مراسلے شائع ہوئے ہیں، ان میں شاد کی استادانہ اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے بارے میں اپنے اجمالی تاثرات اس طرح رقم کیے ہیں:

''آج کل جو اردو کے اخبار بہار میں جاری ہیں، اُن کی عُمر کیا ہوگی، اس بارے میں کُچھ کہنا ممکن نہیں۔ مگر یہ مسلّم ہے کہ جو اخبارات اب زندہ نہیں ہیں، ان میں سب سے پہلے طویل عُمر 'الپنچ' نے پائی۔ 'الپنچ' جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے، ظریفانہ اخبار تھا، لیکن اس کی ظرافت کا پایہ بلند نہ تھا، اور یہ بے تکلّف ذاتی حملے سوقیانہ انداز میں کیا کرتا تھا۔''

[چند اہم اخبارات اور رسائل، ص۔ 199]

بہار کی اردو صحافت 'الپنچ' کے ساتھ ہی 20ویں صدی میں داخل ہوتی ہے۔ 1910ء کے پریس ایکٹ کے سبب ہندستان کے دوسرے اخبارات کی طرح بہار کے اردو اخبارات بھی مشکل دور میں پہنچ گئے۔ بڑی تعداد میں اخبارات و رسائل بند ہوئے اور صحافیوں نے حکومت کے سامنے سپر ڈال دی۔ اس دوران بہار شریف سے 1912ء میں ''اتحاد'' نام سے ایک اخبار جاری ہوا۔ اس کے بانی مدیر شیخ نُور محمد تھے۔ ابتدائی عہد میں یہ ہفتہ وار تھا۔ حکومت مخالف رویّے کی وجہ سے اخبار کی ضمانت ضبط ہوئی اور پھر جناب شفیع داؤدی کی کوششوں سے اس کا دفتر بہار شریف سے پٹنہ منتقل ہوا۔ اس اخبار سے عبدالجبّار رحیدری، پروفیسر اسماعیل وحشی، راغب احمد وغیرہ بہ طور مدیر اور معاون مدیر وابستہ تھے لیکن 1935ء سے 1951ء کے دوران تقریباً 16 برس تک اس اخبار کے مدیر سلطان احمد تھے۔ یہ اخبار اپنے حلقۂ اثر کے اعتبار سے نہایت اہم تھا۔ ہندستان کی جنگِ آزادی کی تحریک اپنے فیصلہ کُن دور میں پہنچ چکی تھی۔ اس وجہ سے بھی اس اخبار نے بہار میں اپنی خاص جگہ بنالی۔ ڈاکٹر عبدالخالق نے 'مقالاتِ سلطان احمد' ترتیب دے کر شائع کر دیا جس میں 'اتحاد' کے وہ اہم مضامین جو ایڈیٹر سلطان احمد کے قلم سے نکلے، یکجا ہو گئے ہیں۔ 'اتحاد' کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مدیر سلطان احمد کی ایک تحریر کافی ہے:

''1942ء کے ابتدائی ایّام تھے۔ گاندھی جی نے ''بھارت چھوڑو'' کا نعرہ
بلند کیا اور سارے ملک میں ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کانگریسی کارکنوں
نے ہند کا چپّہ چپّہ چھان ڈالا۔ قومی اخبارات نے پورا تعاون کیا۔ پُرجوش
مضامین ومقالوں کی بھرمار ہوئی۔ خبروں کی وہ اودھم مچی کہ داستانوں کا مزا
جاتا رہا۔ اس وقت اُردو صحافت کا نمائندہ بہار کا کثیرالاشاعت اخبار ''اتحاد''
تھا۔ اخبار عوام کی رہنمائی کرتے ہیں اور ترجمانی بھی۔ 'اتحاد' اس تحریک سے
وابستہ ہوگیا۔ پھر کیا تھا، ہر جگہ سفر وحضر میں اسی کا ذکر تھا، نئی نئی خبروں، پُرزور
مقالوں اور مسلسل مضامین نے قوم میں زندگی وحرکت کی لہریں دوڑا دیں۔
چنانچہ تحریک پروان چڑھی، مُلک کو آزادی ملی۔''

آزادی سے قبل ''دیہات'' نام سے ایک اخبار جنوری 1940 میں شروع ہوا۔ یہ حکومتِ بہار کا ترجمان تھا اور اس کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ دیہاتی حلقے میں رہنے والے لوگوں سے دنیا جہان کی خبروں کو متعارف کرانا ضروری ہے۔ برقی پریس، سبزی باغ، بانکی پور، پٹنہ سے یہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ حکومت بہار اسے مفت تقسیم کرتی تھی۔ یہ اخبار کمپنی حکومت کے لیے اپنی خاص باتیں دیہی عوام تک پہنچانے کے مقصد سے ایک پلیٹ فارم تھا۔ اس اخبار میں دوسری جنگِ عظیم کے سلسلے سے خبروں کی بہتات ہے۔ بہار میں ریڈیو اسٹیشن کے آغاز کے سلسلے سے 19 مارچ 1940 کے شمارے میں یہ اطلاع شائع ہوئی ہے:

''بہاری اس خبر کو بڑی خوشی سے سنیں گے کہ عنقریب پٹنہ میں ایک ریڈیو
اسٹیشن کھلنے والا ہے۔ عرصے سے یہ تجویز تھی۔ لیکن اب اس سلسلے میں انتظامی
کارروائیاں بھی شروع ہوگئی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب کہ بہار کا صدر مقام
بہار کی آبادی سے قریب تر ہوجائے گا۔''

پندرہ روزہ ''روشنی'' اس اعتبار سے ایک تجرباتی اخبار تھا کیوں کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع ہوتا تھا۔ ماس لٹریسی کمیٹی کے زیرِ اہتمام اس کی اشاعت ہوتی تھی اور

اس کے چیف ایڈیٹر عبدالمنان اور مدیران میں دھرمیندر برھمچاری شاستری، سید حسن اور رگھونندن پرساد سنہا شامل تھے۔ یکم اپریل 1940 سے دسمبر 1941 تک کے شمارے کتب خانے میں دستیاب ہیں۔ یہ اخبار بھی ''دیہات'' کی طرح ہی حکومت کا طرف دار تھا۔ اس کے صفحات سے دوسری جنگِ عظیم کی بعض توجّہ طلب تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں جو 'روشنی' میں 15 اگست 1941ء کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں:

(۱) ''روس دیس میں روسیوں اور جرمنوں میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ اس
وقت دونوں طرف کے نوّے لاکھ آدمی لڑ رہے ہیں۔ جرمنوں نے لینن گراد،
کیوا اور روس کی راجدھانی ماسکو کو لے لینے کے لیے سر اور دھڑ کی بازی لگادی
ہے۔ لیکن سورما روسیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چل رہی ہے۔ اب تک
جرمنوں کو پندرہ لاکھ اور روسیوں کو چھ لاکھ سپاہیوں سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ ہٹلر
نے جب روس پر چڑھائی کرنے کے لیے حکم دیا تھا تو اس کے دو بڑے بڑے
سیناپتیوں نے، جو اس کے ہاتھ پاؤں سمجھے جاتے تھے، اسے بہت منع کیا۔ ہٹلر
نے کسی کی بات نہ مانی۔ اس نے ایک کو ایسا ذلیل کیا کہ اس نے اپنی جان دے
دی اور دوسرا نظر بند کرلیا گیا لیکن وہ کسی طرح بھاگ کر لاپتہ ہوگیا۔''

(۲) ''ہندستان کے بڑے لاٹ صاحب لڑائی کے خزانہ سے ہندستان کے بنے
ہوئے ایک لاکھ روپے کے مرہم پٹّی کے سامان، اوزار اور دوائیں روس
بھیجنے والے ہیں۔''

آزادی کے آس پاس روزناموں کی بابت غور کریں تو 9 ستمبر 1942 سے شائع ہونے والا اخبار 'صدائے عام' واضح اہمیت کا حامل ہے۔ 'صدائے عام' تقسیمِ ہند سے پہلے مسلم لیگ کی حمایت میں تھا اور بعد میں وہ اخبار کانگریس کی طرف داری میں شامل ہوگیا۔ اس کے اوّلین ایڈیٹر سید نظیر حیدر تھے۔ بعد میں سید رضی حیدر نے ادارت کی ذمّے داری سنبھالی اور محمد مرغوب اور شبیر احمد کارکن صحافی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 'صدائے عام' کے خصوصی نمبر شائع ہوا کرتے تھے اور

اُن کی اچھی خاصی شہرت بھی رہی لیکن تکنیکی ترقی میں یہ اخبار دوسرے اخباروں کی طرح وقت کی گرد بن گیا۔ کانگریس رہنما عبدالقیوم انصاری کے ایما سے معروف افسانہ نگار سُہیل عظیم آبادی نے اپریل 1949 میں روزنامہ ''ساتھی'' شائع کیا۔ بعد میں غلام سرور، ولایت علی اصلاحی، نور محمد، خالد رشید صبا، حق ندوی اور شاہد رام نگری اس اخبار سے متعلق ہوئے۔ 'صدائے عام' کی طرح 'ساتھی' کے بھی خصوصی نمبر علمی حلقے میں توجّہ کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ ابتدا میں یہ اخبار متوازن تھا لیکن بعد میں یہ کانگریس حکومت کی ہم نوائی میں گرفتار ہوگیا۔ رفتہ رفتہ یہ اخبار بھی وقت کی تحویل میں سما گیا۔

جناب غلام سرور نے ہفتہ وار کی شکل میں ''سنگم'' اخبار'' نکالا جو بعد میں 1962 سے روزنامہ کی شکل میں شائع ہونے لگا۔ اس اخبار کے صحافیوں میں بیتاب صدیقی، شاہ مشتاق احمد، سید شہباز حُسین (جو بعد میں رسالہ 'آج کل' کے ایڈیٹر ہوئے)، شاہد رام نگری، عبدالمغنی اور معین انصاری جیسے افراد شامل تھے۔ اس اخبار میں غلام سرور نے اپنی صحافتی تحریروں سے ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا۔ وہ صحافی کے ساتھ ساتھ سیاست داں بھی ہوئے لیکن قلم پیشگی کو انھوں نے ایک عرصے تک نہیں چھوڑا۔ اس وجہ سے آزادی کے بعد اُبھرنے والے اردو صحافیوں میں وہ سب سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ دوسرے اخباروں کی طرح صرف نام کے مدیر نہیں تھے بلکہ مُلک اور صوبے کی سیاست اور سماجی صورتِ حال پر وہ اپنی واضح رائے دینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے تھے۔ سیاست میں اُن کی مشغولیت نے اخبار کی طرف سے توجہ کم کی اور آٹھویں دہائی سے یہ اخبار اپنی کشش کھونے لگا۔

پندرہ روزہ کے طور پر در بھنگا سے 'قومی تنظیم' کا آغاز ہوا۔ اس کے بانی ایڈیٹر سید محمد عمر فرید تھے۔ 1965 میں یہ عظیم آباد منتقل ہوگیا اور 1975 تک ہفت روزہ کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔ یہ اخبار مارچ 1975 سے روزنامہ کی صورت میں نکلنے لگا، جو اَب تک جاری ہے۔ اب اس کی اِدارت سید محمد اشرف فرید اور سید محمد اجمل فرید کے ذمّے ہے۔ بہار سے نکلنے والے اخبارات میں یہ پہلا اخبار ہے جس نے مختلف شہروں اور صوبوں کے علاحدہ ایڈیشن شائع کیے۔ اپریل 1981ء

سے قومی آواز نے پٹنہ ایڈیشن شروع کیا۔ عثمان غنی اور شاہین محسن نے اس اخبار کو صحافتی قیادت بخشی۔ جس طرح ملک گیر پیمانے پر حیات اللہ انصاری اور اُن کے ساتھیوں نے مل کر 'قومی آواز' کی اشاعت سے مُلک میں اردو صحافت کا ایک نیا مذاق پیدا کیا تھا، 'قومی آواز' نے بہار میں صحافت کی یہ نئی روشنی بہم پہنچائی۔ پچھلے تیس پینتس برسوں میں وہ صحافی جو سوجھ بوجھ کے ساتھ بہار میں سرگرمِ عمل رہے ہیں، اُن میں بلاشبہ 'قومی آواز' کے تربیت یافتہ افراد کی ایک بڑی جماعت ہے جو اخبار کے بند ہو جانے کے بعد دوسرے اخباروں سے منسلک ہوگئے۔

1974 میں رضوان احمد نے ہفتہ وار کی شکل میں 'عظیم آباد ایکسپریس' شائع کیا۔ 1980 سے یہ روزنامہ میں تبدیل ہوگیا۔ 'عظیم آباد ایکسپریس' اپنی سنسنی خیزی کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ رضوان احمد کے اِداریے غیر منطقی اندازِ فکر اور سیاسی کھیل تماشے کا حصّہ بننے کی وجہ سے تذکرے میں ہوتے تھے۔ 26 فروری 1985 سے روزنامہ 'ایثار' شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے بانی مدیر شاہین محسن تھے اور شاہد رام نگری اس کے پرنٹر پبلشر تھے۔ 8 اپریل 1987 کو یہ اخبار بند ہوگیا۔ طباعت اور پیش کش کے اعتبار سے اُس وقت تک کے سب سے خوب صورت اخباروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ 1974 میں ہفت روزہ 'پندار' کا آغاز ہوا۔ جولائی 1988 سے یہ روزنامہ ہوگیا۔ 1984ء میں ہفتہ وار فاروقی تنظیم شروع ہوا جو دو برسوں کے بعد روزنامہ کی شکل میں بدل گیا۔ 1992 میں اس اخبار نے رانچی سے اپنا علاحدہ ایڈیشن شروع کیا۔ فی الوقت رانچی اور پٹنہ دونوں جگہوں سے یہ اخبار شائع ہو رہا ہے۔ روزنامہ 'انقلابِ جدید' 10 ستمبر 1995 سے شروع ہوا لیکن تھوڑے دنوں میں ہی یہ اخبار اپنی عمومی رفتار قائم نہ رکھ سکا۔ اور اب تو اس کی اشاعت بھی بہت معمولی ہے۔

اس دوران قومی اخبارات میں روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' نے پٹنہ سے اپنی اشاعت شروع کی۔ صحافت کے قومی معیار کے پیشِ نظر اس اخبار نے اپنی شناخت قائم کی لیکن توسیعِ اشاعت کے سلسلے سے اس اخبار نے موثر پیش رفت نہیں کی جس کی وجہ سے ایک معیاری اخبار مقبولیت کے معاملے میں وہ جگہ نہیں بنا سکا جو اس کا حق تھا۔ 27 مئی 2013 سے روزنامہ 'انقلاب' 16

صفحات پر مشتمل مکمل رنگین اخبار کی شکل میں شائع ہونا شروع ہوا جو اپنے اندازِ پیش کش اور صحافت کے قومی معیار کی پاسداری کی وجہ سے مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ملٹی سٹی ایڈیشن کے سبب ہر خطے میں اخبار کے پہنچ جانے سے بھی روزنامہ 'انقلاب' مختصر مدّت کے باوجود بہار میں کامیاب تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اخبار کے خصوصی فیچر اور سیاسی وسماجی موضوعات پر خصوصی تبصرے شائع کرنے کی روش نے بھی اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ اس اخبار میں ایڈیٹر سے لے کر عام رپورٹر تک سبھی صحافت پیشہ افراد کام کر رہے ہیں جب کہ بہار کے دوسرے اخبارات کے مدیران حقیقت میں غیر صحافی مالکان ہیں اور اکثر وبیش تر ان کے نام سے شائع شدہ تحریریں حقیقت میں ان اخباروں کے کارکن صحافیوں کی ہوتی ہیں۔

بہار کی ادبی صحافت پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو انجم مانپوری کے 'ندیم'، قاضی عبدالودود کے 'معیار'، کلیم الدین احمد کے 'معاصر' وفا ملک پوری کے 'صبحِ نو'، قیوم خضر کے 'اشارہ'، کلام حیدری کے 'آہنگ'، ظفر اوگانوی کے 'اقدار'، بہار اردو اکادمی کے 'زبان وادب'، عبدالمغنی کے 'مریخ' اور سہیل عظیم آبادی، عبدالقیوم انصاری کے رسالہ 'تہذیب'، طارق متین کے 'علم وادب' اور وہاب اشرفی کے 'مباحثہ' وغیرہ کا تذکرہ لازم ہے۔ ان رسائل میں تقریباً نصف کی حیثیت علاقائی سے زیادہ نہیں رہی۔ لیکن ان رسائل نے اپنے عہد میں قومی سطح پر لکھنے والوں کو ایک مستحکم پلیٹ فارم عطا کیا۔ 'ندیم'، 'معیار'، 'معاصر'، 'صبحِ نو'، 'اقدار'، 'آہنگ' اور 'مباحثہ' کو قومی سطح پر توجہ سے پڑھا جاتا رہا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ملک کے کسی بھی صوبے سے زیادہ ادبی رسائل کی فروخت بہار میں ہوتی ہے لیکن بہار میں تواتر سے نکلنے والا ایک بھی بہترین ماہانہ ادبی رسالہ ایسا نہیں ہے جسے ملک کے نمائندہ ادبی رسائل میں شامل کیا جا سکے۔

بہار کی اردو صحافت کی ڈیڑھ صدی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات بھی افسوس ناک ہے کہ آزادانہ طور پر بہار کے اردو صحافیوں نے اپنی قومی پہچان اس اعتبار سے قائم نہ کی جس کے لیے وہ ہر اعتبار سے موزوں تھے۔ اخبارات ورسائل کا یہ مقدر ہے کہ ان کے صفحات پر روز ایک دنیا پیدا ہوتی ہے اور پھر نئے شمارے کی آمد تک وہ دفن ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ہمارے بڑے صحافیوں کا یہ دستور

رہا ہے کہ اپنے کالم اور مضامین کا انتخاب جلد بند طریقے سے منظرِ عام پر لائیں۔ بعض اخبارات و رسائل نے بھی اپنے اداریے یا مضامین کتابی شکل میں شائع کیے۔ غلام سرور نے اپنے مضامین کا انتخاب شائع کیا لیکن صحافت سے متعلق ان کے ہزاروں نوشتہ جات اخبار کی گرد ہو کر رہ گئے۔ رضوان احمد کے ابتدائی مضامین تو ''مجھے بولنے دو'' کے عنوان سے شائع ہوئے لیکن اس سے زیادہ ان کے مضامین اخبار میں ہی پڑے رہ گئے۔ شاہد رام نگری، عبدالرافع، ریاض عظیم آبادی، مشتاق احمد، ریحان غنی، راشد احمد وغیرہ ایسے صحافی ہیں جن کے مضامین جمع کر دیے جائیں تو سب کی کئی جلدیں تیار ہو جائیں گی لیکن اس جانب کسی کی خاص توجہ نہیں ہے۔ کلام حیدری نے اپنے اداریے یکجا کیے تھے لیکن ان کی بھی بعد کی صحافیانہ تحریریں جمع نہ کی جا سکیں۔

ہندستان کی اردو صحافت روایت اور جدّت کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ روایت سے اسے ادبی شان اور سماجی جواب دہی کی پونجی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے جفاکشی کے ساتھ بے باکی سیکھی تھی۔ لیکن ٹیکنالوجی اور کارپوریٹ لازمیت نے اردو صحافت کو ایک الگ زمین پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اب ادب اور ادبیت کی کون کہے، عام قواعد اور انشا کے کھلواڑ روزانہ صبح سے ہمارا امتحان لیتے ہیں۔ جلدی میں خبریں یا اُن پر تاثرات پیش کر دینے کا جبر ہمیں روزانہ حقائق کی بھول اور معیار کی پستی میں پہنچا رہا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ رنگین اور روشن چھپائی نے ہم سے ڈھیرے ڈھیرے جتنا کچھ چھین لیا ہے، اس کی بھرپائی ابھی ہوتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ بہار کے اردو اخبار اور ادبی رسائل کو سامنے رکھیں اور ہندی اور انگریزی جرائد سے ان کا موازنہ کریں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ حقیقی صحافت کے میدان میں ہماری جگہ کہاں ہے؟ 'انقلاب' اور 'راشٹریہ سہارا' اخبار کے علاوہ دوسرے اخبارات کے پاس اپنے خصوصی کالم نگار نہیں ہیں۔ انھیں جو کچھ پکا پکایا آ گیا، انھی پر ان کی زندگی ٹکی ہوئی ہے۔ اس سے ان کی ترقی رُکی ہوئی ہے اور معیار کے بارے میں روزانہ سوالات قائم ہو رہے ہیں۔ اردو صحافیوں کا یہ بڑا مسئلہ ہے کہ وہ دوسرے ہر ادارے کا احتساب تو کرنا چاہتے ہیں لیکن اپنے صحافتی اعمال اور معیار و مرتبے کے لیے کسی متواتر جائزے کی اہمیت کے وہ قائل معلوم نہیں ہوتے۔ سب کی ڈیڑھ اینٹ کی جدا مسجدیں ہیں۔ اس

لیے صحت مند طریقے سے ایک دوسرے کے دامن میں جھانکنا انھیں زیادہ معقول معلوم نہیں ہوتا۔
ان وجوہات سے بھی بہار کی اردو صحافت معیار کے اعتبار سے اب بھی قومی اوسط سے کم تر ہے۔
ہمیں امید ہے کہ موجودہ دور کے صحافی اخبار کی نہ صرف تکنیکی ترقیوں پر توجّہ دیں گے بلکہ اس کے معیار اور مرتبے کے سلسلے سے بھی بیدار ذہنی کا ثبوت پیش کریں گے اور اپنی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کے بہترین وارث ثابت ہو پائیں گے۔

[اس مضمون کی تکمیل میں قاضی عبدالودود، پروفیسر سید مظفر اقبال، ڈاکٹر سید احمد قادری اور ڈاکٹر افضل مصباحی کی کتابوں سے خصوصی طور سے رجوع کیا گیا ہے جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔]

SAFDAR IMAM QUADRI

202, Abu Plaza, NIT More, Ashok Rajpath, Patna-800006 (Bihar)

safdarimamquadri@gmail.com

انوار الحسن وسطوی

بہار میں اردو صحافت: آزادی کے بعد

انیسویں صدی کے دوسرے نصف سے ہی بہار میں اردو صحافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس کا بین ثبوت پٹنہ سے شائع ہونے والا پہلا اردو اخبار ''ہرکارہ'' ہے جس کی اشاعت پٹنہ سیٹی سے 1885ء میں شروع ہوئی۔ یہ اخبار ہر ماہ تین بار یعنی انگریزی تاریخ کی پہلی، گیارہویں اور اکیسویں تاریخ کو نکلا کرتا تھا۔ آزادی سے قبل جن دیگر اردو اخبارات کے نکلنے کا سراغ ملتا ہے ان میں ہفت روزہ ''بہار' پٹنہ' ہفت روزہ ''ویکلی رپورٹ' گیا' ہفت روزہ عظیم الاخبار' پٹنہ' پندروزہ ''اخبار الاخبار'' مظفر پور''، پندرہ روزہ ''چشمۂ علم'' پٹنہ''، ''نادر الاخبار'' مونگیر، ''ضیاء الابصار، آرہ''، ہفت روزہ ''نسیم سحر'' پٹنہ، ہفت روزہ ''بہار پنچ'' پٹنہ، روزنامہ ''انیس بہار'' پٹنہ (غالباً یہ بہار کا پہلا اردو روزنامہ تھا) ہفت روزہ ''قاصد''، پٹنہ ہفت روزہ ''نسیم'' چھپرہ ہفت روزہ ''شرف الاخبار'' بہار شریف ہفت روزہ ''صبح وطن'' پٹنہ، پندرہ روزہ ''مہر نور'' مظفر پور ہفت روزہ ''ایلچی''، پٹنہ، ''اسٹار آف انڈیا'' آرہ، ''عالم''، آرہ ''انیس'' پٹنہ ہفت روزہ شہرۂ آفاق''، ''تہذیب''، پٹنہ ہفت روزہ'' گیا پنچ'' گیا، ہفت روزہ تہار گزٹ ہفت روزہ ''اتحاد'' بہار شریف (آغاز 1912ء اختتام 1951ء) مشہور ہے کہ ''اتحاد'' کی بلند پایہ صحافت کے معترف مولانا ابوالکلام آزاد تک تھے۔ اس کا شمارہ ملک کے اہم اخباروں میں ہوتا تھا۔ ''اتحاد'' کے آخری اڈیٹر جناب سلطان احمد تھے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اخبارات کا ذکر ملتا ہے جن میں ہفت روزہ ''پٹنہ اخبار''، پٹنہ ہفت روزہ ''مشیر بہار' ہفت روزہ ''البدر، دربھنگہ'' سہ روزہ ''پیغام، پٹنہ''، پندرہ روزہ ''مساوات، پھلواری شریف''، ہفت روزہ ''آئینہ''، کشن گنج'' ہفت روزہ ''کارواں، پٹنہ'' ہفت روزہ ''مسلم، پٹنہ' ہفت روزہ ''میل ملاپ، پٹنہ' اور ''الہدیٰ''، دربھنگہ'' کے نام شامل ہیں۔
ہفت روزہ ''نقیب''، پھلواری شریف کو چھوڑ کر مذکورہ بالا میں کسی بھی اخبار کی اشاعت غالباً

اب نہیں ہو رہی ہے۔ہفت روزہ ''نقیب''، امارت شرعیہ، بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کا ترجمان ہے جو گذشتہ ۸۰؍برسوں سے تسلسل سے شائع ہو رہا ہے۔واضح ہو کہ امارت شرعیہ نے ''امارت'' کے نام سے اپنا ترجمان نکالنا شروع کیا تھا جو ۱۹۳۳ء میں جاری کیا گیا تھا۔اس کے ایڈیٹر مولانا سید شاہ عثمان غنیؒ تھے۔حکومت کے خلاف ایک اداریہ لکھنے کی پاداش میں ''امارت'' کی اشاعت پر حکومت نے پابندی لگادی اور اس کے ایڈیٹر مولانا مذکور کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ امارت تقریباً دو سال جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ بعدہٗ امارت شرعیہ نے ''نقیب'' کے نام سے اپنا ترجمان جاری کیا جو ۱۹۳۶ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ یہ اخبار روز اول سے دین و ملت کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ بہار کے اس سب سے قدیم ہفتہ وار کے موجودہ ایڈیٹر بزرگ صحافی سید عبدالرافع اور معاون ایڈیٹر مولانا رضوان احمد ندوی ہیں۔

بہار میں اور صحافت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ اندزہ ہوتا ہے کہ آزادی سے قبل یہاں اردو روزناموں کے مقابلے ہفت روزہ، پندرہ روزہ، اور ماہناموں کا اجرا زیادہ ہوا۔ جبکہ آزادی کے بعد ہفت روزوں اور ماہناموں کی بہ نسبت روزنامے زیادہ نکلے۔ان روزناموں میں بعض آزادی کے قبل ہی سے شائع ہوئے ہیں۔سب سے قدیم اردو روزنامہ ''صدائے عام''، پٹنہ تھا جو آزادی سے قبل ۱۹۴۲ء میں ہی شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ جنگ آزادی کے دوران اس اخبار نے بہار کے مسلمانوں کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔گرچہ اس اخبار کا جھکاؤ کانگریس پارٹی کی جانب تھا لیکن ملت کی رہنمائی ، سربلندی اور اس کی سرخ روئی اس کا مشن تھا۔اخبار کے پہلے مدیر سید نظیر حیدر (مرحوم) تھے جو اخبار کے مالک بھی تھے۔۶۰؍کی دہائی سے جناب محمد مرغوب (مرحوم) اور سید رضی حیدر اس کی ادارت کی ذمہ داری نبھانے لگے۔۲۰۰۰ء میں یہ اخبار اپنی عمر کے ۵۸؍سال پورے کر کے بند ہو گیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''صدائے عام'' نے بہار کی اردو صحافت کو نہ صرف ایک فکر عطا کی بلکہ بہار کی اردو صحافت کی رہنمائی بھی کی، جس کے نتیجے میں بہار میں اور پٹنہ سے ہی کئی اردو روزنامے اور ہفت روزہ نکلے جن میں بعض اخبارات نے اچھی شہرت حاصل کی اور اپنی شناخت بنائی۔آزادی سے دو سال قبل ۱۹۴۵ء میں غلام سرور صاحب نے دانا پور سے ہفتہ وار ''نوجوان'' نکالا۔ یہ غلام سرور صاحب کی

ادارت میں نکلنے والا پہلا اخبار تھا۔۱۹۴۸ء میں یہ اخبار بند ہو گیا، واضح ہو کہ یہ اخبار مسلم لیگ حامی تھا۔۱۹۴۷ء میں پٹنہ سے ''الہلال'' نام کا ایک اخبار جاری ہوا۔اسی زمانہ میں ''آکاش'' نام کا بھی ایک اخبار نکلا۔۱۹۴۸ء میں ہفت روزہ ''نئی کرن'' اور ۱۹۴۹ء میں ہفتہ وار ''صبح زندگی'' جاری کیا گیا لیکن یہ اخبارات جلد ہی بند ہو گیا۔مولانا بیتاب صدیقی نے پٹنہ سے ہفت روزہ ''مومن دنیا'' ۱۹۴۸ء میں جاری کیا، جو چند شماروں کے بعد بند ہو گا۔ جناب سہیل عظیم آبادی نے ۱۹۴۹ء میں پٹنہ سے روزنامہ ''ساتھی'' نکالا لیکن وہ اسے زیادہ دنوں تک جاری نہیں رکھ سکے چنانچہ انہوں نے ''ساتھی'' کو غلام سرور صاحب سے فروخت کر دیا۔ جناب فضل حق بھی اسے جاری نہ رکھ سکے اور انہوں نے جناب احد نور کے ہاتھوں اسے فروخت کر دیا جو شری کرشن سنہا کی وزارت میں وزیر مملکت تھے۔اس زمانہ میں ''ساتھی'' کا مقابلہ صرف ''صدائے عام'' سے تھا۔روزنامہ ''ساتھی'' اپنے ہفتہ وار ادبی اڈیشن کے سبب کافی مقبول تھا۔ جناب احد نور کے بعد ان کے صاحبزادے جناب خالد رشید صاحب نے اپنی ادارت میں اس اخبار کو عرصے تک جاری رکھا۔سرکاری اشتہارات سے محروم ہو جانے کے سبب دیگر اخبارات کی طرح ''ساتھی'' بھی نکلنا بند ہو گیا۔۱۹۵۰ء میں ہی پٹنہ سے ہفت روزہ ''سیرت'' جاری ہوا۔۱۹۵۳ء میں پٹنہ سے ہفت روزہ ''پرچم'' نکلا۔ ان تمام اخبارات کی حیات مختصر رہی۔مولانا محی الدین ندوی نے 51-1950ء کے آس پاس روزنامہ ''صداقت'' کا اجرا کیا۔ان کے بعد ان کے صاحبزادے سید فصیح الدین کی ادارت میں یہ اخبار نکلتا رہا۔

۱۹۵۳ء میں دانا پور (پٹنہ) سے جناب غلام سرور نے ہفت روزہ ''سنگم'' جاری کیا۔ یہ کانگریس مخالف اخبار تھا۔اقلیتوں اور اردو کے مسائل کو اس اخبار میں اس قدر نمایاں جگہ دی گئی کہ پوری ریاست کی اردو آبادی میں ایک بیداری پیدا ہوئی اور مسائل کے حل کے لئے تحریکیں ابھرنے لگیں۔اس اخبار کی تحریک کے نتیجے میں بہار میں اردو تحریک شروع ہوئی۔ یہ ہفتہ وار صرف بہار ہی نہیں بلکہ ملک کے مشہور اخباروں میں شمار ہونے لگا۔۱۹۶۲ء میں ''سنگم'' روزنامہ ہوا اور اس کا دفتر دانا پور سے پٹنہ منتقل ہو گیا۔کانگریس مخالف اور حکومت مخالف ہونے کے سبب اس اخبار پر سرکار

نے کئی دفعہ مقدمے دائر کئے جس کے نتیجے میں اس کے ایڈیٹر جناب غلام سرور کو تقریباً نصف درجن دفعہ جیل کی سزا کاٹنی پڑی لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور ''سنگم'' کو حکومت کا تابعدار نہیں بننے دیا۔ جب غلام سرور صاحب صحافت چھوڑ کر سیاست میں آ گئے تو انہوں نے اخبار کی ادارت کی ذمہ داری جناب مظاہر الدین ایڈوکیٹ کے سپرد کر دی۔ ۱۹۹۸ء میں الحاج غلام سرور کے داماد ڈاکٹر ایم ۔اعجاز علی (سرجن) نے اس اخبار کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ رنگین طباعت میں یہ اخبار ۱۲ صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔ پسماندہ مسلم برادریوں کے مسائل یہ اخبار مؤثر طور پر حکومت کے سامنے اٹھا رہا ہے جس کے سبب یہ اپنے قاریوں کے حلقے میں کافی مقبول ہے۔

۱۹۵۸ء میں ہفتہ وار ''الکلام'' معروف صحافی شاہد رام نگری کی ادارت میں جاری ہوا۔ گرچہ اس کی مدت حیات کم رہی لیکن اس کا اعلیٰ معیار صحافت آج بھی قابل ذکر ہے۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان پٹنہ اور بہار کے متعدد مقامات سے کئی ہفت روزہ اور روزنامے جاری ہوئے اور بند ہوئے۔ ان میں چند کا سرسری تذکرہ حسب ذیل ہے:

روزنامہ ''ہمارا نعرہ'' (ایڈیٹر شمس الہدیٰ استھانوی)، روزنامہ ''کوہکن'' (ایڈیٹر نورالہدیٰ)، روزنامہ ''پیغام نہرو'' (ایڈیٹر رفیع الدین راہی) ہفت روزہ ''اتحاد وطن'' (اڈیٹر امین اعجازی)، روزنامہ ''راہرو'' (ایڈیٹر شمائل نبی) ہفت روزہ ''اتحاد وطن'' (ایڈیٹر معین انصاری)، روزنامہ ''دیش بدیش'' (ایڈیٹر ایس۔ ایم۔ آصف) ہفت روزہ ''ہمارا بہار'' (ایڈیٹر اسلم آزاد) ''روزنامہ عظیم آباد ایکسپریس'' (ایڈیٹر رضوان احمد) ہفتہ وار ''مسائل'' (ایڈیٹر ریاض عظیم آبادی) ہفت روزہ ''روشنی'' (ایڈیٹر مطیع الرحمٰن شمیم) ہفت روزہ ''آدرش'' گیا (ایڈیٹر معین شاہد) ہفت روزہ ''مورچہ'' گیا (ایڈیٹر کلام حیدری)

ہفت روزہ ''بودھ دھرتی''، گیا (اڈیٹر سید احمد قادری) ہفت روزہ آئین نو'' (ایڈیٹر ایم شمیم کرنلسٹ) ہفت روزہ ''امانت'' (ایڈیٹر، احمد کبیر) ''مگدھ پنچ'' (ایڈیٹر اعجاز علی ارشد) ہفت روزہ ''سیکولر محاذ'' (ایڈیٹر سلمٰی ریاض) ''سیکولر محاذ'' اب ریاض عظیم آبادی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ ۶۰ر کی دہائی میں ہی ہفتہ وار ''امروز'' ہارون رشید کی ادارت میں پٹنہ سے جاری ہوا۔ اس کے علاوہ

ہفت روزہ ''انجلی'' (ایڈیٹر شمس الہدیٰ بتیاوی) ہفت روزہ ''ہمزاد (ایڈیٹر احمد حسین آزاد)، ''صدائے ہند''، پٹنہ (ایڈیٹر خورشید انور عارفی) بھی پٹنہ سے جاری ہوئے۔ اسی زمانے میں ہفت روزہ ''پندار'' ہفت روزہ ''پرستار'' ہفت روزہ ''رفاقت'' اور روزنامہ ''طاؤس'' بھی پٹنہ سے جاری ہوئے۔ ۷۰ر کی دہائی میں ہفت روزہ ''غمخوار'' (ایڈیٹر شارق اجے پوری) ہفت روزہ ''ہمارا پرچم'' (ایڈیٹر شمیم ربانی) ''مومن دنیا'' (ایڈیٹر خالد انور انصاری)، ''ہاتف'' (ایڈیٹر شین مظفر پوری) یہ سب کے سب ہفت روزہ تھے جو پٹنہ سے جاری ہوئے۔ پٹنہ سے ہی ہفت روزہ ''سیکولر ہندوستانی'' (ایڈیٹر بشیر احمد) ہفت روزہ ''الناصر'' (ایڈیٹر ناصر زیدی) ہفت روزہ ''الافکار'' (ایڈیٹر یونس مشہدی) نکلے اور بند ہو گئے۔ اسی زمانے میں سہیل عظیم آبادی نے ''حال'' کے نام سے ایک ہفت وار پٹنہ سے جاری کیا، جو جلد ہی بند ہو گیا۔ معصوم شرقی نے پٹنہ سے ہفت روزہ ''احوال اقلیت''، ''ملن'' اور ''نوجوان'' کے نام سے نکالے جو سبھی چند ماہ ہی زندہ رہ سکے۔ پٹنہ سے ہی شین مظفر پوری نے ہفت روزہ ''قومی دھارا'' شروع کیا، وہ بھی جلد ہی بند ہو گیا۔ پٹنہ سے ہی ''بہار'' اور ''سندیش'' نام کے ہفت روزہ نکلے اور چند ہی شمارے کے بعد بند ہو گئے۔ مزاحیہ شاعر اسرار جامعی نے پٹنہ سے ''چٹنی'' ہفتہ وار نکالا جو چند ہی شمارے نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۸۰ء میں پٹنہ سے ہفت روزہ ''بہا ینگ ٹائمز'' (ایڈیٹر امتیاز کریم) اور ہفت روزہ ''ساتھ'' (ایڈیٹر بہاؤ الدین احمد) جاری ہوا۔ پھلواری شریف پٹنہ سے ۱۹۸۰ء میں مظفر حسن کی ادارت میں ''پیغام اندرا'' نکلا۔ ان ہی کی ادارت میں ۱۹۸۰ء میں ''صدائے ہاتف'' روزنامہ کی شکل میں جمشید پور سے نکلا۔ شاہین محسن نے گیا سے ''اردو ایکسپریس'' کے نام سے ۱۹۷۸ء میں ایک روزنامے کا اجرا کیا۔ یہ ایک معیاری روزنامہ تھا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی یہ اخبار بند ہو گیا۔ پٹنہ سے ۱۹۸۸ء میں پروفیسر جابر حسین کی ادارت میں روزنامہ ''جوہر ہند'' کے بھی چند شمارے نکلے۔ تقریباً اسی سال عطا عابدی کی ادارت میں مدھوبنی سے پندرہ روزہ ''مسافر'' نکلا جو غالباً مدھوبنی ضلع سے نکلنے والا پہلا اخبار تھا۔ ۱۹۸۳ء میں علی ظفر فاروقی کی ادارت میں روزنامہ ''آغاز و انجام'' جاری ہوا۔ اس طرح تیس سال کے عرصے میں بے شمار ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور روزنامے منظر عام پر آئے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی ایک تحریر

''بہار میں اردو صحافت'' میں بجا تحریر فرمایا ہے کہ ''بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں آزادی کے بعد بہار میں اردو روزناموں، ہفتہ واروں اور ماہناموں کا سیلاب آ گیا تھا'' (ماہنامہ افکار ملی، دہلی، اپریل ۲۰۰۰ء)

آزادی کے بعد پٹنہ سے کئی قابل ذکر اردو روزنامے اور ہفتہ وار نکلے جن میں روزنامے ''صدائے عام'' روزنامہ ''ساتھی'' اور روزنامہ ''سنگم'' کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ دیگر اردو روزناموں میں ''قومی آواز''، پٹنہ ''ایثار''، پٹنہ، ''قومی تنظیم''، پٹنہ، ''فاروقی تنظیم''، پٹنہ ''انقلاب جدید، پٹنہ ''روزنامہ ''پندار''، پٹنہ ''روزنامہ راشٹریہ سہارا، پٹنہ'' اور روزنامہ ''انقلاب'' پٹنہ کے ذکر کے بغیر بہار کی اردو صحافت کو ایک سمت دیا جس کے نتیجے میں اسٹاف رپورٹنگ، تفتیشی رپورٹنگ اور فوٹو جرنلزم کی روایت شروع ہوئی۔ مکمل دس سال تک یہ اخبار پورے آب و تاب سے شائع ہونے کے بعد ۱۹۹۱ء میں بند ہو گیا۔ ۸۰ر کی دہائی میں ہی مولانا محمد ولی رحمانی کی زیر نگرانی روزنامہ ''ایثار'' پٹنہ سے جاری ہوا جس کے اڈیٹر شاہین محسن تھے۔ ''ایثار'' نے بہار کی اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے میں اہم رول ادا کیا، لیکن چند سال ہی یہ اخبار زندہ رہا۔ ''ایثار'' کی صوری اور معنوی خوبیاں آج بھی قارئین کو یاد ہیں۔ سید عمر فرید (مرحوم) نے ۱۹۵۹ء میں دربھنگہ سے پندرہ روزہ ''قومی تنظیم'' جاری کیا جس کے پہلے اڈیٹر ڈاکٹر نجم الہدیٰ بنائے گئے۔ ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی بھی کچھ دنوں تک اس کے اڈیٹر رہے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ اخبار ہفت روزہ ہوا اور دربھنگہ کے بجائے پٹنہ سے نکلنے لگا۔ پھر ۱۹۷۵ء میں یہ روزنامہ ہو گیا۔ ۹۰ر کی دہائی میں جب روزنامہ ''صدائے عام'' اور روزنامہ ''سنگم'' کی حالت پست ہونے لگی اور دوسری جانب ''ایثار'' اور ''قومی آواز'' جیسے معیاری اردو روزنامے بند ہو گئے۔ اس وقت بہار کے مسلمانوں کی ترجمانی کے لئے واحد اردو روزنامہ قومی تنظیم بچا تھا۔ اس اخبار نے بہار کی اردو آبادی کے درمیان اپنا حلقہ اثر بڑھایا۔ ساتھ ہی حکومت کی نگاہ میں بھی اسی اخبار کو بہار کے مسلمانوں کا ترجمان سمجھا گیا۔ ۱۹۹۵ء میں ''انقلاب جدید'' جاری ہونے کے بعد قومی تنظیم کی مقبولیت میں قدرے کمی آئی، لیکن جلد ہی اس نے اپنے اندر تبدیلی پیدا کی۔ ۶ر صفحے کے بجائے یہ ۸ر صفحے پر شائع ہونے لگا۔ ۲۰۰۹ء سے یہ ۱۲ر صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔ جس کے ۴ر صفحے رنگین

ہوتے ہیں۔ آج یہ اخبار ایس۔ ایم۔ اشرف فرید (چیف اڈیٹر) ایس۔ ایم۔ اجمل فرید (اڈیٹر) ایس۔ ایم۔ طارق فرید (مینجنگ اڈیٹر) کی کدوکاوش کے نتیجے میں بہار کا سب سے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پٹنہ کے علاوہ یہ رانچی (جھارکھنڈ) اور لکھنؤ (اترپردیش) سے بھی شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۹۵ء میں پٹنہ سے روزنامہ ''انقلاب جدید'' کی اشاعت بڑے تزک بھڑک کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس وقت پٹنہ کے سبھی اردو روزنامے ۴ر یا ۶ر صفحے پر شائع ہو رہے تھے۔ جبکہ ''انقلاب جدید'' آٹھ صفحات پر شائع ہونا شروع ہوا۔ مختلف اخباروں سے منسلک کئی تجربہ کار صحافیوں نے اپنے اپنے اخبار کو چھوڑ کر ''انقلاب جدید'' جوائن کر لیا۔ اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہار کے اخبارات میں کمپیوٹر سے کمپوزنگ کا آغاز روزنامہ ''انقلاب جدید'' نے شروع کیا۔ اس اخبار کے چیف اڈیٹر نیر خورشید، اڈیٹر ڈاکٹر سید شہباز اور مینجنگ اڈیٹر معظم حیدری تھے۔ ''انقلاب جدید'' کی اشاعت شروع ہونے کے بعد ہی پٹنہ سے شائع ہونے والے دوسرے اخبارات نے کمپیوٹر سے کمپوزنگ کا استعمال شروع کیا۔ بلاشبہ بہار کی اردو صحافت میں ''انقلاب جدید'' نے انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ صرف چند سالوں تک یہ اخبار آب و تاب دکھا سکا۔ گرچہ آج بھی یہ اخبار چھپ رہا ہے لیکن صرف اشتہار کے لئے دستیاب ہے، عوام کے پڑھنے کے لیے نہیں ہے۔ ابھی اس کے اڈیٹر سبھاش پرساد سنگھ ہیں۔

روزنامہ ''فاروقی تنظیم'' جس کے بانی مولانا فاروق الحسینی ؒ ہیں۔ یہ روزنامہ مولانا موصوف کے صاحبزادے جناب علی ظفر فاروقی کی ادارت میں پٹنہ کے علاوہ رانچی اور دہلی سے ایک ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ یہ اخبار بھی اپنی طباعت اور مواد کے اعتبار سے بہار کا ایک پسندیدہ اخبار مانا جاتا ہے۔ ۱۲ر صفحات پر شائع ہونے والے اس اخبار کے اداریہ کا صفحہ دل چسپ اور معلوماتی ہوتا ہے۔ رنگین چھپنے کے سبب دیدہ زیب لگتا ہے۔ روزنامہ ''پندار'' پٹنہ جو عرصہ قبل سے ہی شائع ہو رہا تھا۔ ۲۰۰۴ء سے باضابطہ سرکولیشن میں آیا۔ ۱۲ر صفحات کا یہ اخبار صرف ۱ر روپے میں دستیاب ہے۔ اپنی اشاعت کے روز اول سے ہی یہ اخبار ادبی حلقے میں کافی مقبول ہے۔ بالخصوص

اپنے ص ۴/اور ۵/ کے مشمولات کے سبب یہ بڑی دل چسپی سے پڑھا جاتا ہے۔اس اخبار کو ادبی حلقے میں مقبول بنانے میں کہنہ مشق صحافی جناب ریحان غنی کا اہم رول ہے۔اس کے پرنسپل ایڈیٹر جناب اے۔کے۔احسانی اور ایڈیٹر محمد ارشاد ہیں۔ایک روپے کی قیمت میں ملنے والا دوسرا اردو روزنامہ ''امین'' ہے جو جناب معظم حیدری کی ادارت میں نکل رہا ہے۔۱۲/صفحات پر نکلنے والا اس اخبار کی طباعت بھی رنگین ہے۔

۲۰۰۶ء میں بہار کے اردو روزناموں کی تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے پٹنہ ایڈیشن نکلنے سے ہوا۔۱۶/صفحات پر نکلنے والا یہ رنگین اخبار پٹنہ سے شائع ہونے والے تمام اردو اخباروں کے مقابلے زیادہ دیدہ زیب بھی تھا اور معیاری بھی۔لہذا جلد ہی یہ اخبار لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا۔چند دوسرے اردو اخبارات کے کارکن صحافی حضرات نے راشٹریہ سہارا میں جہاں ملازمت اختیار کر لی وہیں دوسرے اردو اخبارات کے قاری بھی بڑی تعداد میں راشٹریہ سہارا کے خریدار بن گئے۔لیکن دیہی علاقوں میں ابھی بھی اس کے قدم نہیں جم پاتے ہیں۔ اس کے بہار انچارج فی الحال عبدالواحد رحمانی ہیں۔موصوف سے قبل ڈاکٹر سید شہباز یہ ذمہ داری نبھا رہے تھے جو صحافت کا لمبا تجربہ رکھتے ہیں۔وہ ''انقلاب جدید'' کی ادارت نبھا چکے ہیں اور اس سے قبل قومی تنظیم سے بھی وابستہ کیا تھے۔''انقلاب'' کا پٹنہ ایڈیشن ۲۰۱۳ء سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ۱۶/صفحات پر مشتمل یہ اخبار اپنی دیدہ زیبی اور مواد کے اعتبار سے پٹنہ کے تمام اردو روزناموں میں سبقت رکھتا ہے۔لیکن اس کی پہنچ بھی ابھی بہار کے دیہی علاقوں تک نہیں ہوسکی ہے۔''انقلاب ،پٹنہ'' کے ایڈیشن انچارج احمد جاوید ہیں اور اس کے بیورو چیف مشہور اور کہنہ مشق صحافی جناب خورشید ہاشمی ہیں جو عرصۂ دراز تک قومی تنظیم، پٹنہ کی مجلس ادارت کے سینئر رکن رہ چکے ہیں۔ماضی اور حال کے اردو اخبارات کو دیکھیں تو زمین آسمان کا فرق نظر آنے لگے گا۔پہلے اردو اخبارات کتابت کے بعد لیتھو مشین کے ذریعے سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی سے چھپتے تھے۔زیادہ تر اخبارات زیادہ سے زیادہ ۴/صفحات کے ہوتے تھے۔خبروں کا وسیلہ ریڈیو کی خبریں ہوتی تھیں یا انگریزی اور ہندی کے اخبارات ہوا کرتے تھے جن سے بعض خبریں اردو میں ترجمہ کر کے ایک دن بعد اردو

اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔لیکن گذشتہ چند برسوں کے درمیان بہار کی اردو صحافت نے خبروں کی فراہمی، طباعت اور گیٹ اپ کے معاملے میں نمایاں ترقی کی ہے۔آج الکٹرانک انقلاب اور طباعت کی جدید ٹکنالوجی نے اخبارات کو رنگ اور ٹائپ دونوں اعتبار سے بڑا ہی دیدہ زیب بنا دیا ہے۔خبر رساں ایجنسی یو این آئی کی اردو نیوز سروس شروع ہونے کے ساتھ ساتھ فیکس، ای میل، فون اور خبر رسانی کی دوسری سہولتیں مہیا رہنے کے سبب تازہ بہ تازہ خبروں سے قارئین کو آشنا کرنا آسان ہوگیا ہے۔۱۲/اور ۱۶/صفحات کے رنگین اخبارات اور باتصویر آفسیٹ مشین پر چھپ کر نکل رہے ہیں۔کچھ اخبارات کے تو ایک سے زیادہ ایڈیشن چھپ رہے ہیں۔اردو اخبارات میں آئی یہ تبدیلیاں انکی بڑھتی آمدنی کے اصل ذرائع ہیں۔اگر یہ آمدنی نہ ہو تو صرف اخبار کی فروختگی سے کوئی اخبار زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ماضی میں تقریباً پچیس سال تک روزنامہ ''سنگم'' کو سرکاری اشتہارات نہیں ملا جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ خسارہ میں چلا۔جبکہ دیگر بے شمار اخبارات سرکاری اشتہارات نہ ملنے کے سبب بند ہوگئے۔اسی اشتہار کے بل پر فی الحال بہار بالخصوص پٹنہ سے تقریباً چار درجن اخبارات جن میں روزنامے بھی ہیں اور ہفت روزہ بھی، محدود تعداد میں سہی، چھپ رہے ہیں۔ان اخبارات اور ان کے مدیر کے نام حسب ذیل ہیں:

''امن چین'' (ایڈیٹر سید مشتاق) ''اندولن'' (ایڈیٹر محمد ارشاد) ''عظیم آباد میل'' (ایڈیٹر ستندر کمار سنگھ) ''ایک قوم'' (ایڈیٹر اے۔کے۔احسانی) ''جسارت بہار'' (محمد ارشاد) ''ہمارا سماج'' (ایڈیٹر محمد خالد انور) یہ اخبار پٹنہ کے علاوہ دہلی سے بھی نکل رہا ہے۔''پیاری اردو'' (ایڈیٹر اظہار احمد) ''قرا تنظیم'' (ایڈیٹر آزاد گاندھی) ''المومن'' (ایڈیٹر محمد عالمگیر) ''تفہیم'' (ایڈیٹر سید منور نظامی) ''مثلث'' (ایڈیٹر ستندر کمار سنگھ) ''نوید صبح'' (ایڈیٹر پرشورام سنگھ) ''عوامی تنظیم'' (ایڈیٹر مہیش کمار) ''تاثیر'' (ایڈیٹر ایم۔اے۔گوہر) ''دور جدید'' (ایڈیٹر طارق رضا) ''قومی رہبر'' (ایڈیٹر محمد عالم گیر) ''آپ کی منزل'' (ایڈیٹر محمد عرفان) ''آغاز وانجام'' (ایڈیٹر معظم حیدری) ''ہمارا نعرہ'' (ایڈیٹر انوارالہدیٰ) ''ہمارا نعرہ'' کے بانی مدیر الحاج شمس الہدیٰ استھانوی تھے۔انوارالہدیٰ ان کے صاحبزادے ہیں۔''عالمی درپن'' (ایڈیٹر ذاکر حسین)

''روشنی زندگی'' (ایڈیٹر عتیق الرحمٰن) ''گھر گھر کی آواز'' (ایڈیٹر محمد نوشاد) ''سہارا ایکسپریس'' (ایڈیٹر قمر عابدین) ''عکس بہار'' (ایڈیٹر کاشف احمد) ''آواز بہار'' (ایڈیٹر ضیاء الحق) ''دنیا کا عکس'' (ایڈیٹر کاشف احمد) ''اردو عکس'' (ایڈیٹر نوتن ورما) ''عزیز تنظیم'' (ونود شنکر) ''چشم ضمیر'' (ایڈیٹر کمار رندھیر شرما) ''پیغام ویشالی'' (ایڈیٹر ربندر کمار سنگھ) ''فرنٹ لائن'' (ایڈیٹر اصغری امام) ''حالات ائینہ'' (ایڈیٹر منجو کماری) ''ہمارا خیال'' (ایڈیٹر راجیش کمار) ''جدید عکس'' (ایڈیٹر خورشید عالم) ''جدید ہندوستان'' (ایڈیٹر نور السلام ندوی) ''جمہوری آواز'' (ایڈیٹر عزیز الحسن) ''مالتی ٹائمس'' (ایڈیٹر رگھوور لال داس) ''معاشرہ'' (ایڈیٹر ایم۔ اے۔ گوہر) ''سفینہ'' (ایڈیٹر جاوید حسن) ''سیاسی پیغام'' (ایڈیٹر سمیع احمد) یہ سبھی اخبارات پٹنہ سے نکلتے ہیں جبکہ بھاگلپور سے ''دیش بدیش'' (ایڈیٹر امیش لال) مظفر پور سے ''گرم ہوا'' (ایڈیٹر آلوک کمار سنہا) مظفر پور سے ''حقیقت ٹائمس'' (ایڈیٹر یسٰین رحمانی) اور سمستی پور سے زیادہ تر کہیں اسٹال پر نظر نہیں آتے ہیں۔ یہ اخبارات صرف پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ کو پیش کرنے کے مقصد سے نکالے جاتے ہیں۔

اردو اخبارات اور ان کے مدیران کے اس طول طویل تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان اخبارات کے صفحات کو رونق بخشنے والے ان کارکن صحافیوں کا ذکر یہاں نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی جو اپنا خون جگر صرف کرکے بہار کی اردو صحافت کا نام ملکی سطح پر روشن کئے ہوئے ہیں ان میں ''قومی تنظیم'' سے وابستہ صحافی جناب عبدالرافع، جناب رضوان دربھنگوی، جناب راشد احمد اور جناب امام الحسن قاسمی، ''پندار'' سے وابستہ جناب ریحان غنی اور جناب مسعود الرب، فاروقی تنظیم سے وابستہ جناب خورشید پرویز صدیقی، ابن یعقوب اور سراج انور، روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' سے وابستہ عبدالواحد رحمانی، ڈاکٹر سید شہباز، سید شباب انور، عاقل زیاد اور خالد عبادی اور ''انقلاب'' سے وابستہ جناب خورشید ہاشمی، جاوید اختر اور تسنیم کوثر اور فری لانہ صحافی جناب اشرف استھانوی وغیرہ۔ یہ وہ صحافی حضرات ہیں جن کی ادارت میں کوئی چھوٹا سے چھوٹا اخبار بھی نہیں نکل رہا ہے، پھر بھی یہ حضرات اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر بہار میں اردو صحافت کا جھنڈا بلند کئے ہوئے ہیں۔ ان قلندر صفت صحافیوں پر حفیظ میرٹھی کا یہ شعر صادق آتا ہے:

چاند کا کردار اپنایا ہے ہم نے دوستوں
چاند اپنے پاس رکھے روشنی بانٹا کیے

ادبی رسائل

آزادی کے بعد سے اب تک شائع ہونے تمام رسائل کا شمار تو یہاں ناممکن ہے لیکن چند اہم رسائل کا ذکر کرنا ناگریز بھی ہے۔ قدیم ادبی رسالوں میں ماہنامہ ''ندیم'' (ایڈیٹر انجم مانپوری) اپنی بہترین ادبی خدمات کے لئے مشہور رہا ہے۔ یہ رسالہ پہلے گیا سے نکلنا شروع ہوا، اور بعد میں پٹنہ منتقل ہوا اور بالآ کر بند ہوگیا۔ سہ ماہی ''معاصر'' پٹنہ (ایڈیٹر بیدل عظیم آبادی، عظیم الدین احمد، کلیم الدین احمد) نے تحقیق و تنقید کی دنیا میں ایک معیار قائم کیا اور ایک شاندار روایت بنائی۔ ماہنامہ ''تہذیب'' پٹنہ (عبدالقیوم انصاری)، سہیل عظیم آبادی) تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا عمدہ رسالہ تھا۔ ''سفینہ'' (ایڈیٹر عطا کاکوی) کلیم احمد نمبر ''فیض نمبر'' اور ''جوش و فراق'' نمبر نہایت عمدگی سے شائع کئے۔ یہ رسالہ کتابی سائز میں چھپتا تھا۔ ماہنامہ ''صبح نو'' (ایڈیٹر وفا ملک پوری) اور ماہنامہ ''صنم'' (ایڈیٹر وہاب اشرفی) پٹنہ سے نکلنے والے معیاری رسالوں میں شمار کئے گئے۔ ''صبح نو'' کے تعلق سے اہل الرائے کا یہ ماننا ہے کہ فی الحال اس معیار کا کوئی ادبی رسالہ سرزمین پٹنہ سے شائع نہیں ہورہا ہے۔ گیا سے شائع نہیں ہورہا ہے۔ گیا سے شائع ہونے والے ''سہیل''، ''کرن'' اور ''آہنگ'' جیسے ماہنامے زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے۔ ماہنامہ ''سہیل'' مسعود منظر ایڈوکیٹ کی ادارت میں عرصۂ دراز تک نکلتا رہا۔ اس رسالے نے بے شمار نمبر نکالے ہیں۔ یہ رسالہ ان دنوں جناب جمیل منظر کی ادارت میں کولکاتہ سے نکل رہا ہے۔ ماہنامہ ''مریخ'' پٹنہ حلقۂ ادب، بہار کا ترجمان تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ رسالہ برصغیر ہندوپاک میں اپنے ادبی موقف کے لئے مشہور رہا ہے۔ تقریباً ایک چوتھائی صدی تک شائع ہونے کے بعد ۲۰۰۴ء سے اس کی اشاعت بند ہے۔ جناب سہیل عظیم آبادی کی ادارت میں ''راوی''، ''تعمیر'' اور ''تہذیب'' پٹنہ سے شائع ہوئے اور اپنی شناخت قائم کی۔ خواتین کا رسالہ ''زیور'' (ایڈیٹر سلمٰی جاوید) اور بچوں کا ماہنامہ ''مسرت'' (ایڈیٹر ضیاء الرحمٰن غوثی) بھی کافی مقبول ہوئے اور اردو زبان و ادب کی بہترین

خدمات انجام دیں ہفت روزہ ''مسرت'' ان دنوں ضیاء الرحمٰن غوثی کی ادارت میں ہی دہلی سے شائع ہورہا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی ''مباحثہ'' نے خوب شہرت حاصل کی۔ یہ رسالہ کئی برسوں تک پابندی سے شائع ہوتا رہا اور ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ جن دیگر رسالوں نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور اردو زبان کی خدمت کی ان میں ماہنامہ ''اشارہ'' (ایڈیٹر قیوم خضر) ماہنامہ ''رفیق'' (ایڈیٹر محمود عالم) ''مطالعہ (ایڈیٹر ڈاکٹر ممتاز احمد) اور ماہنامہ ''شفق'' (ایڈیٹر مولانا صدرالدین شمسی) کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر اسلم جاوداں کی ادارت میں سہ ماہی ''ندائے پاسدار'' پٹنہ سے ۲۰۰۳ء میں جاری ہوا۔ اس کے صرف پانچ شمارے منظر عام پر آئے۔ آخری شمارہ ''شاہ مشتاق نمبر'' تھا جو ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ مختصر مدت میں ہی اس رسالے نے اپنی شناخت بنائی تھی۔ بہار سرکار کے محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ کا ترجمان ماہنامہ ''بہار'' اور پروفیسر جابر حسین کی ادارت میں ''ترجمان'' ''دستاویز'' اور ''خبر نامہ'' شائع ہوئے۔ کاؤنسل ''دستاویز'' اور کاؤنسل خبر نامہ'' چونکہ بہار کاؤنسل کا ترجمان ہے لہذا وہ ابھی بھی نکل رہا ہے۔

پٹنہ سے باہر اردو صحافت جن رسائل کے توسط سے زندہ رہی ان میں ''ابلاغ'' رانچی (ایڈیٹر پروفیسر احمد سجاد) ''ادراک'' مظفر پور (ایڈیٹر قمر اعظم ہاشمی) ''صدف'' مظفر پور (ایڈیٹر شاہد جمال پسر پروفیسر نازؔ قادری) ''الکوثر'' سہسرام (ایڈیٹر مولانا ملک الظفر سہسرامی، ڈاکٹر مظفر حسن عالی) ''جدید اسلوب'' سہسرام (ایڈیٹر شاہد جمیل، ڈاکٹر مظفر حسین عالی) ''اندیشہ'' سہ ماہی بھاگلپور (ایڈیٹر ارشد رضا) کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس رسالہ کا صرف ایک ہی شمارہ منظر عام پر آسکا۔ ابوحذیفہ عبدالمالک قاسمی کی ادارت میں ۱۹۹۷ء میں ایک سہ ماہی رسالہ ''طلوع فکر'' حاجی پور سے جاری ہوا۔ ڈھیر سارے اردو رسالوں کی طرح اس رسالہ کی عمر بھی بہت مختصر رہی۔ اس کے صرف دو شمارے ہی شائع ہوسکے۔ جناب ناوکؔ حمزہ پوری نے حمزہ پور، گیا سے ماہنامہ ''قوس'' جاری کیا اور جناب اظہر نیرؔ نے سہ ماہی ''شفق'' بوکارو سے نکالا۔ یہ سبھی رسالے مختصر مدت تک جاری رہ سکے۔

موجودہ مشہور رسائل

بہار اردو اکادمی کا ترجمان ماہنامہ ''زبان و ادب''، پٹنہ بہار سے نکلنے والے ادبی رسائل میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ بلا شبہ یہ ایک مکمل ادبی رسالہ ہے۔ پابندی وقت سے نکل رہا ہے اور ملکی سطح پر اپنی شناخت رکھتا ہے۔ ابھی اس کے ایڈیٹر جناب مشتاق احمد نوری ہیں۔ موصوف کی ادارت میں یہ رسالہ ترقی اور مقبولیت کی منزلیں طے کرتا جارہا ہے۔ سہ ماہی ''دیوان'' پٹنہ ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد کی ادارت میں پابندی سے نکلنے لگا ہے۔ یہ ایک عمدہ علمی، تحقیقی اور مذہبی جریدہ ہے۔ پھلوری شریف، پٹنہ سے سہ ماہی ''المجیب'' ڈاکٹر فتح اللہ قادری کی ادارت میں پابندی سے شائع ہورہا ہے۔ یہ بھی علمی، ادبی اور مذہبی رسالہ ہے۔ خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے ''خدا بخش لائبریری جنرل'' سہ ماہی نکل رہا ہے۔ یہ علمی اور تحقیقی رسالہ ہے۔ پٹنہ سے شائع ہونے والا ایک اہم ادبی رسالہ ''آمد'' ہے جس کے مدیر اعزازی جناب خورشید اکبر ہیں۔ ۲۰۱۱ء سے یہ سہ ماہی رسالہ پابندی سے شائع ہورہا ہے اور علمی و ادبی حلقے میں مقبول بھی ہے۔ ''تحقیقات ڈاکٹر اعجاز احمد کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس رسالے میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے تعلق سے علمی، ادبی اور تحقیقی مقالے کی شمولیت رہتی ہے۔ سہ ماہی ''بھاشا سنگم'' پٹنہ حکومت بہار کا لسانی، ادبی وثقافتی مجلّہ ہے جو محکمہ کابینہ سکریٹریٹ (اردو ڈائرکٹوریٹ) کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ فی الحال اس کے مدیر ڈاکٹر محمد شاہد جمیل خاں ہیں۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ ایک عمدہ اور معیاری رسالہ ہے۔ پٹنہ سے شائع ہونے والے مذکورہ ادبی رسائل کے علاوہ بہار کے دوسرے اضلاع اور شہر سے بھی چند قابل ذکر رسائل نکل رہے ہیں جن کی شناخت ملکی سطح پر ہے۔ ان میں ''گیا'' سے پروفیسر علیم اللہ حالی کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ''انتخاب'' اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ادارت میں بھاگل پور سے نکلنے والا رسالہ سہ ماہی ''کوہسار جنرل'' کے نام شامل ہیں۔ واضح ہو کہ ہرگانوی صاحب پہلے ہزاری باغ کے ''پگمل'' سے ''کوہسار'' نکالتے تھے، وہی رسالہ اب ''کوہسار جنرل'' ہے۔ اقبال حسن آزاد کی ادارت میں مونگیر سے سہ ماہی ''ثالث'' اور ''بتیا'' سے جناب رضوان ریاضی کی ادارت میں سہ ماہی ''رہنما'' نہایت عمدگی اور پابندی سے نکل رہا ہے

۔دربھنگہ سے ڈاکٹر مشتاق احمد کی ادارت میں نکلنے والا سہ ماہی ''جہان اردو'' ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں نکلنے والا سہ ماہی ''تمثیل نو'' اور ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں نکلنے والا سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' پابندی سے شائع ہورہا ہے۔دربھنگہ سے نکلنے والے یہ تینوں رسالے معیاری ہیں اور ملک بیرون ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ۔ دربھنگہ سے نکلنے والے پندرہ روزہ ''الہدیٰ'' کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ایک زمانہ میں ''الہدیٰ'' ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی کی ادارت میں نکلتا تھا۔اب اس کے ایڈیٹر جناب شکیل احمد سلفی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فی الحال پٹنہ سے باہر دربھنگہ ہی ایک ایسا شہر ہے جہاں رسائل اور اخبارات کے توسط سے اردو صحافت نہ صرف زندہ ہے بلکہ بہار کے تمام شہروں میں اسے فوقیت بھی حاصل ہے۔

''حسن منزل'' آشیانہ کالونی، روڈ نمبر ۶ حاجی پور ضلع ویشالی (بہار) 844101

☆☆☆

ڈاکٹر ریحان غنی

سول معاشرہ : اردو میڈیا کا کردار اور ذمہ داریاں

(بہار کے خصوصی حوالے سے)

اردو اب بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں اردو پڑھی ، بولی اور سمجھی نہ جاتی ہو۔اس لئے اردو میڈیا کو بھی بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو چکی ہے جو خوش آئند علامت ہے۔ میڈیا کو اردو میں ذرائع ابلاغ کہا جاتا ہے۔ذرائع اور ابلاغ دونوں عربی کے الفاظ ہیں۔جس کے لغوی معنی پہنچانے کے ذرائع ہیں۔چونکہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں عوام تک اطلاعات پہنچانے کا کام کرتے ہیں اس لئے یہ دونوں ذرائع ابلاغ کا حصہ ہیں۔میڈیا کی پہلے بھی اہمیت تھی جب الیکٹرانک میڈیا کا نام ونشان نہیں تھا۔اب تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ الیکٹرانک میڈیا کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی وجہ سے اس میں کافی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔اب دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پل بھر میں اطلاعات پہنچ جاتی ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ جس تیزی سے اتلاعات پہنچتی ہیں اس تیزی سے اس کا ردعمل بھی ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے مہذب عوامی معاشرے میں میڈیا کا کردار بھی اہم ہوگیا ہے اور اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ تلخ بات کہنی پڑ رہی ہے کہ اردو میڈیا اور زیادہ غیر ذمہ دار ہوتا جا رہا ہے۔میرا موضوع چونکہ اردو میڈیا ہے اس لئے میں اپنی باتیں اس پر مرکوز رکھنے کی کوشش کروں گا۔

اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، یہ کہنا غلط ہوگا لیکن یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ اردو اسلامی تہذیب و معاشرت کی زبان ہے، کیونکہ اردو کا بالواسطہ اور بلاواسطہ تعلق اسلام سے ہے۔اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ اردو میڈیا کو لازمی طور پر صرف اور صرف قرآن وحدیث سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے کیونکہ یہی دو کتابیں ہمارے نظام حیات کی اساس اور بنیاد ہیں اور بحیثیت مسلمان ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم اپنی ذاتی زندگی میں ہی نہیں بلکہ پیشہ ورانہ فرائض کی

ادائیگی میں بھی اللہ رب العزت کی رضا اور خوشنودی کو ملحوظ رکھیں۔ لیکن کیا اردو میڈیا اور اس سے وابستہ مسلم صحافیوں نے اس سے رہنمائی حاصل کی ہے یا رہنمائی حاصل کرتے ہیں؟ اس سوال پر غور کرنے سے قبل آیئے ہم اس کا جائزہ لیں کہ اسلام اس سلسلہ میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے (قرآن کی چند آیات کے ترجمے ملاحظہ فرمایئے):

۱۔ اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (البقرہ: ۲۰۰)

۲۔ دنیا میں وہ بہترین گروہ (امت) تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بری باتوں سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
(آل عمران: ۱۱۰)

۳۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری ذات یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ (النساء: ۱۳۵)

۴۔ اور اے محمدؐ میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ (بنی اسرائیل: ۵۳)

۵۔ اور جب بات کہو انصاف کی کہو۔ خواہ معاملہ اپنے رشتہ داروں ہی کا کیوں نہ ہو۔
(الانعام: ۱۵۲)

۶۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ (المائدہ: ۸)

۷۔ اور باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ (البقرہ: ۴۲)

۸۔ (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔ (الفرقان: ۷۲)

۹۔ اے نبی نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو۔ معروف کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ (الاعراف: ۱۹۹)

۱۰۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔ (البقرہ: ۲۶۳)

۱۱۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے پر پشیمان ہو۔
(الحجرات: ۶)

۱۲۔ اے نبی نیکی اور بدی یکساں نہیں ہے۔ تم بدی کو اس نیکی سے رفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ (حٰم سجدہ: ۳۴)

۱۳۔ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو ۸۰ کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔ (النور: ۴)

قرآن کریم میں اس طرح کی بے شمار آیات ہیں جو ہمارے لئے اور اردو میڈیا کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس سلسلے میں نبی کریمؐ چند ارشادات بھی ملاحظہ فرمائیں:

☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے اسے آگے بیان کردے۔ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہو۔

☆ جس نے کسی حاکم کو راضی کرنے کے لئے وہ بات کہی جو اس کے رب کو ناراض کردے تو وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

☆ سچی بات کہو اگرچہ کڑوی ہو۔

☆ جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ غصے میں آجاتا ہے اور اس کی وجہ سے عرش ہلنے لگتا ہے۔

☆ وہ شخص ہم سے نہیں جو عصبیت کی دعوت دے اور عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے۔

☆ جب غصہ آیا کرے تو خاموش ہو جایا کرو۔

☆ مومن نہ کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بددعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔

☆ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا ان سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو تباہ کن ہے۔

☆ سب سے افضل جہاد ظالم حکمراں کے سامنے انصاف کی بات کرنا ہے۔

اس طرح قرآن وحدیث میں بہت تفصیل سے ایسے اصول وضوابط بتائے گئے ہیں جو مہذب معاشرے کی تشکیل میں معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔لیکن اردو میڈیا نے اسے مشعل راہ نہیں بنایا۔ بیشتر اخبارات ورسائل اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جس ڈگر پر دوسرے چل رہے ہیں۔ ان کا کردار وہی ہے جو دوسروں کا ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریاں بھول گئے ہیں۔ اسلامی اصول وضوابط کا انہیں کوئی پاس ولحاظ نہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ اردو میڈیا صحت مند معاشرہ کی تشکیل کے لئے رائے عامہ ہموار کرنے کے بجائے اسی راستے پر چل رہا ہے جس پر چلنے سے منع کیا گیا۔یعنی استحصال مت کرو، ایمان وضمیر کا سودا نہ کرو، انصاف کی بات کرو، بدگمانی اور تجسس سے کام نہ لو، کسی کا مذاق نہ اڑاؤ، عریانی اور فحاشی سے پرہیز کرو، عصبیت کے شکار نہ ہو، خبروں کی صداقت کی تصدیق کرلو، سنسنی خیزی سے پرہیز کرو۔لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ اردو میڈیا جس کا تعلق قرآن کریم میں دی گئی بشارت کے مطابق بہترین امت یعنی مسلمان سے ہے وہ بہت ہی غیر ذمہ دار ہے۔سنسنی خیزی اس کی سرشت میں داخل ہوگئی ہے استحصال اس کے یہاں نہ عیب ہے اور نہ جرم، ایمان وضمیر کا سودا بہت آسانی سے کرلیا جاتا ہے۔تجسّس اور بدگمانی اس کا شیوہ بن گئی ہے۔عریانی اور فحاشی بھی اس کے یہاں در آئی ہے۔خبروں کی صداقت کی تصدیق کا اس کے یہاں کوئی وسیلہ نہیں۔یہ باتیں میں بہت وسیع تناظر میں نہیں بلکہ بہار میں اردو اخبارات ورسائل کا خصوصی اور بہار کے باہر شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کا عمومی جائزہ لینے کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔ ہوسکتا ہے اس طرح کی صورت حال سے اردو میڈیا بیرون ممالک میں دوچار نہ ہو۔ میں نے اس کا بغور جائزہ نہیں لیا۔ بہار میں اردو میڈیا کی بہت ہی قابل رحم حالت ہے۔ یہاں اردو میڈیا سے میری مراد اخبارات ورسائل ہیں جہاں کے ملازمین بدترین استحصال کے شکار ہیں۔ میرا موضوع چونکہ یہ نہیں

ہے اس لئے میں اس کی تفصیل پیش کرنے سے گریز کرتا ہوں ورنہ مجھ پر موضوع سے بھٹک جانے کا الزام لگ جائے گا، لیکن اپنے ۲۵ سالہ صحافتی تجربے کی بنیاد پر میں صرف اتنی ہی بات عرض کروں گا کہ بہار میں اردو میڈیا (یعنی اخبارات) کے دفاتر میں جنگل کا قانون نافذ ہے۔اردو کے معتبر صحافی میری ان باتوں کی تصدیق کریں گے۔ میں بہار کے تناظر میں یہ بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں اردو صحافت نے ایک نئی روایت قائم کی ہے۔یعنی اردو اخبارات کے مالکان ایڈیٹر بھی ہوتے ہیں، خواہ وہ صحافت کی ''الف''، ''ب'' سے بھی واقف نہ ہوں۔لیکن اس روایت کو پہلے ''انقلاب جدید'' نے توڑا اور پھر ''پندار'' نے۔ یہ دونوں پٹنہ کے دو ایسے روزنامے ہیں جس کے مالکان نے ورکنگ جرنلسٹ یعنی کارکن صحافیوں کو ایڈیٹر بنایا ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے۔

ایک محاورہ ہے ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے''۔لیکن میں لنکا نہیں ڈھاؤں گا لیکن اپنے موضوع اور بہار کے حوالے سے اتنا عرض کروں گا کہ اردو میڈیا یہاں کسمپرسی کا شکار ہے۔ ایسی صورت میں اس سے یہ توقع کرنا کہ یہ مہذب معاشرے کی تشکیل میں اہم رول اور اپنی ذمہ داریاں ادا کرے گا۔ بے وقوفوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔اردو میڈیا یعنی اردو اخبارات اپنے مالی فائدے کے لئے عوام کو کس طرح بے وقوف بناتے ہیں اور قرآن وحدیث میں بتائے ہوئے رہنما اصول کی کس طرح خلاف ورزی کرتے ہیں اس کی ایک مثال پیش کرکے میں اپنی بات ختم کروں گا۔ ابھی حال ہی میں اسمبلی انتخابات ہوئے ہیں ان دونوں انتخابات کے دوران اردو اخبارات سنگھ پریوار، بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی قیادت والے قومی جمہوری اتحاد (این ڈی اے) کے خلاف خبریں، اداریے اور مضامین شائع کرتے رہے۔انہیں مسلمانوں کا قاتل اور اسلام دشمن قرار دیتے رہے اور دوسری طرف ان پارٹیوں کی حمایت میں بڑے بڑے اشتہارات بھی شائع کرتے رہے۔یعنی اردو اخبارات میں ایک طرف قومی جمہوری اتحاد (این ڈی اے) کے اقتدار میں اقلیتوں کی فلاح بہبود کے لئے کئے گئے کاموں کی تفصیلات بھی شائع ہوتی رہیں اور دوسری طرف ان کی مسلم اور اسلام دشمنی کے تعلق سے مضامین چھاپے جاتے رہے اور اداریے بھی لکھے جاتے رہے۔ یہ دوہری پالیسی اور دہرا معیار کیوں؟ اگر اردو میڈیا واقعی ایماندار اور مخلص اور اقلیت

نواز ہے تو اسے ایسی پارٹیوں کے اشتہارات کو قبول نہیں کرنا چاہئے جن پارٹیوں کو وہ مسلم دشمن اور اسلام مخالف سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ جرات اردو اخبارات میں نہیں ہے کیونکہ ان کا مشن اور نصب العین عوام کو صحیح پیغام دینا اور بہتر معاشرے کی تعمیر نہیں، کچھ اور ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں مجھے یہ بھی کہنے دیجئے کہ اردو میڈیا مالکان کی جھولیاں بھرنے کا ذریعہ بن گیا ہے اور اس کا رول خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ذمہ داریاں صحیح طریقے سے نہیں نبھا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے اثر اور بے وقار ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسی صورت میں اردو میڈیا سے معاشرے میں کسی انقلابی تبدیلی کی امید لا حاصل ہے۔ دوسری طرف اردو میڈیا سے معاشرے کو یہ بھی احساس نہیں ہے کہ وہ اپنے قارئین کو جو چیزیں دے رہا ہے وہ کیسی ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ سے جیسی اور جس شکل میں بھی اسے خبریں اور فیچر ملتے ہیں وہ اسے اسی شکل میں سائع کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مغربی ذرائع ابلاغ نے راسخ العقیدو مسلمانوں اور مذہبی جماعتوں کے لئے ایک اصطلاح Fundamentalist وضع کی ہے جس کا ترجمہ اردو والوں نے ''بنیاد پرست'' کیا ہے۔ اس اصطلاح کا خوب خوب استعمال ہو رہا ہے۔ اگر اردو والے اس پر سنجیدگی سے غور کرتے تو انہیں اس کا احساس ہو جاتا کہ یہ اصطلاح بالکل غلط ہے اور وہ اسے استعمال نہیں کرتے کیونکہ اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان صرف خدائے واحد کی پرستش کرتا ہے، کسی دوسرے کی نہیں اس لئے نہ تو وہ بنیاد پرست ہو سکتا ہے اور نہ فرقہ پرست لیکن اسے کھلے عام Fundamentalist کہا جانے لگا اور ہم بھی راسخ العقیدہ مسلمانوں کو بنیاد پرست لکھتے رہے۔ اس پس منظر میں مجھے کہنے دیجئے کہ اردو میڈیا مایوس کن صورت حال سے دو چار ہے اور اس کی کوئی منزل نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کے مالکان کی جھولیاں بھر رہی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شمیم قاسمی

بہار میں اردو صحافت کے خد و خال

سماجی ترقی اور ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل میں صحافت کا کردار ایک قد آور روشن مینار جیسا ہے۔ معاشرتی بُرائیوں اور ملک کے سیاسی بازیگروں کی پشت پناہی میں شر پسند عناصر کے گورکھ دھندوں کو بے نقاب کرنا صحافت کا ایک اہم فریضہ رہا ہے۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ خدمت خلق کا جذبہ نہ ہو تو پھر صحافت اور اس سے منسلک افراد اپنا نصب العین اور منصبی تشخص کھو دیتے ہیں۔

اُردو صحافت کا اپنا ایک شاندار ماضی رہا ہے۔ ہمارے عہد میں اُردو صحافت تقریباً دو صدی کو محیط تجربوں بھرا سفر مکمل کرنے جا رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ صحافت جمہوری نظام کا ایک اہم ستون ہے اور جب اس ستون میں ارتعاش اور ایک بے نام سے اضطراب کی لہر دوڑتی ہے تو قلم بول اٹھتا ہے:

قومیت ،فرقہ پرستی اور نسلِ امتیاز
پیکر انسانیت پر اک طرح کا ہیں عذاب
قلعۂ پندار کو مسمار کردو، توڑ دو!
چاک کر کے پھینک دو یہ مادّیت کا حجاب

(سیماب اکبرآبادی)

ہمارے ملک میں الیکٹرونک میڈیا ہو کہ پرنٹ میڈیا ان سب پر مغربی کلچر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کی آزادی میں صحافت بطور خاص اُردو صحافت کا اہم رول رہا ہے۔ ایک امریکی صحافی اور دانشور، لارنس آر کیمپ بیل نے صحافت کی جامع تعریف اپنے لفظوں میں کچھ یوں بیان کی ہے۔'' صحافت جدید وسائل ابلاغ کے ذریعہ عوامی معلومات ،رائے عامہ اور عوامی

تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے۔'' بہر حال آج اُردو صحافت نے ۲۰۰ سال کا ایک طویل اور صعوبتوں بھرا اندھیرے اجالے کی آنکھ مچولیوں کے درمیان ہانپتا کانپتا ہوا سفر طے کرلیا ہے۔ حالات کے تھپیڑے کھاتی، سائبر کلچر کے عہد میں عصری زندگی کے مختلف چیلنجز قبول کرتی ہماری اردو صحافت اکیسویں صدی میں ایک نئے حوصلے، نئے عزائم کے ساتھ معاصر اخبارات سے ہم آہنگ ہوکر مقبول خواص وعوام ہو رہی ہے۔ اردو سے بے پناہ محبت کرنے والوں کا ایک بڑا حلقہ اردو صحافت کی ہری بھری شاخوں اور جڑوں میں بوند بوند پانی کا چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ اردو زبان اور اُردو صحافت کا مستقبل یقیناً تشفی بخش اور روشن ہے۔ کسی نامعلوم شاعر کا یہ شعر موجودہ اُردو آبادی کے دلوں کی ترجمانی کرتا ہوا محسوس ہو رہا ہے:

ابھی تہذیب کا نوحہ نہ لکھنا
ابھی کچھ لوگ اردو بولتے ہیں

پیش نظر موضوعی سچائی پر کھل کر لکھنا ابھی شاید آسان نہیں۔ بہر حال ملک کی آزادی کے بعد اردو کی صحافتی سرگرمیوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ زبان واسلوب اور روایتی ہیئت میں بھی نمایاں تبدیلیوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اب تو ہماری صحافت پاؤں سے سر تک الیکٹرونک میڈیا کے چنگل میں ہے۔ چہار جانب انٹرنیٹ اور سائبر کلچر کا بول بالا ہے۔ ہمیں خیالات کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے:

اُس نے آزادیٔ اظہار تو دی ہے مجھ کو
اور خنجر مری گردن سے لگا رکھا ہے

یوں تو ملک کی تقریباً تمام بڑی زبانوں نے صحافت کے میدان میں نمایاں رول ادا کیا ہے لیکن آج ہمیں اس کا اعتراف کرنا ہوگا کہ ایک باوقار جمہوری معاشرہ کا تصور لئے قومی یکجہتی اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی میں اُردو صحافت کی بے لوث خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لفظ'' انقلاب زندہ باد'' دراصل اُردو صحافت کی دین ہے۔'' سرفروشی کی تمنّا'' کو عوام کی آواز اور لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنانے میں اُردو صحافت کا بڑا عمل دخل ہے۔

اُردو صحافت کے آغاز وارتقا کی روایتی تاریخ اور مطبوعہ اخبارات کے مشن، اس کے متن و معنی پر ہر زمانے میں تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی رہی ہے ـــــ دوہرائی گئی باتوں کو مزید دوہرانہ یہاں غیر ضروری سا لگتا ہے.........طوالت کے خیال سے بھی میں اپنی تحریر کو سمیٹتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں۔ یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ اردو صحافت کا باضابطہ آغاز'' جام جہاں نما'' سے ہوا، 27 مارچ 1822ء کو اس کا پہلا شمارہ کلکتہ (مغربی بنگال) سے شائع ہوا۔ بہار کی سرزمین سے اُردو کا پہلا اخبار'' نورالانوار'' ہے۔ بہار کے ضلع شاہ آباد (آرہ) کو اس کا فخر حاصل ہے اس کی اشاعت 1853ء میں ہوئی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ بہار میں اُردو صحافت کی تاریخ تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے۔ اس درمیان لاتعداد اردو اخبارات اور جرائد نکلے اور گردش زمانہ کا شکار ہوتے چلے گئے۔ ماضی میں بہار کے کئی شہروں سے اُردو اخبارات کی اشاعت کا کام بڑے جوش وولولے سے انجام پاتا رہا ہے۔ ان شہروں میں گیا، آرہ، سہسرام، سارن، مونگیر، مظفر پور، سیوان اور دربھنگہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن عظیم آباد پٹنہ کو اُردو صحافت کے فروغ میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ ''عظیم الاخبار'' پٹنہ سنہ اشاعت 1867 اور انڈین کرانیکل'' سہ روزہ اخبار کو بہار کی صحافت میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

بہار کی اُردو صحافت میں ''ندیم'' گیا کی بھی صحافتی اور ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دراصل ندیم ایک ادبی جریدہ تھا جو 1931 میں شائع ہوا اور تقریباً چودہ برسوں تک اُردو کی ادبی صحافت میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس کے مدیر کرایہ کی ٹم ٹم والے انجم مانپوری تھے۔ ندیم کے خصوصی بہار نمبر سے ہمارے ریسرچ اسکالر اور نئی ادبی پود استفادہ کرتی رہی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ندیم گیا سے بہار میں بطور خاص ادبی صحافت کا آغاز ہوا۔ زبان وبیان کی سطح پر اخباری صحافت اور ادبی صحافت کے تال میل سے فکری اظہارات کے نئے دروا ہوئے اور طباعت سازی کی نئی تکنیک بازار میں متعارف ہوئی تو بہار میں اُردو صحافت کا ایک نیا چراغ روشن ہوا۔ اسی چراغ کی روشنی میں بہار میں اُردو صحافت کا ہم اگلا پڑاؤ طے کرسکتے ہیں۔

اردو کی ادبی صحافت کی نمائندگی میں قیوم خضر کے' اشارہ' پٹنہ، سہیل عظیم آبادی کے

'تہذیب' پٹنہ، وہاب اشرفی اور محمد رفیع الدین کے 'صنم' پٹنہ، 'صبح نو' جس کے مدیر وفا ملک پوری کی ادبی وصحافتی خدمات کون فراموش کرسکتا ہے؟ —— بعد میں پروفیسر علیم اللہ حالی کی سرپرستی میں 'صبح نو' کی اشاعت جاری رہی۔ معروف شاعر ظہیر انور بھی اس کی ادارتی ذمہ داریوں سے وابستہ رہے۔ ان دنوں علیم اللہ حالی ادبی میگزین 'انتخاب' پٹنہ سے نکال رہے ہیں۔ حلقۂ ادب بہار کے نمائندہ رسالہ 'مریخ'، عبدالمغنی/فخر الدین عارفی کے علاوہ پٹنہ سے وہاب اشرفی کے 'مباحثہ' نے بھی بہار کی ادبی صحافت کو ایک نیا موڑ دیا۔ حالیہ برسوں میں انور شمیم کے 'کسوٹی جدید' سیمانچل کی دھرتی کا واحد ادبی جریدہ 'ابجد' (مدیر: رضی احمد تنہا)، خورشید اکبر کے 'آمد' (سہ ماہی) اور بہار اردو اکادمی کے آرگن 'زبان وادب' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اکیڈمی کے موجودہ سکریٹری مشتاق احمد نوری ہیں ان کی ادارت میں زبان وادب نے ادبی صحافت کا ایک نیا در کھولا ہے۔ ہر چند کہ نوری اردو فکشن نگار ہیں۔ لیکن ان کی مدیرانہ صلاحیت بھی کچھ کم نہیں۔ شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی کے ادبی وتحقیقی آرگن بعنوان ''اردو جرنل'' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بانی اور مدیر اعلیٰ پروفیسر اعجاز علی ارشد رہے ہیں جو ان دنوں مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونی ورسٹی کے شیخ الجامعہ ہیں۔ ''اردو جرنل کے موجودہ مدیر معروف ناقد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور مدیر اعلیٰ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر جاوید حیات ہیں۔ ہاں یاد آیا کہ نئی نسل کے نمائندہ اور بے باک ناقد ڈاکٹر صفدر امام قادری نے بھی سہ ماہی 'صدف' نکال کر اپنی ادبی صحافت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ ابھی چند روز قبل اس کا پہلا شمارہ بازار میں آیا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے کچھ اور ادبی رسائل/ جرائد ایسے ہوں جو فی الحال میرے حافظے کے جنگل میں روپوش ہوگئے ہیں۔ اس لئے معذرت کا طلب گار ہوں۔

گیا شہر کے ماہنامہ 'سہیل' کی بھی طویل ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان دنوں سہیل کلکتہ سے شائع ہورہا ہے۔ کلام حیدری نے ایک زمانہ میں ہفتہ وار مورچہ نکالا اور ایک ادبی ماہنامہ آہنگ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جس کی ادبی حلقے میں کافی دھوم رہی۔ کلام حیدری کا نام بھی ایک ادبی صحافی کے طور پر ہماری اردو صحافت کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ معین شاہد کے آدرش اور سید احمد قادری کے بودھ دھرتی نے بھی بہار کی اُردو صحافت میں اپنی پہچان بنائی۔ دربھنگہ سے قومی

تنظیم کے نمائندہ صحافی اور تازہ کار شاعر منصور خوشتر نے دربھنگہ ٹائمس نکال کر اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ بھاگلپور کے کوہسار (مناظر عاشق ہرگانوی) اور دربھنگہ کے سہ ماہی تمثیل نو کے ڈاکٹر امام اعظم اور مشتاق احمد کے جہانِ اردو کی نمایاں صحافتی سرگرمیوں کو نہ سراہنا ادبی کوتاہ نظری ہوگی۔ مشتاق احمد دربھنگہ کے مارواڑی کالج کے پرنسپل ہیں۔ درس وتدریس ان کا پیشہ ضرور ہے لیکن اُردو صحافت میں بھی بحیثیت ایک صحافی ان کا مخصوص مقام ہے۔ حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے۔

پٹنہ شہر سے نکلنے والے معروف اخبارات کے درمیان روزنامہ ''اتحاد'' کی حیثیت سنگ میل جیسی ہے۔ یہ 1912 میں پھلواری شریف سے جاری کیا گیا تھا۔ 1935ء میں شیر شاہ کی نگری سہسرام کے سپوت سلطان احمد جو اپنے زمانے کے قدآور صحافی اور صاحب طرز قلم کار تھے، اس کے مدیر بنائے گئے۔ لیکن ان کی پہچان اس زمانے کے مشہور نیشنلسٹ صحافی کے طور پر زیادہ رہی۔ سچ ہے کہ سلطان احمد کی ادارت میں اتحاد کافی نکھرا اور عوام کی آواز بن گیا۔ یہ اخبار 1951ء تک جاری رہا اور کہتے ہیں کہ انہیں کی گود میں اس نے دم توڑا۔ اتحاد اخبار کے حوالے سے پروفیسر عبدالمغنی کی یہ تحریر نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ''جب اتحاد پٹنہ کا واحد اردو اخبار تھا۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ''اتحاد'' اپنے وقت کا ایک تاریخی ادارہ تھا اور اس اعتبار سے اسے بہار کی موجودہ صحافت کی ماں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔''

بہار میں اپنے زمانے کے مقبول ومعروف اخبارات میں صدائے عام (سنہ اشاعت: 1942ء، بانی مدیر سید نظیر حیدر۔ بعد کے دنوں میں رضی حیدر) کی نمایاں صحافتی خدمات کو بھولا نہیں جاسکتا۔ تحریک آزادی کے وقت صدائے عام نے وقتی طور پر مسلم لیگ کی حمایت ضرور کی لیکن یہ مسلم لیگ کا ترجمان نہیں رہا۔ یہ اخبار ملک کے مفادات، اقلیتی مسائل اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا۔ نامور اور بزرگ صحافی مرحوم محمد مرغوب برسوں اس کی ادارت سے وابستہ رہے اور صدائے عام میں ان کے لکھے ہوئے فکر انگیز اداریے قارئین اردو کے لئے اہمیت کا حامل رہے ہیں۔ روزنامہ ساتھی جسے ہندو پاک کے ترقی پسند افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی اور اپنے زمانے کے فعال سیاستداں اور اردو دوست عبدالقیوم انصاری کے عملی تعاون سے 1949ء میں شائع ہوا تھا

لیکن بعد کے دنوں میں مشہور سماجی و سیاسی شخصیت نور محمد نے اسے خرید کر بہار کی اُردو صحافت کو ایک نیا زاویۂ نظر دیا۔ ریاست بہار کے سابق وزیر اور ہر دلعزیز سیاسی رہنما ڈاکٹر خالد رشید صبا کی تحویل میں آنے کے بعد ساتھی کے قارئین کا حلقہ بھی کافی بڑھا۔ اخبار ساتھی کے کئی خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے اس کے سالنامہ اور جمہوریت نمبر اردو صحافت کی دنیا میں نہ صرف تاریخی حیثیت کے حامل ہیں بلکہ اردو صحافت سے وابستہ افراد کے لئے قابل تقلید بھی۔ ڈاکٹر خالد رشید صبا ایک سلجھے ہوئے روشن خیال صحافی اور سیاست داں ہیں۔ شعر و ادب سے بھی گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ میں ساتھی کا دفتر خالد رشید صبا کی موجودگی میں شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اور رحمانیہ ہوٹل جیسی چہل پہل اور رونق ہوا کرتی تھی۔

اپنے زمانے کے شعلہ بیان مقرر اور بے باک صحافی غلام سرور کے روزنامہ 'سنگم' پٹنہ کو کون نہیں جانتا۔ پہلے سنگم ہفتہ روزہ رہا اور پھر ۱۹۶۲ء سے روزنامہ ہو کر مقبول عام ہوا۔ کسی زمانے میں پروفیسر عبدالمغنی بھی نے اس کے اداریے لکھے تھے۔ اس اخبار کے پلیٹ فارم سے غلام سرور نے حق گوئی اور بیبا کی کا نہ صرف درس دیا بلکہ بہار کے تازہ اذہان کو اپنی باغیانہ تحریروں سے بے حد متاثر کیا۔ ماضی میں سنگم کی پہچان ایک باغی اور ہر دلعزیز اردو اخبار کے طور پر ہوتی رہی ہے۔ غلام سرور کی عملی سیاسی سرگرمیوں نے ان کی عہد ساز صحافیانہ شخصیت کو قدرے متاثر کیا۔ غالب کی طرفداری نے بھی کچھ گل کھلائے۔ بہر حال سنگم غلام سرور کے ہنگامہ خیز تبصروں کی وجہ سے بھی برسوں عوام کے دلوں پر راج کرتا رہا۔ ان دنوں اس کے مدیر پٹنہ کے مشہور سرجن، راجیہ سبھا کے سابق رکن ڈاکٹر اعجاز علی ہیں جو بہار کے پسماندہ مسلمانوں کے حقوق اور مسائل پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ بہر حال اردو صحافت کو روزنامہ سنگم نے ہر زمانے میں ایک نیا زاویۂ نظر دیا۔ یہاں پر روزنامہ 'قومی تنظیم' کا ذکر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ 1959 میں دربھنگہ کے سید محمد عمر فرید نے اس کی شروعات کی۔ اُس زمانے میں وہ اس کے ایڈیٹر و مالک ہوا کرتے تھے۔ پھر 1965 میں پٹنہ سے ہفتہ روزہ کے طور پر جاری ہوا۔ لیکن 1975 سے روزنامے کی شکل میں پٹنہ سے ہی جاری و ساری ہے۔ یہ بہار کی اردو آبادی میں حد درجہ مقبول ہے۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر ایس۔ ایم۔ اشرف فرید ہیں۔ افسوس کہ اجمل فرید اس دنیا میں

نہیں رہے جو قومی تنظیم کی انتظامیہ میں اہم رول ادا کرتے تھے۔ خاندانِ عمر فرید کے روشن چراغ کو اسی سال سپرد خاک کیا گیا ان کی کمی کا احساس نہ صرف قومی تنظیم کے قارئین کو ہوتا ہے بلکہ قومی تنظیم سے وابستہ ملازمین بھی ان کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتے ہیں۔ بہار کے قدآور صحافی مرحوم عبدالرافع بھی قومی تنظیم سے برسوں وابستہ رہ کر اپنی بالیدہ صحافتی صلاحیت کا بڑی کشادہ فکری سے مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ معمر صحافی رضوان دربھنگوی اور نئی نسل کے تازہ کار صحافی راشد احمد نے بطور اردو صحافی اسی اخبار سے اپنی پہچان بنائی۔ اجمل فرید صاحب کی ہر دلعزیز شخصیت سے ہر شخص متاثر تھا۔ خدمت خلق کا بے لوث جذبہ رکھنے والے مرحوم اجمل فرید کی انتظامی اور صحافتی صلاحیت پر ابھی حال میں ہی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسے قومی تنظیم کے نمائندہ اور دربھنگہ کے چیف بیورو ڈاکٹر منصور خوشتر نے ترتیب دیا ہے (سید اجمل فرید : یادیں باتیں) جس میں شائع معتبر صحافی اور دانشورانِ ادب کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہار کی اردو صحافت میں ان کی ناگہانی موت سے ایک خلاء سا پیدا ہو گیا ہے۔ سچ ہے کہ:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سماجی حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والے بے باک صحافی شمس الہدیٰ استھانوی کے ''ہمارا نعرہ'' کی یاد اب بھی تازہ ہے اور ریاض عظیم آبادی کے ہفتہ وار ''مسائل'' کو کون بھول سکتا ہے۔ ریاض عظیم آبادی ان دنوں پندرہ روزہ سیکولر محاذ نکال رہے ہیں۔ ان کی پوری صحافتی زندگی خاردار تجربوں سے بھری پڑی ہے۔

بہار کی اردو صحافت میں رضوان احمد کا نام بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ان کی صحافتی اور علمی لیاقت کا سبھی نے لوہا مانا ہے۔ ان کا اخبار 'عظیم آباد اکسپریس' پٹنہ، برسوں بہار کی اردو صحافت کی دنیا میں دھوم مچاتا رہا ہے۔ اس کے معنی خیز اداریے کے چوکھٹے میں رضوان احمد کا اشہب قلم تیزی سے دوڑتا نظر آتا ہے۔ رضوان دراصل ایک بے حد بولڈ صحافی کے طور پر پہچانے جاتے رہے ہیں۔ شروع میں تو عظیم آباد اکسپریس ہفتہ وار رہا۔ سنہ اشاعت 1974 ہے۔ لیکن 1980 سے روزنامے کی شکل میں بازار کی زینت بنا۔ عظیم آباد اکسپریس کا اجراء کرتے ہوئے اردو کے مایہ ناز

ناقد کلیم الدین احمد نے یہ اعتراف کیا تھا کہ ''میں ایسے جلسوں میں نہیں جاتا مگر رضوان صاحب سچ بولنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے اس جلسے میں چلا آیا ہوں۔'' آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سچ بولنا کوئی آسان نہیں۔لیکن رضوان احمد تھے کہ جب تک اس روئے زمین پر رہے سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں بولا اور نہ لکھا۔عظیم آباد میں شائع شدہ ان کے اداریوں کا مجموعہ بعنوان مجھے بولنے دو 1982 میں شائع ہوا جو بہار کی اردو صحافت کی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ بہار کے روزناموں میں عظیم آباد ایکسپریس نے رضوان احمد کی خرد افروز صحافتی صلاحیت اور بے لاگ اظہاری جرأت کے سبب اردو کے بے شمار اخبارات کے درمیان اپنا منفرد شناخت نامہ مرتب کیا۔افسوس کہ رضوان احمد اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کے قلم کی سیاہی آج بھی سفید کاغذ کو نم کر رہی ہے۔رضوان کو بہار کی اردو صحافت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ابھی چند ماہ قبل نئی نسل کے ممتاز صحافی اشرف استھانوی نے اردو اکادمی کے سیمینار ہال میں ایک جلسے کا انعقاد کیا تھا۔اس موقع پر انہیں بہار کے چند اہم صحافیوں نے بھی خراج عقیدت پیش کیا۔رضوان کی صحافتی زندگی پر اشرف استھانوی نے ایک کتاب بھی قلم بند کی جس کا عنوان ہے ''مجھے بولنے دو سے ــــ مجھے چپ رہنے دو تک رضوان احمد'' اور مناظر عاشق ہرگانوی کی بھی اسی موقع پر ایک کتاب کا اجرا ہوا جس میں رضوان کی صحافتی زندگی ان کی نجی زندگی کے شب و روز میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات اور ان کی افسانوی کائنات پر بھرپور فوکس ڈالا گیا۔اس موقع پر مشہور سیاست داں اور اردو دوست شمائل نبی کے روزنامہ 'راہ رو' کی یاد آرہی ہے جو کاشانہ کوٹھی بھنور پوکھر کے کیمپس سے نکلتا تھا۔ایک زمانے میں شمائل صاحب کا یہاں دفتر ہوا کرتا تھا۔راہ رو میں خبروں کے علاوہ اردو شعر و ادب سے وابستہ تحریروں کو بھی خصوصیت سے شائع کیا جاتا تھا۔عظیم آباد میں اردو کی نئی نسل کو آگے بڑھانے میں شمائل نبی پیش پیش رہا کرتے تھے۔چنانچہ اردو شعر و ادب اور بطور خاص نئی نسل کی بھرپور نمائندگی کیلئے بیسویں صدی کے ساتویں دہائی میں ''بہار اردو رائٹرس فورم'' کے نام سے ایک ادبی و ثقافتی ادارہ بھی قائم کیا تھا۔موصوف اس کے صدر تھے خاکسار یعنی شمیم قاسمی کو فورم کا جنرل سکریٹری ہونے اعزاز حاصل ہے۔بہار اردو رائٹرس فورم نے

برسوں شعر و ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی طور پر بھی قلم کاروں کو بیدار کیا۔اردو کے ادباء و شعراء اور صحافیوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر عظیم آباد کے ادبی جمود کو توڑنے میں بھی اس ادارے نے اہم رول ادا کیا ہے جس کا یہاں اعتراف نہ کرنا میرے خیال سے ادبی وصحافتی طور پر بدنیتی ہوگی۔یہاں پر امروز ہند کی بھی یاد آرہی ہے جو غالباً شاہد رام نگری کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔یہ 1977 کا زمانہ تھا۔لیکن پھر اس کی اشاعت پھلواری کوٹھی سے ہونے لگی۔غالباً 1992 میں یہ روزنامہ جاوید محمود کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ان دنوں اسے آن لائن دیکھا جا سکتا ہے۔

اردو صحافت کی دنیا کے بہار سے موجودہ شائع ہونے والے اردو روزناموں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن جو اخبارات بہار کی اردو آبادی کے درمیان دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں ان میں روزنامہ 'پندار' کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔اس کا حلقہ بھی وسیع ہے۔میرے پیش نظر پندار (ہفت روزہ) کا شمارہ نمبر ۲۳ جلد نمبر ۵ سنہ اشاعت ۳؍جون ۱۹۷۸ء ہے جس کے مطالعہ سے قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۴ء سے ہی اس کی اشاعت جاری ہے جس کا پرنٹر پبلیشر ولی محمد، مدیر میں محمد طاہر علی اور مدیر اعزازی میں ظہیر انور کا نام ہے۔یہ وہی ظہیر انور ہیں جو ۱۹۷۴ء سے عظیم آباد کی اردو سرگرمیوں اور ادبی نشستوں میں ۱۹۷۸ء تک چھائے رہے۔پروفیسر عبدالمغنی کے بھروسہ مند لوگوں میں تھے۔انجمن ترقی اردو بہار کے آفس سکریٹری کے طور پر بھی کافی فعال رہے۔۱۹۷۸ء میں ہی بمبئی کے اخبار عالم کو جوائن کر لیا۔اس طرح اردو ادب و صحافت کے پلیٹ فارم سے اپنی بے باک قلم کا مظاہرہ کرتے رہے۔اردو کی روٹی یا حلال رزق کوئی آسان نہیں۔قدم قدم پر مشکلات سے دوچار ہوتے رہے۔گاہے بہ گاہے فلمی نغمے بھی لکھتے رہے۔یوں ان کی زندگی صحافت کی دنیا میں ایک جہد مسلسل سے عبارت ہے۔بہرحال پندار 1974 سے 1988 تک ہفتہ روزہ کی شکل میں اردو بازار کی زینت بنتا رہا۔1988 کے آس پاس ہی یہ روزنامہ ہو گیا ان دنوں یہ ملٹی کلر میں چھپنے لگا ہے۔ملکی اور بین الاقوامی خبروں پر بھی اس کی گہری نظر ہے۔بہار کی سیاسی اتھل پتھل اور اقلیتی مسائل کے بے باکانہ اظہار میں یہ دوسروں سے پیچھے نہیں۔اس کے موجودہ مدیر اے۔کے۔ احسانی صاحب ہیں جبکہ مالک جہاں آرا صاحبہ ہیں۔لیکن اس کی ادارت سے جڑے بہار کے معتبر

اردو صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے اس کی خبروں کی اشاعت پر سنجیدہ نظر ڈالتے ہوئے پندار کے قارئین کے لئے اسے Readable بنا دیا ہے۔ادبی وشعری سرگرمیوں کو بھی خوبصورتی سے شائع کیا جاتا ہے۔اس کے اداریے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بہار ہی سے اردو روزنامہ 'انقلاب' جاری ہوا۔ پہلے یہ اخبار ممبئی کے حوالے سے جانا جاتا تھا لیکن بہت کم وقت میں انقلاب نے بہار میں بھی اپنا قابل رشک مقام بنا لیا ہے۔اس کے بھی قارئین کا ایک بڑا حلقہ ہے اور یہ احمد جاوید کی صحافتی صلاحیتوں کا خوبصورت نمونہ ہے۔ان سب کے علاوہ راشٹریہ سہارا بھی بہار کی اردو آبادی میں تعارف کا محتاج نہیں۔سیاسی سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ شعروادب کی سرگرمیوں کو بھی اس کے صفحات پر نمایاں مقام دیا جاتا ہے۔سید شہباز اور واحد رحمانی نے اسے بہار کے عوام کی آواز بنانے میں ہمیشہ محنت کی ہے اور کامران گزر رہے ہیں۔ یہاں پر 'فارقی تنظیم' کا بھی ذکر لازمی ٹھہرا یہ بنیادی طور پر رانچی، ریاست جھارکھنڈ کا ہر دلعزیز روزنامہ تو ہے ہی ان دنوں پٹنہ سے بھی شائع کیا جارہا ہے۔اس کے موجودہ ایڈیٹر محمد ظفر علی ہیں جنھوں نے اپنے والد فاروق الحسینی کی یاد میں پٹنہ سے جاری کیا۔اس کے ادارتی بورڈ سے منسلک رہنے والے صحافیوں میں خورشید پرویز صدیقی کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے۔ بہار سے ایک روزنامہ 'ہمارا سماج' بھی اپنی خبروں سے قارئین اردو کو باخبر کرتا رہا ہے۔ان سب کے علاوہ بھی بہت سارے اردو اخبارات ہوں گے جو کم از کم پٹنہ کے اردو اخبار بیچنے والے ہاکرس کے اسٹال پر نظر نہیں آتے یعنی ان سب کی حیثیت یوں ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ممکن ہے کہ .R.N.I کے دفتر میں ان کے اعداد وشمار ہوں۔ابھی چند اخبارات میرے ذہن میں محفوظ ہیں جیسے امن چین (مدیر امتیاز کریم)، تاثیر (مدیر محمد گوہر)، روشن زندگی (نواب عتیق الزماں)، روزنامہ نوید صبح اور سہارا اکسپریس وغیرہ..... ویسے بھی محلے ٹولے کے اخبارات تک میری رسائی نہیں۔ بہار میں اردو کے کئی نامور صحافیوں کی خدمات رہی ہیں جن پر تفصیل سے اظہار کرنا یہاں ممکن بھی نہیں ہے۔ بندھے ہوئے وقت اور موضوع سے چھلانگ لگا کر آگے بڑھ جانے میں ہی عافیت سمجھتا ہوں۔

فی زمانہ سرمایہ داروں اور سیاسی بازیگروں کی ملی آؤ بھگت سے صحافت کا پیشہ ہر درجہ متاثر ہوا

ہے۔ سچ ہے کہ صحافت رائے عامہ تیار کرنے میں اہم رول ادا کرتی رہی ہے۔انقلاب زندہ باد کا نعرہ اردو صحافت کی دین ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔صحافت کے حوالے سے ہم زمانۂ حال کا اپنے ماضی کی شاندار صحافتی سرگرمیوں سے موازانہ نہیں کرسکتے۔ملک کے قوانین اور آئین کو بحسن وخوبی سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہوئے خیر وشر کی اس جنگ میں ایک صحافی کا کردار منصفانہ اور حقیقت پسندانہ ہونا چاہئے۔ لاقانونیت اور غیر سماجی عناصر کے خلاف کھل کر قلم اٹھانا صحافی کی منصبی ذمہ داری ہے۔ملک کے کشیدہ ماحول کو خوشگوار بنانے میں ایک صحافی اہم بھومیکا نبھا سکتا ہے لیکن افسوس اکیسویں صدی کے سرمایہ دارانہ نظام نے حرف ولفظ کی تہذیبی پاسداریوں کے مضبوط ستون کو کھوکھلا کردیا ہے۔اس مقام پر اُردو صحافیوں کو اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے۔ مادی آلائشوں نے ہمارے چند صحافیوں کو Establishment کا بھونپو بنا کر رکھ دیا ہے۔اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں تفصیل میں جائے بغیر بھی اپنی بات کہی جاسکتی ہے۔ہاں! یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ لاشعوری طور پر ہی سہی ہم سب Yellow Journalism کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔اردو صحافت میں عالم باعمل افراد کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔صحافت آج بہت حد تک مخصوص افراد کے نجی مفادات کے حصول کا Powerful Tool بن گئی ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ بہار میں بھی اردو صحافت کا عصری منظر نامہ اپنے باوقار ماضی کے شاندار کردار کو مجروح کرتا نظر آرہا ہے۔ہم حقائق سے چشم پوشی نہیں کرسکتے۔

اب یہ الگ بات کہ اُردو اخبارات معاشی بحران سے دوچار رہے ہیں۔دوسری زبانوں کے مقابلے میں اشتہارات حاصل کرنے کے لئے اُردو اخبارات کے مالکان یا اردو صحافت والے کچھ زیادہ ہی دوڑ بھاگ کرتے نظر رہے ہیں۔کہا جاسکتا ہے کہ بہار میں بھی اُردو صحافیوں کا اب کوئی واضح تعمیری نقطۂ نظر نہیں رہا ہے۔اُردو صحافت کا وقار اور اس کا معیار بلند ہو یہ صرف صحافیوں کی ہی ذمہ داری نہیں بلکہ اس سے منسلک افراد بھی جواب دہ ہیں۔اب اردو اخبارات کے مالکان/ پروپرائٹر کی بنیادی ترجیحات سے کون واقف نہیں؟ کاش کہ اردو صحافت اردو آبادی کی ''مستحکم آواز'' بن جائیلیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے ارد گرد آج بھی ایسے قلم کاروں/صحافیوں کی کمی نہیں

جن کے دم سے صحافت کے بازار کی رونق بڑھی ہے۔ جب جب ہماری گنگا جمنی تہذیب پر غیر سماجی عناصر کا غلبہ ہوا ہے اور ملک کی وحشی طاقتوں نے سر اُبھارا ہے تو ایک سچا قلم کار ایک صحافی خاموش نہیں رہ سکا ہے اور شاید اسی لئے صحافی کو ہم اپنے ملک کا Watch Dog بھی کہتے ہیں۔ یہاں واچ ڈاگ سے مراد پہریدار کے ہے۔ ہمارے یہاں عالم باعمل کی کتنی ضرورت ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایک صحافی کے منصبی فرائض اور صحافت کی اعلیٰ کارکردگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکبرالہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

الیکٹرونک میڈیا کی یلغار اور سیاسی بالادستی کے باوجود بہار میں اردو صحافت کا ماضی وحال آئینے کی طرح چمک رہا ہے۔ ہمارے عہد میں اس کا معیار اور گراف آسمان کی بلندیوں کو چھو لے ایسی ہماری تمنا ہے۔ صحافت کی زبان کوئی بھی ہو ایک بے باک، ایماندار اور حقیقت آشنا صحافی کا ہمارے ملک اور معاشرے میں ہمیشہ اونچا مقام رہا ہے۔ ہر جگہ صحافیوں کو احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ سرکار بھی قلم کی طاقت کو خوب سمجھتی ہے اور کہیں کہیں جھک کر صحافیوں کو سلام بھی بجا لاتی ہے۔ بہار میں اردو صحافت کے نشیب وفراز اور اس کے باطن کی سیاحی کی داستان کو محض چند سطروں صفحوں اور گھنٹوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے خاصا وقت درکار ہے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ صحافتِ اردو اس بات کی گواہ ہے کہ بہار میں اردو صحافت کے پلیٹ فارم سے اردو کے بعض روشن ضمیر صحافیوں نے اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت، بشری نیکیوں اور اپنی منصبی ذمہ داریوں کا اعلیٰ ترین معیار و وقار پیش کرتے ہوئے اپنی 'Journalist Personality' کو ہماری نگاہ اور پوری اردو آبادی کے درمیان قابل تقلید بنا دیا ہے اور یہ ثابت بھی کر دیا ہے۔ بقول غالب:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

☆☆☆

ڈاکٹر

قیام نیّر

بہار میں اُردو صحافت: مسائل اور امکانات

بہار ہر دور میں اُردو زبان وادب کی آبیاری کرتا رہا ہے۔ ادبی خدمات کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے بلکہ اب تو اسی میں بہت حد تک تیزی آ گئی ہے۔ اُردو زبان پڑھنے لکھنے اور بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی یہ ملک کی دوسری ریاستوں سے آگے ہے۔ جہاں تک بہار میں اُردو صحافت کا سوال ہے تو اس اعتبار سے بھی یہ نہایت اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ بہار میں انگریزی اور ہندی صحافت سے قبل اُردو صحافت کی ابتدا ہو چکی تھی۔ آرا سے اُردو کا پہلا اخبار ۱۸۵۳ء میں ''نورالانوار'' کے نام سے شائع ہوا یہاں سے دوسرا اخبار ''پٹنہ ہرکارا'' ۱۱راپریل ۱۸۵۵ء کو شائع ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔

بہار کی اُردو صحافت ابتدا ہی سے لیتھو کی کتابت وطباعت کے سہارے آگے بڑھتی رہی ہے اور یہ سلسلہ ۱۹۹۰ء تک چلتا رہا ہے۔ اس فن کے ماہرین کی وجہ سے بہار کے اُردو اخبارات صاف ستھری کتابت وطباعت سے مزین ہوتے رہے۔ صدائے عام، سنگم، اتحاد، ساتھی، مورچہ اور آدرشی وغیرہ اس دور کے اچھے اخبارات تھے۔ آج بھی قومی تنظیم، فاروقی تنظیم، راشٹریہ سہارا، پندار، انقلاب اور ہمارا سماج وغیرہ بہار سے نکلنے والے اچھے اخبار ہیں۔ ۱۹۹۵ء سے بہار کی اُردو صحافت میں کئی لحاظ سے نمایاں تبدیلی آئی۔ فیکس، ٹیلی پرنٹر، اُردو سافٹ ویئر (کمپیوٹر کمپوزنگ) اور آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ ساتھ اُردو نیوز ایجنسی یو این آئی کی خدمات حاصل ہوئیں۔ انٹرنیٹ کی سہولیات حاصل ہو جانے کے بعد تو صحافت میں جیسے ایک انقلاب آ گیا اگر اردو اخبارات کو باصلاحیت اور تجربہ کار صحافیوں کی بہتر خدمات حاصل ہو جائیں تو صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے اُردو اخبارات ترقی کی کئی منزلیں ایک ساتھ طے کر لیں گے۔ یہاں پر ایک بات اور کہنا چاہوں گا وہ یہ کہ بہار کے کئی اہم اور باصلاحیت صحافی پوری محبت لگن اور ایمانداری سے صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن ان کا نام اخباروں میں اس طرح نہیں آتا جس طرح وہ کام کر رہے ہیں۔ تنخواہ

کم دینا اور کام زیادہ لینا یہ ایک طرح کا استحصال ہے اور یہ استحصال اردو صحافت میں کافی پہلے سے چلا آرہا ہے۔ سبکدوشی کے خوف سے کوئی اسی بات کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔

بہار کی اُردو صحافت ہمیشہ محدود وسائل کی شکار رہی ہے۔ کچھ صحافیوں نے اسے مشن بنا کر نیک جذبے سے اُردو کو اور اُردو اخبارات کو زندہ رکھنے کے لئے کام کیا لیکن قلم کے وہ سپاہی بھی صرف قلم سے اردو صحافت کی پاسبانی نہیں کر سکے۔ اخبار کے لئے جس معاشی مضبوطی اور وسائل کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہیں تھی، نتیجے کے طور پر وہ لوگ اپنے اخباروں کو دوسروں کے ہاتھوں فروخت کر کے مالک سے ملازم بن گئے اور لمبے عرصے تک دوسروں کے نام پر اداریئے، کالم اور تبصرے وغیرہ لکھتے رہے۔

بہار کی اُردو صحافت کے ترقی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کم تنخواہ کی وجہ سے اچھے باصلاحیت لوگ اسی سے نہیں جڑ پاتے ہیں جو ملکی و غیر ملکی انقلابات، سماجی افکار، رائے عامہ کی بیداری اور سیاسی تبدیلی وغیرہ سے واقف ہوتے ہیں۔ عام طور پر اس میں بحالت مجبوری وہ نوجوان شامل ہوتے ہیں جو پڑھ لکھ کر بیکار ہیں، جنہیں نوکریوں کی تلاش ہے۔ وقت گزاری کے لئے اس سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس نہ تو صحافت کی کوئی فنی تربیت ہوتی ہے اور نہ صحافت کا تجربہ۔ اس لئے ایسے لوگوں سے بہتری کی اُمید رکھنا صحیح نہیں ہے۔

اُردو اخبارات میں سرکاری اشتہارات کم ملنے کی شکایت ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ سرکاری اشتہارات کی تقسیم میں تعصب برتا جاتا ہے۔

''جہاں تک انگریزی اور ہندی کے اخبار کا تعلق ہے انہیں ساری سہولیات میسر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو اخباروں کو بیساکھیوں کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔ جتنے روپئے کے اشتہارات صرف ایک بڑا انگریزی اخبار ڈکار لیتا ہے، سارے بھارت کے اُردو اخباروں کو دئے گئے اشتہارات سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ سرکاری اشتہارات ہی اردو اخباروں کو اونے پونے داموں پر دئے جاتے ہیں۔'' (''نو بھارت ٹائمز'' دہلی، ۱۵؍نومبر ۱۹۹۲ء)

اُردو اخبارات کو آگے نہ بڑھنے کی وجہ بتانے والوں کا کہنا ہے کہ کچھ لوگوں نے مرکزی اور

صوبائی حکومتوں کے اشتہار کی پالیسی سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُردو صحافت کو تجارت بنالیا ہے۔ ایک ایک آدمی مختلف ناموں سے اخبار نکال کر دس دس اخبارات کے مالک بن گئے۔ ایسے لوگوں کو اُردو سے نہ اردو والوں سے نہ اُردو صحافت سے کوئی مطلب ہوتا ہے۔ وہ صرف اشتہارات اور دیگر سہولیات حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک ایک اخبار سے دس اخبار تیار کرنے کے فن سے واقف ہوتے ہیں۔ سید احمد قادری لکھتے ہیں:

''سفرنامہ کے بغیر ایک سو کی تعداد میں کوئی اخبار شائع کرایا گیا اور پھر اسی ایک سو اخبار کے دس دس کی تعداد میں مختلف سفرنامہ کے بلاک سے دس دس اخبار تیار کرا لیا گیا۔ اس طرح ایک ہی تاریخ اور ایک ہی میٹر کے ایک اخبار سے دس اخبار تیار ہو جائے جن کی پانچ سات کا پیاں متعلقہ دفاتر میں اور اشتہارات کے بل کے ساتھ جمع ہو جاتے بقیہ چند کا پیاں فائل کی زینت بنتے۔''

(اُردو صحافت بہار میں، سید احمد قادری، مکتبہ غوثیہ، گیا، سال اشاعت: ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۰)

بہار کی اُردو صحافت کو بدنام کرنے میں ایسے لوگوں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ اُردو اخبارات بشمول بہار، اپنے اداریوں، تبصروں اور دیگر کالموں میں جذباتی عنصر کو اُبھارنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں جس سے قارئین کے ذہن پر منفی اثرات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ صحافت کسی بھی قوم کی سوچ و فکر میں مثبت اثرات مرتب کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سہیل انجم ایک جگہ لکھتے ہیں:

''انگریزی روزنامہ ''پانیئر'' کے ایڈیٹر چندن مشرا اُردو اخباروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُردو اخبار منفی رول ادا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ چوں کہ ان کے قارئین بیشتر مدارس کے لوگ ہوتے ہیں اس لئے وہ ہی کچھ چھاپتے ہیں جو ان کو پسند ہوں اور ان کی پسند کیا ہے یہ ہمیں معلوم ہے۔''

(میڈیا اُردو اور جدید رجحانات، سہیل انجم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰، ص ۱۰۴)

اُردو اخبارات پر سیاست کا حاوی ہو جانا بھی اسے کمزور بنا رہا ہے، زیادہ تر اخبارات کسی نہ کسی سیاسی گروہ یا سیاسی تنظیم سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے سیاستدانوں کی ہر چھوٹی بڑی

خبروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ سماجی، ادبی اور دیگر علوم کی خبریں کم دیتے ہیں۔

بہار سے نکلنے والے اُردو اخباروں کے پاس اپنے خصوصی کالم نگار بھی نہیں ہیں۔ انہیں جو کچھ پکا پکایا مل جاتا ہے اسے اپنے اخباروں میں شامل کر لیتے ہیں۔ بہار سے نکلنے والے اردو اخبارات کے کمزور ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

اس وقت دنیا بھر میں پی ٹی آئی کے نمائندے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی ایک سو سے زائد شاخیں ملک بھر میں کام کر رہی ہیں۔ دنیا کی اہم ترین نیوز ایجنسیوں سے اس کے تعلقات ہیں۔ پی ٹی آئی کی اس سروس کو سرکاری سطح پر بھی سراہا گیا ہے۔ مفتی اعجاز ارشد کے مطابق:

’’بہت سے محکموں نے اس کی خریداری قبول کر رکھی ہے۔ پی ٹی آئی کا عملہ ڈیڑھ ہزار سے زائد افراد پر مشتمل ہے جن میں تقریباً پانچ سو صحافی ہیں۔ ہندوستان بھر میں ایک ہزار سے زائد اخبارات اس کے مستقل خریدار ہیں۔ اس وقت ایشیا کی یہ سب سے بڑی ایجنسی ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اردو زبان میں اس کی سروس نہیں ہے۔‘‘

(من شاہ جہانم، مفتی اعجاز ارشد قاسمی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سال اشاعت: ۲۰۰۲ء، ص ۲۹۳)

حکومت کی سرد مہری بھی بہار کے اُردو اخبارات کے ساتھ ابتدا ہی سے رہی ہے۔ ڈی اے وی پی میں اُردو اشتہارات کی قیمت اور شرح سب سے کم ہوتی ہے۔ یہ حکومت کی عدم توجہی کا ایک کھلا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ بہت ہی کم اُردو اخبارات کو اعلیٰ سطحی حکومتی وفد کے سرکاری دوروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اُردو اخبارات کے تئیں حکومت کی پالیسی منفی ہی کہی جا سکتی ہے۔

اُردو اخبارات کے قارئین کی تعداد بھی گھٹتی جا رہی ہے۔ بہار ہی نہیں پورے ملک میں اکیسویں صدی آتے آتے اُردو قارئین کی تعداد بہت گھٹ گئی ہے۔ آزادی کے بعد ملک کی ہندی اور انگریزی زبانوں کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں کی صحافت کے تجزیہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو صحافت قارئین کے معاملے میں ان سے پیچھے ہے۔ اُردو میں نکلنے والے زیادہ تر اخبارات کا سرکولیشن کم ہے اور قارئین کی تعداد بھی بہت کم ہے۔

انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلوں کے عام ہو جانے کی وجہ سے اُردو اخبارات کے لئے ایک مشکل

صورت پیدا ہو گئی ہے۔ انٹرنیٹ پر اب لمحہ لمحہ اپڈیٹ خبریں آنے لگی ہیں۔ اُردو اخبارات میں جو خبریں ہم پڑھتے ہیں ان میں سے بیشتر پہلے ہی انٹرنیٹ یا ٹی وی کے نیوز چینلوں پر آ جاتی ہیں۔ اب تو قارئین یہ بھی سوچنے لگے ہیں کہ تازہ ترین خبریں حاصل کرنے کے لئے اُردو اخباروں سے کام نہیں چلے گا۔ اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی یا ہندی کا اخبار بھی خریدنا پڑے گا ان سب باتوں کے باوجود ہم اُردو اخباروں سے مایوس نہیں ہیں۔

اُردو کی ترقی و توسیع میں بنیادی حصہ اُردو کے اخبار و رسائل کا ہے۔ پوری اُردو دنیا میں اُردو کو مقبول بنانے میں انہوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ نئے الفاظ، نئے محاورات اور نئی نئی اصطلاحوں کو رواج دینے میں اُردو اخباروں کا کردار نمایاں رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صحافت کے ارتقاء کے ساتھ زبان کا رشتہ زماں، زمین اور ذہن سے استوار ہو جاتا ہے اور ایک ترقی یافتہ زبان وجود میں آتی ہے۔ آج بہار ہی نہیں پورے ہندوستان میں اُردو اخبارات کس طرح شائع ہو رہے ہیں اس کا اندازہ ان ہی کو ہوگا۔ جو صحافت سے جڑے ہوئے ہیں۔ اُردو داں طبقہ کو اپنی زبان اور اس کی صحافت کے فروغ کی ذمہ داری قبول کرنی ہوگی کیوں کہ عوام کی ترجمانی کا کام اخبار ہی کرتے ہیں۔

’’اُردو صحافت کو غیر معیاری ادب کا طعنہ دینے والوں کو یہ سچائی ذہن نشیں کر لینی چاہئے کہ برصغیر میں اُردو کی ترویج و اشاعت میں اُردو اخبار و رسائل کا اہم حصہ ہے۔ اس زبان کو پوری دنیا میں مقبول بنانے، نئے علاقوں میں اس کی بستیاں بسانے اور اُردو فنکاروں کو ایک جہاں سے متعارف کرانے میں اُردو اخبار و رسائل بنیادی کردار انجام دے رہے ہیں۔‘‘

(اُردو صحافت کے مسائل اور امکانات، عارف عزیز، مشمولہ اُردو صحافت کے مسائل اور امکانات، مرتب خالد محمود و سرور الہدیٰ، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، سال اشاعت ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۴، ۱۵۵)

ہندوستان میں اُردو صحافت کا ماضی روشن اور تابناک رہا ہے اور آج بھی تعداد کے لحاظ سے ہندی کے بعد سب سے زیادہ نکلتے ہیں۔ آج اگر اُردو صحافت دوسری زبانوں کے مقابلے میں پسماندہ ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ اُردو تعلیم کا کمزور ہونا ہے۔ اُردو کی تعلیم پر زور دے کر ابتدائی درجے سے لے کر اعلیٰ سطح تک اُردو کی تعلیم کو بڑھانا ہوگا۔ نئی نسل کو اس زبان کی تعلیم حاصل کرنی

ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اُردو کے اخبارات کو عوام پسند بنانے کے لئے خبروں، تبصروں، کالموں اور رپورٹوں کے معصار کو بہتر بنانا ہوگا تا کہ اُردو اخبار کے تئیں قارئین کی رغبت بڑھے۔ اس اقتباس سے بہار کی اُردو صحافت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

''بہار میں اُردو صحافت نے ہمیشہ ہی اپنا تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ممکن ہے بعض وجوہ سے یہاں کے صحافیوں کو اپنی زندگی میں قدر و منزلت اور وہ شہرت و ناموری نہ مل سکی ہو جس کے وہ مستحق تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں فارغ البالی کے صرف خواب ہی دیکھے ہوں، لیکن اُردو صحافت کی تاریخ کا مطالعہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ معمولی کپڑوں میں ملبوس رہنے والے ہمارے ان بوریہ نشین صحافیوں نے ہماری آزادی اور ہماری اصل بنیادی مشرقی قدروں کی حفاظت کے لئے ان کا قلم ہمیشہ بے باکی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ ہمارے اداریہ نویسوں اور تجزیہ نگاروں نے مشکل سے مشکل وقت و حالات میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ ارباب صحافت کی پرانی صفیں خالی بھی ہوتی رہیں اور نئ صفیں بنتی بھی رہیں، لیکن یہ مقام فخر ہے کہ صحافت کی حقیقی شان پر یہاں کے لکھنے والوں نے کبھی کوئی حرف نہیں آنے دیا۔''

(بہار کے ارباب صحافت: ''زبان و ادب'' پٹنہ، جولائی ۲۰۱۳ء، ص ۱۵)

اس طرح بہار میں اُردو اخباروں کے سامنے بہت سے مسائل ہیں لیکن ہر دور میں اس نے اپنی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

(مقام و پوسٹ برداہا، وایا کمتول، ضلع مدھوبنی، بہار، موبائل 997343606)

☆☆☆

عطا عابدی

ادبی صحافت کے اغراض و مقاصد

(ادبی رسائل کے اداریوں کے حوالے سے)

ادب اگر سماج کا آئینہ ہے تو ادبی صحافت کو بجا طور پر سماج کا آئینہ گر یا آئینہ خانہ کہا جانا چاہئے۔ ادب اور سماج کے اس رشتے سے ادبی صحافت کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ادبی صحافت کا مطلب ہے صحافت کا وہ پہلو جو ادب سے متعلق ہوتا ہے۔ اور ایسی صحافت کا بنیادی وسیلہ عموماً ادبی رسائل ہی ہوتے ہیں۔ ادب کی نشو و نما، ادب کے مزاج و مذاق کی تعمیر و توسیع نیز رجحانات و عوامل کے حوالے سے ادبی صحافت یعنی ادبی رسائل کا مطالعہ جہاں سماجی و ثقافتی جہان نو کی دریافت کے مترادف ہے وہیں مختلف اور متنوع زمانی و مکانی ارتقا کی تاریخ کو روشنی میں لانے کے مساوی بھی ہے۔

ادبی رسائل اپنے عہد کے ادبی تناظر و تحریر کے حوالے سے نہ صرف تخلیقی شعور و سمت کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ سماج و ثقافت اور دیگر عوامل کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ ادبی رسائل اپنے دامن میں زبان و ادب اور ادیب و معاشرہ سے متعلق قیمتی ذخائر رکھتے ہیں۔ ادبی رسائل تہذیبی پاسداری کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔

ادبی صحافت کی تعمیر و توسیع کس قدر اہم ہے اسے ایک اقتباس سے دیکھیں۔ جناب محمد انیس ایم اے رسالہ صبح نو پٹنہ ستمبر ۱۹۵۸ء کے شمارہ میں ص ۶ پر لکھتے ہیں۔

''کسی زبان میں ادبی رسائل کی تعداد اس زبان کے بولنے والوں کی تہذیب و شائستگی اور اس کے ذوق سلیم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اگر ادبی رسائل کی تعداد زیادہ ہے تو اس کے بولنے والے زیادہ متمدن، زیادہ تربیت یافتہ اور زیادہ ذوق سلیم کے حامل ہوں گے۔ اس کے برخلاف اگر ادبی رسائل کی تعداد کم اور لچر رسائل کی تعداد زیادہ ہوگی تو اس قوم کے کلچر اور ذوق سلیم کے متعلق شک کیا جائے گا اور انہیں صحیح ذوق ادب سے عاری سمجھا جائے گا............''

ادب کی اہمیت وافادیت ہر سماج اور عہد میں مسلم رہی ہے۔ ادبی صحافت یعنی ادبی رسائل ادب کی اسی اہمیت وافادیت کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا راقم الحروف نے اس مضمون کے ذریعہ ادبی صحافت کے ان پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے، جن کا تعلق ادبی رسائل کے اغراض ومقاصد سے ہے۔

ادبی رسائل کے اغراض ومقاصد سماجی وثقافتی اغراض ومقاصد سے بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ادبی رسائل کے اغراض ومقاصد عموماً وہی ہوتے ہیں جو کسی بھی رسائل کے ہوتے یا ہوسکتے ہیں۔ ہر رسالہ، ادبی رسالہ اپنے پیش نظر اشاعتی ترجیحات رکھتا ہے اور اسی لحاظ سے مضامین نثر ونظم کا انتخاب کرتا اور انہیں شائع کرتا ہے۔

ادبی رسائل کے اغراض ومقاصد اپنی فکر ونظر کے تابع ہوتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے سرگرم ہوتے ہیں۔ چونکہ ادبی رسائل کی اہمیت وافادیت مسلم ہے، لہٰذا ان کے اغراض ومقاصد سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ادبی رسائل کے اغراض ومقاصد ادبی رسائل کی فکر ونظر اور ان کی قدر وقیمت کی آئینہ داری کے مترادف ہوتے ہیں۔ ادبی رسائل ادبی نگارشات کی اشاعت اور اس کے ارتقا کے لیے لازمی امور ادا کرتے ہیں تو یہیں ادب رسائل کے اغراض ومقاصد بھی سامنے آجاتے ہیں کہ ادبی رسائل ادبی نگارشات کی اشاعت وارتقا کے لیے بنیادی طور پر ترجیحی رول ادا کریں گے۔

اردو کے شعراء، ادباء اور صحافیوں ودانشوروں نے اردو زبان کو سنوارنے اور اس کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کردار کا مرکز یا محور یا میدان عمل یا وسیلہ اردو کا رسالہ ہوتا آیا ہے۔ ادبی رسالوں کے اغراض ومقاصد میں سب سے بڑا نکتہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ادبی تخلیقات اور ادب کے دیگر موضوعات وسائل نیز مزاج وکیفیت کی ترویج اشاعت ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

''ادب میں نئے نئے رجحانات اور نئی نئی تحریریں رسالوں کے سہارے عام ہوتی ہیں اور ان سے اثر قبول کیا جاتا ہے۔''

رسالہ کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ کوئی رسالہ خالص ادبی ہوتا ہے تو کوئی نیم ادبی۔ کوئی

رسالہ طب، مذہب یا فلم وکھیل کود سے متعلق ہوتا ہے۔ کسی کا تعلق تجارت وصنعت سے ہوتا ہے تو کوئی سیاسی وسماجی صورت حال کا عکاس۔ بعض رسائل کثیر الموضوعی ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو غالب ہوتا ہے۔ جیسے رسالہ شمع دہلی کو لوگ فلمی رسالہ کے طور پر جانتے تھے لیکن اس میں ادبی تحریریں بھی قابل توجہ اور اہم ہوتی تھیں۔ اسی طرح رسالہ افکار ملی دہلی کو لوگ ملی وسماجی موضوعات کے حوالے سے زیادہ جانتے ہیں لیکن ان میں سیاست، ادب اور بچوں کے موضوعات کا احاطہ بھی پابندی سے کیا جاتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر رسالہ الگ الگ مزاج وکیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے میں ان رسالوں کے اغراض ومقاصد بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔

ادبی رسائل کے اغراض ومقاصد متعلقہ سرگرمیوں سے بخوبی عیاں ہوتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ کے شمارہ فروری ۲۰۰۷ میں رحمٰن آذر اپنے مضمون ''اردو رسائل اور ان کے مسائل'' میں تہذیب الاخلاق کے اجراء کا جو مقصد سرسید نے بیان کیا تھا، اسے نقل کیا ہے، جو یوں ہے:

''اس پرچے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولائزیشن (CIVILIZATION) یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سولائزڈ (CIVILIZED) یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہوں اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلائیں۔''

(تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، فروری ۲۰۰۷ء)

ششماہی انعکاس (مظفر پور) کے شمارہ جنوری تا جون ۱۹۹۰ میں رسالہ کے مدیر اعلیٰ منظر اعجاز رسالہ کے اغراض ومقاصد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''رسالہ کا اجراء نہ تو کسی نری مقصدیت اور منطقیت کے تحت ہوا تھا اور نہ اب اس کی تجدید کا محرک کوئی ایسا سبب ہے، یہ چند احباب کے ذوق وشوق کا نتیجہ ہے۔ لیکن ذوق وشوق کے ہنگامی ردعمل کا نتیجہ نہیں۔ اس کا ایک صالح، تعمیری اور تخلیقی مقصد بھی ہے۔ جس کو مینی فیسٹو بنا کر ہم پیش نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا ہمارے اس مقصد میں دخیل نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہمارے مقصد کا انعکاس رسالہ انعکاس کے مختصر صفحات میں دیکھنے کو ملے گا۔ تاہم اس کا

مختصر اشاریہ یہاں بھی ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے۔''

اردو ادبی رسالوں کے حوالے سے بہار کی سرزمین کوکئی رسالوں کے مدیران اور اہل نظر نے زرخیز نہیں مانا ہے۔اس کی وجہ بہار کے وہ مسائل ہیں جو اردو کے ادبی رسالوں کے لیے ناساز گار حالات پیدا کرتے ہیں رسالہ ادیب پٹنہ کے اداریے ''فکر ونظر'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

''یوں تو سرزمین بہار رسالوں کے لیے ذرا سخت واقع ہوئی ہے۔یہاں کوئی بھی پرچہ مستقل طور پر نہ نکل سکا۔گذشتہ کو چھوڑیئے۔حالیہ ادبی رسالہ ''تہذیب'' کو تشفی بخش مارکیٹ نہ مل سکا لہٰذا فی الوقت سہیل عظیم آبادی کو مجبوراً اشاعت روک دینی پڑی۔''معاصر'' جو عظیم آباد میں طویل عرصہ سے ادبی خدمت انجام دے رہا ہے اب محض ایک خاص حلقہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔''

(رسالہ ادیب، پٹنہ، شمارہ ۱ر جلد ۱ر، جون ۱۹۵۴ء ص ۵)

اس وقت بہار کے کئی ادبی رسائل معیار اور پابندیٔ اشاعت کے سبب اپنی پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ششماہی انعکاس (مظفر پور) کے اغراض ومقاصد کا مختصر اشاریہ بھی یہاں پیش کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ایک ادبی رسالہ کے اغراض و مقاصد کی عکاسی واضح طور پر ہوتی ہے۔ملاحظہ کریں۔

''..................موجودہ اردو ادب جس انتشار، جس یاس، جس لامعنویت کا آئینہ دار ہوگیا ہے۔وہ اس بات کی واضح نشاندہی ہے کہ ہماری معاشرتی تہذیب اور ہمارے تہذیبی اقدار کے درمیان خلیج پیدا ہو چکی ہے۔اور ادبی تخلیقی سرگرمیوں سے اس خلیج کو پاٹنے میں آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔چنانچہ حتی المقدور ہماری کوشش ہوگی کہ ہم اس سلسلہ کے ممکن وسائل فراہم کرسکیں۔''

سہ ماہی حصار (رانچی) کے پہلے شمارہ میں اداریہ کے تحت اس رسالہ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس اداریہ میں رسالہ کا مقصد ادب کو ازم کی حد سے باہر نکال کر ادب کی تخلیق و تفہیم کھلی فضا میں ہونا بتایا گیا ہے۔

''............ہمارا موقف زبان وادب کے سلسلے میں جو بنیادی اور اہم سوالات ہیں انہیں اٹھانا اور ان کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے۔اس کے علاوہ ادب میں جو نظریاتی حد بندیاں اور ازم کی چہار دیواریاں ہیں ان سے باہر نکلنا بھی اس رسالے کا مقصد ہے۔ادب کو ازم کی حدود سے

باہر نکلنا چاہئے تاکہ ادب کی تخلیق و تفہیم کھلی فضا میں ہوسکے............''

اکثر ادبی رسائل اپنے اغراض ومقاصد میں غیر جانبدارانہ طرز عمل پر زور دیتے نظر آتے ہیں اور اسے اپنے رسالہ کے اغراض ومقاصد میں شامل کرتے ہیں لیکن ادب لطیف لاہور (سالنامہ ۱۹۵۰) کے اداریے کا ایک اقتباس دیکھیں جس سے نہ صرف غیر جانبداری کی نفی ہوتی ہے بلکہ اسے ایک فریب سے موسوم کیا گیا ہے۔

''غیر جانبداری ذہن ونظر کا ایک فریب ہے جسے محض اس لیے فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ طبقہ وارانہ کشمکش میں ایک طبقہ اسے حربے کے طور پر استعمال کرسکے،مگر ایک ذمہ دار، حساس اور بالغ نظر ادیب اس فریب میں نہیں پھنس سکتا۔''

راقم الحروف اپنے ایک مضمون ''ادب زندگی، زندگی احتجاج'' (مطبوعہ کتاب نما، دہلی ،مہمان اداریہ) میں اس پہلو پر کافی لکھ چکا ہے،لہٰذا ان باتوں کی تکرار مناسب نہیں البتہ یہ جملہ یہاں بھی عرض کیا جاسکتا ہے کہ غیر جانبدار شخص حق کا طرفدار نہیں ہوسکتا۔لہٰذا ادبی رسائل کی غیر جانبداری ادب وزندگی دونوں کے لیے گمراہ کن خطوط وضع کرنے کی وجہ ثابت ہوگی۔مولانا صلاح الدین احمد نے رسالہ ''ادبی دنیا'' کے ۱۹۲۹ کے پہلے شمارہ کے ابتدائی صفحات پر رسالہ کے کئی مقاصد درج کئے ہیں۔ان مقاصد میں سے ایک اور دوسرا مقصد ان کے الفاظ میں یوں ہے۔

''ادبی دنیا کے اجرا سے دوسرا مقصد اردو ادب کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے سرمایہ دار بنانا تھا۔جو بصیرت رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اردو ادب کو مدت تک اس کی ضرورت رہے گی۔ترقی یافتہ زبانوں کے لڑیچر کو اردو میں منتقل کیا جائے۔اردو کو اوریجنل لکھنے والوں سے زیادہ اچھے مترجموں کی ضرورت ہے۔''

زبان کی توسیع ،اس کا تحفظ ، نئے ادب کی ترویج اور نئے قلم کاروں کی تربیت ادبی رسالوں کے اغراض ومقاصد رہے ہیں۔ان حوالوں سے ادبی رسائل کا کردار رجحان ساز اور تاریخ ساز بن کر سامنے آتا ہے۔۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کی اردو ادبی صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی مذکورہ امور کو یوں اجاگر کرتے ہیں۔

''رسائل معاصر ادبی صورت حال، رویے اور رجحانات سے واقفیت کا ذریعہ بھی ہیں اور

قادری اور منصف کے باہمی ترسیل و ابلاغ کے نتیجے میں رد و قبول کے پیچیدہ عمل سے گزرنے کے بعد ایک مستحکم فضا کی تشکیل کے ذمہ دار بھی۔ زبان کی توسیع اور اس کا تحفظ، نئے ادب کی ترویج اور نئے قلم کاروں کی تربیت رسالے کرتے رہے ہیں، کرتے رہیں گے۔ جب ہی تو کہتے ہیں، اچھے رسائل رجحان ساز بھی ہوتے ہیں اور تاریخ ساز بھی۔ جس طرح حال کو سمجھنے کے لیے رسائل ناگزیر ہیں اسی طرح ماضی کی ادبی و لسانی صورت حال، رویے اور رجحانات سے آگاہی کے لیے رسائل سے رجوع کئے بغیر چارہ نہیں۔'' (ذہن جدید دہلی، شمارہ ۵۸ ص ۱۸)

رسالہ ہمایوں (جو جنوری ۱۹۲۲ سے ۱۹۵۷ تک پابندی سے شائع ہوتا رہا) کے مدیر بشیر احمد بی۔ اے آکسفورڈ، فروری ۱۹۲۲ء کے اداریہ ''بزم ہمایوں'' میں مدیر رسالہ کے اصول کار (اغراض و مقاصد) کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس تعلق سے اپنی ذمہ داری قبول کرنے پر یوں یقین کا اظہار کرتے ہیں۔

''یہ بھی نظر انداز نہ کریں کہ مدیر رسالہ کی جب تک اپنی رائے یا چند اپنے اصول کار نہ ہوں، اس کا کسی اور کے احساسات و خیالات سے مستفید ہونا نہ صرف بے سود ہوگا بلکہ ناممکن بھی ....ہمیں ہر شخص کو خوش کرنا مقصود نہیں ہاں ہر باذوق کی بات سن کر اس پر غور کرنا اور اپنی عقل ناقص کے مطابق اپنے طریق عمل پر از سر نو روشنی ڈالنا، ہمارے پیش نظر ضرور ہے۔ اور رہے گا۔''

ادبی رسالہ کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ نئے فن کاروں کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کے بہترین استعمال کا موقع فراہم کرے، ایسی فضا بحال کرے کہ نیا فنکار حیات و کائنات کی فنکارانہ پیش کش میں کامیاب ہو۔ اس تعلق سے رسالہ مفاہیم (گیا) کے مرتب سرور عثمانی کے اداریہ ''معروشات'' کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں جس میں فنکار اور مدیر کے درمیان کے رشتوں پر روشنی پڑتی ہے اور ادبی رسائل کے اغراض و مقاصد کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔

''نیا فنکار تخلیق سفر کے دوران اپنے لاشعور میں صحت مند تنقیدی رویوں کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اگر مدیران اپنی صحافتی دیانتداری کا فریضہ پوری ایمانداری کے ساتھ انجام دیں۔ کیونکہ ادب کی دنیا میں مدیر کی انفرادی سوجھ بوجھ کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کس قسم کے ادب کو فروغ دے اور کس طرح کے ادب کو منظر عام پر آنے سے روکے رکھے۔ مدیر اپنے عہد کی نبض شناسی کا سلیقہ بدرجہ رکھتا ہے......(مفاہیم گیا، ۱۹۸۰، ادب نمبر)

ماہنامہ سنگ میل (پٹنہ) کے پہلے شمارہ (مارچ ۱۹۵۵) میں اداریہ کے تحت اغراض و مقاصد اس طرح سامنے آتے ہیں۔

''............اس میں ہم صرف ملک کے بڑے اور چوٹی کے لکھنے والوں ہی کو جگہ نہیں دیں گے بلکہ نئے لکھنے والوں کو بھی آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔''

اسی اداریہ میں ایک جگہ رسالہ کا مقصد عوام کی دلچسپیوں کو پیش نظر رکھنا بھی بتایا گیا ہے۔

ماہنامہ تہذیب پٹنہ جو علمی ادبی سیاسی رسالہ تھا اور اسے عبدالقیوم انصاری و سہیل عظیم آبادی ترتیب دیتے تھے، کے اغراض و مقصد ''حرف اول'' کے تحت یوں سامنے آتے ہیں۔

''اگر استقلال کے ساتھ پڑھنے والوں کے لیے اچھا ادب مہیا کیا جائے تو جلد ہی ماحول سدھر سکتا ہے۔ اور ادب کے نام پر فحاشی کی تجارت کو روکا جا سکتا ہے۔ (تہذیب پٹنہ، جنوری ۱۹۵۳ ص ۲)

یعنی رسالہ تہذیب کے اغراض و مقاصد میں استقلال کے ساتھ اچھا ادب پیش کرنا بھی تھا تاکہ ادب کے نام پر نہ صرف فحاشی کی تجارت کو روکا جا سکے بلکہ عوام کا ذوق بگاڑنے سے بچایا جا سکے۔

ادبی رسائل کے مذکورہ مختلف اداریوں سے ادبی رسائل کے اغراض و مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان تمام اداریوں کو نظر میں رکھیں تو ادبی رسائل کے جو اغراض و مقاصد سامنے آتے ہیں، ان میں اردو زبان و ادب کا فروغ، اچھے ادب کی اشاعت، پرانے قلم کاروں کا احترام اور نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی، اردو تہذیب کی تعمیر و توسیع، معاشرتی تہذیب اور تہذیبی اقدار کے درمیان کی خلیج کو ادبی تخلیقی سرگرمیوں سے پاٹنا، زبان و ادب کے بنیادی اور اہم سوالوں کو اٹھانا اور ان کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا، ادب میں نظریاتی حد بندیوں سے نکلنا، غیر جانبداری کے بجائے حق کی طرفداری کرنا، ادب کو ازم کی حدود سے باہر نکالنا، اردو ادب کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے مالا مال کرنا، ادبی صورت حال، رویہ اور رجحان سے باخبر رہنا اور پڑھنے والوں کو باخبر کرنا، صحت مند ادبی و تنقیدی رویوں کو پروان چڑھانا، غیر صحت مند اور سماج و ادب کے لیے نقصان دہ رویوں کی بیخ کنی کرنا، اچھے ادب کو مستقل طور پر سامنے لانا، عوام کے اندر پاکیزہ ذوق پیدا کرنا وغیرہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان اغراض و مقاصد کی روشنی میں ادبی رسائل کی غیر معمولی ذمہ داریوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ادبی صحافت کے اغراض و مقاصد ادب و زندگی اور سماج و معاشرہ کے لیے رہنما خطوط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد

بہار میں اردو صحافت: ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک

اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ہے جو ۲۷/مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے جاری ہوا اور ۸/مئی ۱۸۲۲ء تک صرف اردو زبان میں چھپتا رہا لیکن جون ۱۸۹۲ء کے اواخر میں اس کی زبان فارسی ہوگئی اور تقریباً ایک سال تک یہ فارسی زبان میں چھپتا رہا۔ اس کے بعد پھر اس نے اردو کی طرف رجوع کیا اور فارسی زبان کے اخبار کے ساتھ اس کا اردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا جس کی تاریخ اجراء ۲۳/مئی ۱۸۲۳ء ہے۔ اس کے ایڈیٹر کا نام سدا سکھ تھا۔

۱۸۳۰ء میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار پائی اور ۱۸۳۵ء میں ہندوستانی پریس کو مختلف پابندیوں سے آزادی ملی۔ اس کے بعد اردو صحافت نے خاصی ترقی کی اور ملک کے مختلف گوشوں سے اخبارات نکلنے لگے۔

۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ اردو صحافت پر خطبات گارساں دتاسی اور اختر شہنشاہی کے علاوہ دو مفصل کتابیں اردو میں ملتی ہیں۔ اول ''تاریخ صحافت اردو'' جلد اول مولفہ امداد صابری مطبوعہ ۱۹۵۳ء اور دوم ''ہندستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں'' مولفہ محمد عتیق صدیقی مطبوعہ ۱۹۵۷ء۔ اول الذکر کتاب میں ۱۹۵۷ء سے پیش تر کے اخبارات و رسائل کی ایک فہرست پیش کی گئی ہے جس میں اردو کے ۴۵/اخبارات کا ذکر ہے۔ دوسری کتاب میں بھی فہرست پیش کی گئی ہے جس میں ۱۰۴/اردو اخبارات و رسائل کا ذکر ہے۔

پہلی فہرست کے کسی اخبار یا رسالے کا تعلق بہار سے نہیں ہے۔ دوسری فہرست میں بہار کے ۳/اخبارات کا ذکر آیا ہے۔ یہ وہی اخبارات ہیں جن کا ذکر اختر شہنشاہی مولفہ ۱۹۸۸ء میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ایک اخبار کا پتہ ملا ہے۔ اس طرح ۱۹۵۷ء سے پیشتر ریاست بہار میں ۴/اخبارات جاری ہوئے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک بقول پروفیسر مظفر اقبال' بہار سے ۵۸ ایسے

اخبارات و رسائل کا شائع ہوئے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) ''نور الانوار'' آرہ سے ۱۸۵۳ء میں جاری ہوا۔

(۲) ''پٹنہ ہرکارہ'' پٹنہ سے ۳/شعبان ۱۲۷۱ھ مطابق ۲۱/اپریل ۱۸۵۵ء میں جاری ہوا۔ یہ اخبار خواجہ کلاں محلے سے مہینہ میں تین بار' انگریزی کی پہلی' گیارہویں اور اکیسویں تاریخوں کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک اور مہتمم شاہ ابوتراب مالک مطبع تھے۔ اڈیٹر کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ لیکن انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ابوتراب ہی اڈیٹر بھی تھے۔ اخبار میں مضامین' لطیفے اور خبریں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ مندرجات کے اعتبار سے یہ اخبار کمپنی کی حکومت کا خیر خواہ معلوم ہوتا ہے' لیکن تبلیغ عیسائیت کا مخالف ہے' چنانچہ اس کے خلاف اس میں مضامین شائع ہوتے تھے۔

(۳) ''ویکلی رپوٹ'' گیا سے یکم/مئی ۱۸۵۶ء کو جاری ہوا۔ اس اخبار کے متعلق اختر شہنشاہی میں حسب ذیل اطلاع ملتی ہے۔

''ویکلی رپوٹ صاحب گنج ضلع گیا ماہواری ۲۴/ورق خود مالک منشی جے جے رام مختار ترجمہ ویکلی رپورٹر از مطبع لاسٹو پریس اجراء یکم/مئی ۱۸۵۶ء۔''

(۴) ''عظیم الاخبار'' پٹنہ سے ماہ جولائی ۱۸۵۹ء مطابق ۱۲۷۵ھ میں جاری ہوا۔ یہ اخبار مطبع محمدی پٹنہ واقع مکان سے باہتمام عبدالجلیل سید محمد اسماعیل مہتمم مطبع جولائی ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا۔

(۵) ''ہنر الفوائد'' آرہ سے ۳۱/مارچ ۱۸۶۷ء کو جاری ہوا۔ اختر شہنشاہی میں اس کے متعلق حسب ذیل اطلاع ملتی ہے۔

''ہنر الفوائد آرہ ضلع شاہ آباد سہ ماہی علمی رسالہ ۲۵/ورق اوسط بحکم ڈپٹی مولوی سید وارث علی خاں بہادر میر مجلس انجمن علمیہ مہتمم خواجہ سید فخر الدین سخن دہلوی وکیل عدالت دیوانی و سکریٹری انجمن علمیہ و بہ صحت سید فرزند احمد صفیر انڈر سکریٹری پرنٹر منشی کنج بہاری لال صاحب مختار از مطبع سنت پرشاد اجرائے ۳۱/مارچ ۱۸۶۷ء۔'' امداد صابری نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے۔

''اس رسالہ میں تاریخ' جغرافیہ' معاشی اور تہذیبی مضامین کے علاوہ تعلیم کی تبلیغ کرنے

تعلیم پر رغبت دلانے اور بیوہ عورتوں کی شادیاں کرنے کی تلقین کرنے کے لئے مضامین شائع ہوتے تھے اور انجمن علمیہ کی روداد شائع ہوتی تھی۔''

(۶) ''اخبار الاخبار'' مظفر پور سے ۱۵؍ستمبر ۱۸۶۸ء سے جاری ہوا۔ بہار کا یہ وہ خوش قسمت اخبار ہے جس کا ذکر مختلف کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔ پیش تر شمارے ۳۰×۲۴ س م کے ۱۶ صفحات پر مشتمل ہیں لیکن بعض شماروں میں صفحات کی تعداد میں کمی بیشی بھی نظر آتی ہے۔ سرورق کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اخبار صوبہ بہار کی سائنٹیفک سوسائیٹی کا ترجمان تھا اور مطبع چشمۂ نور قصبہ مظفر پور ضلع ترہت سے مہینے میں دو بار جاری ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے حساب لگائیں تو اس کے پہلے شمارے کی تاریخ اجراء ۱۵؍ستمبر ۱۸۶۸ء قرار پاتی ہے۔

(۷) ''چشمۂ علم'' پٹنہ سے یکم؍جنوری ۱۸۶۹ء کو جاری ہوا۔ دتاسی نے اس اخبار کا ذکر اپنے انیسویں خطبے میں کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

''چشمۂ علم' یہ پٹنہ سے اردو میں مہینے میں دو دفعہ نکلتا ہے۔ اس سے پہلے اس شہر میں کوئی اخبار نہ تھا۔ اس کی پہلی اشاعت یکم؍جنوری ۱۸۶۹ء کو شائع ہوئی۔ یہ چھوٹی تقطیع پر ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں۔'' اس کے اڈیٹر سورج مل صاحب بھی رہ چکے ہیں جو مدارس پٹنہ کے انسپکٹر تھے۔ علمی مضامین اس میں اکثر ترجمہ کر کے یا کتابوں سے نقل کر کے لکھے جاتے تھے۔''

(۸) ''گلدستۂ نظائر'' گیا سے ۱۸۷۱ء میں جاری ہوا۔ اختر شہنشاہی میں یہ اطلاع ملتی ہے مقام صاحب گنج ضلع گیا سے ماہوار ۱۲؍ورق، مالک بابو امیش چندر سرکار مطبع گلدستہ نظائر اجراء ۱۸۷۱ء۔'' اسی کو امداد صابری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔

(۹) ''شعاع مہر'' مظفر پور سے ۱۸۷۱ء میں جاری ہوا۔ صاحبِ اختر شہنشاہی لکھتے ہیں۔

''شعاع مہر مظفر پور بحکم عبدالرحیم ڈپٹی انسپکٹر مدارس و انڈر سکریٹری سائنٹفک سوسائیٹی بہار اجرائے ۱۸۷۱ء۔'' اس کے علاوہ اور کہیں سے کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ (۱۰) ''نادر الاخبار'' مونگیر سے ۱۸۷۲ء میں جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ ۸؍ورق اوسط، ہر چہار شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے

مالک منشی رام پرشاد صاحب دل شاد تھے۔ یہ اخبار مونگیر برہمو سماج کا آرگن تھا۔

(۱۱) ''ضیاء الابصار'' آرہ سے ۱۸۷۳ء میں جاری ہوا۔ یہ اخبار پھاٹک سادات بلگرامی ضلع شاہ آباد سے ہفتہ وار ۴؍ورق یوم شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک سید محمد ہاشم بلگرامی اور اڈیٹر سید فرزند احمد صفیر بلگرامی تھے۔

ان کے علاوہ جو اخبارات بہار سے نکلے وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱۲) ''اخبار انجمن'' پٹنہ مجاریہ ۸؍مارچ ۱۸۷۴ء۔ (۱۳) ''بہار پنچ'' پٹنہ مجاریہ ۲۴؍نومبر ۱۸۷۴ء۔ (۱۴) ''انیس بہار'' پٹنہ مجاریہ ۱۸۷۶ء۔ (۱۵) ''قاصد پٹنہ'' مجاریہ ۲؍جنوری ۱۸۷۶ء (۱۶) ''مجمع الفوئد'' مونگیر مجاریہ یکم جولائی ۱۸۷۶ء۔ (۱۷) ''نسیم'' سارن چھپرہ مجاریہ یکم؍ جنوری ۱۸۷۸ء۔ (۱۸) ''مشیر بہار'' پٹنہ مجاریہ ۷؍جنوری ۱۸۸۵ء۔ (۱۹) ''انڈین کرانیکل'' پٹنہ مجاریہ یکم جولائی ۱۸۸۱ء۔ (۲۰) ''شرف الاخبار'' بہار شریف مجاریہ ۴؍جنوری ۱۸۸۳ء۔ (۲۱) ''گلدستہ بہار'' بہار شریف مجاریہ ۲۷؍دسمبر ۱۸۸۳ء۔ (۲۲) ''مہر منور'' مظفر پور مجاریہ ۱۰؍جون ۱۸۸۴ء۔ (۲۳) ''نسیم سحر'' گیا مجاریہ جون ۱۹۰۱ء۔ (۲۴) ''تاج'' پٹنہ مجاریہ ۱۵؍دسمبر ۱۹۰۲ء۔ (۲۵) ''رفتار زمانہ'' پٹنہ یکم؍جنوری ۱۹۰۳ء۔ (۲۶) ''بہار اور دامن بہار'' پٹنہ مجاریہ جنوری ۱۹۰۴ء۔ (۲۷) ''شیعہ'' کھجوہ ضلع سارن مجاریہ جنوری ۱۹۰۴ء۔ (۲۸) ''الشّمس'' کھجوہ ضلع سارن ۱۹۰۶ء۔ (۲۹) ''بہار گزٹ'' بانکی پور پٹنہ مجاریہ مارچ ۱۹۰۹ء۔ (۳۰) ''معارف'' پھلواری شریف مجاریہ ۱۹۱۲ء۔ ان کے علاوہ چند ایسے اخبارات کے نام بھی سامنے آتے ہیں جن کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی مثلاً ''بہار پنچ'' گیا۔ ''بیباک'' پٹنہ۔ ''خورشید''۔ ''نور ایمان'' وغیرہ۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کا دور صرف صحافت ہی نہیں بلکہ اردو نثر کا دور زریں ہے۔ اس لئے کہ صرف ایک صوبہ سے اگر اتنے سارے اخبارات و رسائل جاری ہوئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ فہرست ابھی نامکمل ہے اور مزید تلاش و جستجو سے کام لیا جائے تو اس میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

شکیل احمد سلفی

اردو میڈیا: اعتبار ومعیار

بہار میں اردو صحافت کی صورتحال پہلے بھی غیر تشفی بخش نہیں تھی اور نہ آج ہے۔ ریاست کی اردو داں آبادی کے ایک بڑے طبقہ کے لئے خبروں کے حصول کا ذریعہ آج بھی اردو کا پرنٹ میڈیا ہے۔ آج بہار سے کئی اردو اخبارات نکل رہے ہیں اور ان کو ایک محدود دائرہ میں قاری بھی دستیاب ہیں جن میں سر دست قومی تنظیم، روزنامہ انقلاب، روزنامہ راشٹریہ سہارا، سنگم، پندار اور فاروقی تنظیم وغیرہ ہیں۔ یہ وہ اخبارات ہیں جو بازاروں، گھروں اور اردو داں افراد کے دفتروں میں دکھائی بھی دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی روزنامے ہیں جو شائع ہو رہے ہیں ان کو قاری کا حلقہ کس حد تک میسر ہے اس کا صحیح اندازہ تو سروے کے بعد ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جو اخبارات شائع ہو رہے ہیں وہ قاری کی دسترس میں ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ ریاست میں جو آبادی ہے اس تناسب سے ان اخبارات کو قاری کا جو حلقہ ملنا چاہئے وہ نہیں مل پا رہا ہے۔ اس کے لیے صرف اردو داں آبادی کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے بلکہ خود اخبارات کو بھی اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ صحافت اب مشن نہیں رہی بلکہ پیشہ ہوگئی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ

پیشے کے بھی اپنے کچھ تقاضے ہیں اور ہم ان تقاضوں کو پورا کر کے ہی اس میدان میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اردو میں صحافت کارپوریٹ گھرانوں کے علاوہ دیگر اداروں کے لیے کاروبار نہیں مشن ہے تو مشن کو تقاضوں کی بجا آوری سے دست بردار نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کے تقاضے کاروباری تقاضوں کے کہیں زیادہ سنگلاخ زمینوں کے سر کرنے کے مماثل ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کے بہت سے ادارے جو آج بھی دبے لفظوں میں ہی صحیح یہ کہنے پر مصر ہیں کہ وہ کاروبار نہیں مشن لئے ہوئے ہیں اور زبان کی بقا کے لیے سینہ سپر ہیں

، ان کے کاموں کو زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ روپے کے اعتبار سے وہ پوری طرح کاروباری نظر آتے ہیں لیکن عملاً نہ تو مشن کے تقاضے پورے کر رہے ہیں اور نہ ہی کاروباری تقاضے پورے کئے جا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو کے بیشتر اخبارات اس معیار کو نہیں حاصل کر پا رہے ہیں جو مقبولیت اور اعتبار کے لئے ضروری ہے۔

یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ اردو داں آبادی کا وہ طبقہ جو اردو اخبارات یا میڈیا کے بجائے ہندی اور انگریزی میڈیا سے رغبت رکھتا ہے کیا یہ اس کا اردو سے تنافر ہے یا اس کا کوئی اور سبب ہے۔ جائزہ لینے سے اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس کا انکار تو نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو احساس کمتری کا شکار ہے اور اردو کو پسماندگی کی علامت سمجھتا ہے۔ لیکن اس سے بڑا طبقہ وہ ہے جو خبر کو خبر کے طور پر لیتا ہے۔ چونکہ صحافت کے کاروباری ہونے کی وجہ سے معیار، انتخاب اور پیشکش ہر اعتبار سے دوسری زبانوں کی صحافت کاروباری تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دیگر زبانوں کے اخبارات کوشش کرتے ہیں خبریں تازہ ہوں اور انہیں جلد از جلد اپنے قاری تک پہنچائیں۔ کاروبار میں بازار کے ڈیمانڈ کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لئے دیگر زبانوں کے اخبارات قاری کے رجحان جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے مطابق مواد پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دیگر زبانوں کے اخبارات میں کوشش کی جاتی ہے کہ ہر شعبہ حیات سے متعلق خبروں کا احاطہ کیا جائے۔ اس کے لئے مختلف امور کے ماہرین کو ان امور کے خبروں کے حصول کے لیے رکھا جاتا ہے۔ ان میں جس شخص کے ذمہ جو محکمہ تفویض کیا جاتا ہے وہ اس محکمہ کی خبروں کے حصول میں سرگرداں رہتا ہے اور ان دفاتر سے کھوج کھوج کر خبریں نکالتا ہے۔ مسلسل اپنے کام میں لگے رہنے کی وجہ سے اس کی حس بھی بڑی تیز ہوتی ہے اور وہ اپنے مفوضہ محکمہ پر ایسی گہری نظر رکھتا ہے کہ کوئی بات معمول الگ ہوتی ہے اور وہ اس سے خبر نکال لیتا ہے۔

خبروں کے حصول اور پیش کش میں سب سے بنیادی فرق جو دیگر زبانوں کے اخبارات اور اردو کے اخبارات میں ہے وہ یہ ہے کہ اردو میں عام طور پر ایسے لوگ کام کرتے ہیں جن کے لیے

اخبار ثانوی پیشہ ہوتا ہے بلکہ اکثر لوگ اسے ذوق کی تسکین کا نام دیتے ہیں۔ ایسے میں وہ خبروں کے حصول میں وہ کوششیں صرف نہیں کرتے جو دیگر زبانوں کے اخبارات کے اخبار نویسوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ اردو میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ ایک ہی شخص قانونی امور کی خبروں کا احاطہ بھی کرے گا وہی انتظامی امور بھی دیکھے گا، وہی جرائم کی خبریں لائے گا اور اسی کی تعلیمی امور سے دلچسپی ہوگی اور وہی صحت کے محکمہ کے مسائل کو بھی جانے گا۔ حالانکہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص ہی تمام امور کا ماہر ہو۔ ایسا محسوس کیا جاتا ہے کہ افراد کی قلت کا باعث انہیں کم سے کم اعزازیہ کی ادائیگی کا رویہ ہے۔ پھر یہ کہ اردو میں بیشتر اخبارات کے نمائندے ایسے ہیں جو کل وقتی طور پر کسی دوسرے اخبارات میں ہوتے ہیں اور اردو اخبار کے صفحہ پر نام کا ستارہ ٹانکنے کے لیے اردو میں بھی وہی خبریں بھیج دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اخبارات کے بیشتر نمائندے ہندی میں لکھ کر بھیجتے ہیں اور اردو اخبارات کی میز پر ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

اعزازیہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں عمومی طور پر میڈیا کا زبردست المیہ ہے کہ جو دنیا بھر کے استحصال کا انکشاف کرتا ہے خود اس کے یہاں سب سے زیادہ استحصال اپنے عملہ کا ہوتا ہے۔ اردو اخبارات اس میں کچھ زیادہ ہی پیش پیش ہیں۔ اس کے نتیجہ میں باصلاحیت لوگ اس کی طرف رخ موڑنے سے گھبراتے ہیں۔

اردو اخبارات پر عموماً جذباتیت کا الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ جو کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جذباتی مسائل کو زیادہ ابھارتے ہیں۔ نتیجتاً قارئین کی ذہن سازی مثبت بنیادوں پر نہیں ہو پاتی اور اسی وجہ سے ان کی سوچ وفکر کا جذباتی مسائل سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ حالانکہ اخبارات کی مجبوری ہے کہ فطری طور پر وہ ان مسائل کو کو ہی سامنے لائیں گے جن کا تعلق ان کے قارئین سے ہے۔ تاہم مسائل سے نبردآزما ہونے کے لئے جو مثبت رویہ اختیار کیا جاتا ہے اس حوالہ سے کمزوری پائی جاتی ہے اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

اردو میڈیا کا ایک رخ الیکٹرانک میڈیا بھی قابل توجہ ہے۔ آج جبکہ الیکٹرانک میڈیا کی رسائی ملک کے شہری آبادی کے ۸۰ر فیصد سے زائد گھروں میں ہے اور دیہی حلقوں میں بھی کم وبیش

اس کی رسائی ہے۔ ٹی وی پر سینکڑوں ٹی وی چینل چل رہے جن میں دو درجن سے زائد نیوز چینل ہوتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا میں اردو چینل کی کی تعداد عمومی طور پر مایوس کن تو ہے ہی نیوز چینل کے اعتبار سے اور بھی مایوس کن ہے۔ ڈی ڈی اردو اور ای ٹی وی اردو اور عالمی سہارا جیسے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جانے والے اردو نیوز چینل کو چھوڑ کر اردو میں نیوز چینل کی بڑی کمی ہے۔ اس سے مایوس کن بات یہ ہے کہ اس کو دیکھنے والوں کی تعداد بھی اسی طرح کم ہے۔ اس میں بھی ناظرین سے زیادہ کمی خود چینل کی نظر آتی ہے۔ کیونکہ جب تک ان چینلوں پر کوئی نیوز آتی ہے تب تک وہ خبر پرانی ہو چکی ہوتی ہے۔

سطور بالا میں جن امور کی نشاندہی کی گئی ہے ان پر توجہ کر کے اور ان کمیوں کو دور کر کے اردو اخبارات کے اعتبار ومعیار کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ کوئی شک نہیں ہے کہ اردو داں طبقہ خریدنے اور پڑھنے کا رجحان ذرا کم ہے تاہم اخبارات کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایماندانہ کوشش کی جائے اور انہیں دیگر زبانوں کے اخبارات کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ قارئین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور قارئین کا وہ طبقہ جو اعلیٰ معیار کا طالب ہے اور اسی لئے دوسری زبانوں کے اخبارات پڑھتا ہے وہ بھی اپنی زبان کے اخبارات سے جڑ جائے گا۔ اس سلسلہ میں اگر اخبارات کے مالکان اپنی ذمہ داری سمجھیں اور ساتھ ہی اردو کی انجمنیں اور تنظیمیں بھی سرگرم ہوں تو حالات بدل سکتے ہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆☆☆

شاہد الاسلام

بہار میں اُردو صحافت کا عصری منظر نامہ

دورِ حاضر کے روزنامہ اخبارات کے تناظر میں

بہار میں اردو صحافت کا عصری منظر نامہ بڑا دلفریب ہے۔ ایک طرف سرکاری اعداد و شمار کو دیکھ کر خوشی سے دل مچل اُٹھتا ہے تو دوسری جانب زمینی حقیقت پر نگاہ پڑتے ہی احساس کرب سے بھی گزرنا پڑ جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اُس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک کہ بہار کی اردو صحافت کے عصری منظر نامہ کا جائزہ نہ لے لیا جائے۔

اِس وقت دو 'کارپوریٹ' کہلانے والے میڈیا گھرانوں کے اخبارات 'روزنامہ انقلاب' اور 'روزنامہ راشٹریہ سہارا' کے علاوہ انفرادی کوششوں کے تحت کوئی 46 اردو اخبارات بہار کی اردو صحافت کے کارواں کو آگے بڑھا رہے ہیں لیکن بہار کی وادئ اردو صحافت میں پھر بھی **'گلشنِ بہار'** کی تلاش مشکل دکھائی دے رہی ہے۔ صرف اِس وجہ سے نہیں کہ یہاں معیاری اردو صحافت بالکل بھی فروغ نہیں پا رہی ہے بلکہ اِس بناء پر بھی بہ حیثیت زبان یہاں جس انداز میں اردو کا ارتقا دیکھنے کو مل رہا ہے، وہ بھی محبانِ اردو کیلئے سامان اذیت سے کم نہیں ہے کیوں کہ خبروں میں بہ طور خاص نہایت مکروہ و ناقص زبان استعمال ہو رہی ہے جو فی الواقع اردو زبان کی شکل و شباہت کو بگاڑ کر رکھ دینے کا بھی ذریعہ کہلا سکتی ہے۔

حال کے 10 برسوں کے درمیان اردو صحافت کو جدید ترین سہولیات سے آراستہ کرنے کی کوشش تو خوب خوب ہوئی، لیکن تلخ سچائی یہ بھی ہے کہ صحت زبان کا خیال نہ رکھ پانا اور سچی و پکی خبروں کی ترسیل کی بجائے مصلحت پسندی سے کام لینا یہاں کی اردو صحافت کی عام سی روش بھی بن گئی۔ نتیجتاً اعلیٰ صحافتی اقدار کا خیال نہ رکھنا اور صحافت کی حقیقی غرض و غایت کی پاسداری نہ کرنا اردو صحافت کا عمومی مزاج قرار پا گیا لیکن خاص بات یہ بھی ہے کہ تمام طرح کی فنی، فکری اور معیاری خامیوں کے باوجود اُردو صحافت یہاں خوب پھل پھول رہی ہے اور یہ بھی کہ بہار کے اردو

اخبارات نے اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے حوالہ سے بعض اچھی کوششیں کی ہیں۔ نتیجتاً قارئین کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ یوں بہار میں اردو صحافت اکیسویں صدی کی ڈیڑھ دہائی مکمل کر لینے کے بعد ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے، جہاں اردو صحافت کے وجود کو اربابِ اقتدار کے ذریعہ نظر انداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہنا درست ہوگا کہ بہار میں اردو صحافت قومی زبان ہندی کی صحافت کے بعد سب سے موثر کردار نبھا رہی ہے۔

بہار کی اردو صحافت کے عصری منظر نامہ پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑانے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت کا سفر یہاں تین متوازی خطوط پر آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک طرف ریاست کے وہ اردو اخبارات ہیں جو انفرادی یا شخصی کوششوں کے تحت منظر عام پر آ رہے ہیں اور اردو صحافت کے عصری منظر نامہ میں مناسب مقام حاصل کرنے کی جستجو میں ہیں۔ دوسری جانب کارپوریٹ کہلانے والے میڈیا گھرانہ سے تعلق رکھنے والے وہ اخبارات ہیں جن کی سرپرستی ملک کے دو معروف میڈیا گھرانوں کی جانب سے کی جا رہی ہے۔ بڑے میڈیا گھرانوں سے متعلقہ اردو اخبارات اپنے جملہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ریاست میں اردو صحافت کی نشو و نما کو نیا سمت دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہار میں مذکورہ دونوں خطوط پر جس طرح اردو صحافت آگے بڑھ رہی ہے، وہ اپنی جگہ، اردو صحافت کی وہ کالی بھیڑیں بھی یہاں موجود ہیں، جنہیں نہ تو اردو صحافت کی نشو و نما سے کوئی سروکار رہے اور نہ ہی اردو زبان کی خدمت اور اس کے فروغ سے کوئی تعلق۔ بلکہ اردو صحافت کا تیسرا طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جو اردو صحافت کو رسوا اور بدنام کرنے کیلئے کوئی بھی دقیقہ باقی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یہ وہی طبقہ ہے جو اشتہارات کے حصول کیلئے ظاہری طور پر اردو صحافت کو گلے لگائے ہوئے ہے مگر بہ لحاظ باطن اردو صحافت کے فروغ سے ایسے طبقہ کو کوئی لینا دینا نہیں۔ ملک کی دوسری ریاستوں کی طرح ہی بہار میں بھی فائل کاپیوں کی شکل میں اردو صحافت کی صحت کو بڑھانے والے لوگ حالیہ دنوں میں نہایت تیزی کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے بظاہر یہ پیغام تو ابھرتا ہے کہ اردو صحافت کی توسیع خوب خوب ہو رہی ہے لیکن گہرائی میں اتر کر دیکھنے اور حقیقی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت کو گود لینے کی یہ کوشش اُس خوفناک

صورتحال کا اشاریہ ہے جو درحقیقت کاغذی اعتبار سے اردو صحافت کی صحت کو تو آگے بڑھا رہی ہے لیکن حقیقی معنوں میں اردو صحافت کی نشوونما سے اس کا کوئی سروکار نہیں ۔ بجائے اس کے کہ تینوں متوازی نوعیت کے اخبارات کی نشان دہی کی جائے، بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہار سے منظر عام پر آنے والے اخبارات کی فہرست کو یہاں شامل تحریر کرلیا جائے جنہیں ڈی اے وی پی کے اشتہاراتی پینل میں جگہ ملی ہوئی ہے، تاکہ ہرکسی کیلئے یہ اندازہ لگا پانا ممکن ہوجائے کہ بہار سے کون کون سے اردو اخبارات منظر عام پر آرہے ہیں اور اپنے دعوؤں کے مطابق ان کی تعداد اشاعت کیا ہے اور یہ بھی کہ اِن میں سے کتنے اخبارات ایسے ہیں، جن کی کبھی بھی زیارت کا بہار کے قارئین کو بھی اتفاق نہ ہوسکا ہے۔

ڈی اے وی پی کے اشتہاراتی پینل میں شامل بہار کے اخبارات

نمبر شمار	اخبار کا نام	تعداد اشاعت	مقام اشاعت
1	دیش بدیش	68015	بھاگلپور
2	میزائل ایکسپریس	35100	بھاگلپور
3	گرم ہوا	69150	مظفرپور
4	تاثیر	38225	مظفرپور
5	حقیقت ٹائمز	32058	مظفرپور
6	سیاسی تنظیم	27200	مظفرپور
7	اردو آکاش	23400	مظفرپور
8	سیاسی پیغام	2909	نالندہ
9	قومی تنظیم	75000	پٹنہ
10	پندار	74882	پٹنہ
11	فاروقی تنظیم	73635	پٹنہ
12	سنگم	68525	پٹنہ
13	ہمارا سماج	68287	پٹنہ
14	انقلاب جدید	68015	پٹنہ
15	ان دنوں	60000	پٹنہ
16	ایک قوم	58936	پٹنہ
17	روزنامہ راشٹریہ سہارا	58339	پٹنہ
18	بھویشیاواک	57783	پٹنہ
19	پیاری اردو	55100	پٹنہ
20	المومن	53750	پٹنہ
21	تاثیر	52625	پٹنہ
22	امین	48786	پٹنہ
23	امن چین	48250	پٹنہ
24	تفہیم	47450	پٹنہ
25	مثلث	47375	پٹنہ
26	قراءتنظیم	46800	پٹنہ
27	نوید صبح	46225	پٹنہ
28	عوامی تنظیم	40600	پٹنہ
29	صدائے وطن جدید	39908	پٹنہ
30	دور جدید	38806	پٹنہ
31	سفینہ	37000	پٹنہ
32	عالمی درپن	36725	پٹنہ
33	روشنی زندگی	32500	پٹنہ
34	ہمارا نعرہ	29320	پٹنہ

35	جسارت بہار	28152	پٹنہ
36	خواب کی منزل	26700	پٹنہ
37	عوامی نیوز	26550	پٹنہ
38	گھر گھر کی آواز	25400	پٹنہ
39	آغاز اور انجام	18525	پٹنہ
40	پیاری تنظیم	25200	پٹنہ
41	قومی رہبر	25000	پٹنہ
42	صدائے عوام	24990	پٹنہ
43	آواز بہار	23600	پٹنہ
44	قومی دنیا	21000	پٹنہ
45	نور ہند	15450	پٹنہ
46	ارلی مورننگ	13566	پٹنہ
47	ہندوستان ایکسپریس	7712	پٹنہ
48	حالات بہار	61025	سمستی پور

ڈی اے وی پی کے اشتہاراتی پینل میں شامل 48 اردو اخبارات میں سے ایک اندازے کے مطابق تقریباً 3 درجن اردو روزناموں کی حالت یہ ہے کہ اُن کی زیارت بھی عام قارئین کیلئے مشکل ہے چہ جائیکہ وہ اِن روزناموں کے مستقل خریدار ہوں۔ البتہ بہار کے تقریباً درجن بھر اردو اخبارات ایسے ضرور ہیں، جنہیں بازار عام میں دیکھا، خریدا اور پڑھا جاسکتا ہے، جن میں روزنامہ انقلاب اور روزنامہ راشٹریہ سہارا کے علاوہ روزنامہ قومی تنظیم، پندار، انقلاب جدید، فاروقی تنظیم ،سنگم، ہمارا سماج ،امین اور تاثیر قابل ذکر ہیں۔ بہار میں اردو صحافت کا سب سے بڑا مرکز عظیم آباد ہے ،جسیا ب پٹنہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہار سے منظر عام پر آنے والے 48 میں سے 39 روزناموں کی اشاعت یہیں سے ہورہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اِن 39 میں سے بہ مشکل

درجن بھر اردو اخبارات ہی ایسے ہیں، جن کی کاپیاں عام اردو قارئینک پہنچ پاتی ہیں، باقی ماندہ اخبارات فائل کی زینت بن رہے ہیں یا جنہیں دیکھنے اور پڑھنے کیلئے ہماری آنکھیں ترس رہی ہیں!۔

ویسے تو بہار سے انقلاب اور راشٹریہ سہارا کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوجانے کے بعد قارئین کیلئے یہ آسان ہوگیا ہے کہ وہ اپنی پسند کے اردو اخبارات خریدار یں، لیکن بہار کی اُردو صحافت سے متعلق ایک حالیہ سروے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دو بڑے اداروں کے اخبارات کی موجودگی کے باوجود روزنامہ 'قومی تنظیم' عوام کے درمیان زیادہ مقبول و معروف بھی ہے اور لوگ اِسے متذکرہ دونوں بڑے اداروں کے اخبارات سے زیادہ خریدتے اور پڑھتے بھی ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک 'حیران کن' صورتحال ہے کہ کارپوریٹ گھرانوں سے متعلقہ ایک نہیں بلکہ دو دو اخبارات کی موجودگی کے باوجود یک نفری خطوط پر منظر عام پر آنے والا ایک اردو اخبار بہار کی اردو صحافت کے حوالہ سے'' سکہ رائج الوقت'' کا درجہ بھی رکھتا ہے!۔ قومی تنظیم کو اس معاملہ میں اولیت کا درجہ کیوں حاصل ہے؟ اس سوال کا سیدھا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ بہار کے اردو قارئین کو یہ اخبار زیادہ پسند ہے۔ 'قومی تنظیم' کی اشاعت کا آغاز 1959 میں دربھنگہ سے 15 روزہ اخبار کی شکل میں ہوا تھا۔ اخبار کے بانی ایڈیٹر سید محمد عمر فرید تھے۔ 1965 میں 'قومی تنظیم' کا دفتر پٹنہ منتقل ہوا۔ اسی سال اخبار ہفت روزہ میں بدل گیا اور 1965 سے فروری 1975 تک ہفتہ وار کی شکل میں اس کی اشاعت جاری رہی۔ مارچ 1975 سے 'قومی تنظیم' نے روزنامہ کی شکل میں خود کو پیش کیا۔ ابتدا میں یہ روزنامہ صرف دو صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا پھر چار صفحات کا اخبار منظر عام پر آنے لگا ۔اس کے بعد اس کی ضخامت بڑھتی چلی گئی۔ آج کی تاریخ میں یہ اخبار 12 سے 16 صفحات پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔ 'قومی تنظیم' کی بہ ظاہر ایک خوبی یہ کہلاسکتی ہے کہ اس روزنامہ نے بدلتے تقاضوں کا خاص خیال رکھنے کی کوشش کی۔

اِس ضمن میں مرحوم سید محمد اجمل فرید کی مخلصانہ کوششوں کی تعریف نہ کرنا بڑی زیادتی ہوگی، جنہوں نے 35-30 برسوں کے اپنے دورِادارت میں ادارہ قومی تنظیم کو نہ صرف یہ کہ جدید

سہولیات سے آراستہ کرنا لازمی سمجھا بلکہ انہوں نے قارئین سے براہ راست ربط بنانے اور اُن کی پسند وناپسند کا خاص خیال رکھنے کا ایک عمومی مزاج بھی ادارہ قومی تنظیم کے اندر متعارف کرایا۔ یوں اُن کے دورِادارت میں 'قومی تنظیم' سے عام قارئین کا کچھ ایسا رشتہ قائم ہوگیا، جسے توڑ پانا نہ تو پہلے روز نامہ راشٹریہ سہارا کیلئے ممکن ہوسکا اور نہ ہی بعدہٗ روز نامہ انقلاب کیلئے۔ البتہ دو بڑے میڈیا گھرانوں سے متعلقہ اردو اخبارات کی اشاعت کے آغاز کے بعد 'قومی تنظیم' کیلئے مسابقہ کا ایک ایسا دور ضرور شروع ہوگیا جسے 'مجاہدہ' یا 'آزمائش' کا دور کہنا غلط نہ ہوگا۔

مشاہدین کہتے ہیں کہ 'انقلاب' اور 'راشٹریہ سہارا' کے منظر عام پر آنے کے بعد بہار میں اردو صحافت کو برق رفتاری حاصل ہوئی۔ 'راشٹریہ سہارا' اور 'انقلاب' کی آمد سے قبل تک روز نامہ 'قومی تنظیم' واحد اردو اخبار تھا جو بہار کے تمام اضلاع میں اپنی ترسیل کو یقینی بنا رہا تھا۔ مذکورہ دونوں اخبارات کے منظر عام پر آنے کے بعد صحت مند مسابقہ کا دور شروع ہوا، جس کی بنا پر قومی تنظیم کیلئے بھی اپنی ساکھ کو برقرار رکھنا اور مسابقہ کے عمل میں شریک سفر ہونا ضروری ہوگیا۔ نتیجہ یہ سامنے آرہا ہے کہ خوب سے خوب تر کی جستجو بھی شروع ہوگئی اور یوں بہار کی اردو صحافت میں تغیر وتبدل کی بعض بے نظیر کوششیں بھی دیکھنے کو مل رہی ہیں۔

بہار میں اردو اخبارات کی ترسیل واشاعت کی صورتحال کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ عظیم آباد اور قرب وجوار کے شہروں تک اردو کے درجنبھر اخبارات کی ترسیل عمل میں آرہی ہے، جبکہ زیادہ تر اضلاع میں قومی تنظیم، راشٹریہ سہارا اور انقلاب کے علاوہ ایک یا دو روز نامہ اخبارات ہی پہنچ پا رہے ہیں۔ بہار کے زیادہ تر ضلعوں میں قومی تنظیم، انقلاب اور راشٹریہ سہارا کے ہی زیادہ خریدار بھی ہیں، جبکہ کچھ ضلعوں میں روز نامہ امین، روز نامہ فاروقی تنظیم کو دیکھا اور خریدا جاسکتا ہے، بعض ضلعوں میں روز نامہ پندار کی کاپیاں محدود تعداد میں پہنچ رہی ہیں، کہیں کہیں روز نامہ تاثیر اپنی موجودگی درج کرا رہا ہے۔ پٹنہ میں اردو کے جو اخبارات مختلف ترسیلی مراکز پر اپنے وجود کا باضابطہ احساس دلا رہے ہیں ان میں انقلاب، راشٹریہ سہارا اور قومی تنظیم کے علاوہ سنگم، پندار، انقلاب جدید، امین، فاروقی تنظیم، ہمارا سماج، دورجدید اور سنگم قابل ذکر ہے۔ حالانکہ

ان میں سے کم از کم تین اخبارات یعنی ہمارا سماج، دورجدید اور سنگم چند ترسیلی مراکز تک ہی محدود ہے۔ البتہ پندار، انقلاب جدید، امین اور فاروقی تنظیم وہ اخبارات ہیں جو پٹنہ اور مضافات کے علاقوں میں بہ اہتمام شائع ہوکر قارئین کے درمیان اپنی ترسیل کو یقینی بنانے میں کسی حد تک کامیاب ہیں۔ جہاں تک متذکرہ اخبارات کے وسائل اور نظام ترسیل کا تعلق ہے تو یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ قومی تنظیم اور فاروقی تنظیم کے علاوہ امین اور پندار ترسیل کے باضابطہ نظام سے آراستہ اخبارات ہیں۔ حالانکہ ان اخباروں کے درمیان سہولیات کی فراہمی کے معاملہ میں مسابقہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ہر ایک اخبار کی صورتحال الگ الگ دیکھنے کو ملتی ہے۔

یک نفری خطوط پر منظر عام پر آنے والے اردو اخبارات کی طویل فہرست کے درمیان قومی تنظیم وہ واحد اخبار ہے جسے تمام تر جدید سہولیات سے آراستہ روز نامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ اخبار گو کہ صرف پٹنہ سے ہی شائع ہوکر بہار کے تمام اضلاع میں اخبارات کی ترسیل کو یقینی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ البتہ علاحدہ علاحدہ خطوں کیلئے اس اخبار نے الگ الگ ایڈیشن کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے، جس کی وجہ سے علاقائی خبروں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں ترسیلی امور میں ایسا کرنے سے آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ قومی تنظیم فی الوقت پورے بہار کا احاطہ کرنے کیلئے اپنے اخبار کے کبھی چار تو کبھی پانچ ایڈیشن شائع کر رہا ہے۔ عموماً اخبار کا پہلا ایڈیشن شام کے سات بجے تیار ہوجاتا ہے جبکہ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت تقریباً نو بجے عمل میں آتی ہے۔ تیسرا اور چوتھا ایڈیشن ایک ایک گھنٹہ کے وقفہ سے شائع ہوتا ہے جبکہ اخبار کا آخری ایڈیشن رات کے دو بجے منظر عام پر آتا ہے۔ ہندی صحافت کی طرز پر قومی تنظیم نے مختلف ایڈیشنوں کا سہارا لیتے ہوئے علاقائی خبروں کیلئے فراخدلی دکھانے کی کوشش کی ہے جس کی بناء پر اردو قارئین کے درمیان بہار کا یہ واحد اردو اخبار ہے جو علاقائیت کو پیش نظر رکھ کر اپنی ترسیل کو یقینی بنانے کی کامیاب کوشش کر رہا ہے۔ 12 صفحات پر مشتمل اخبار کے چار سے چھ صفحات بہر حال ایسے ہوا کرتے ہیں جنہیں علاقائی زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ وہ صفحات ہوا کرتے ہیں جو الگ الگ خطوں کیلئے الگ الگ انداز میں تیار کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو اخبار مونگیر، لکھی سرائے،

بھاگلپور اور صاحب گنج وغیرہ علاقوں کیلئے شائع ہوتا ہے، اس میں مذکورہ ضلعوں کے صفحات شامل اشاعت ہوا کرتے ہیں۔ جب یہی اخبار مشرقی بہار کیلئے اپنا ایڈیشن شائع کرتا ہے تو مونگیر، بھاگلپور اور صاحب گنج وغیرہ اضلاع کی جگہ پورنیہ، کشن گنج، ارریہ، سہرسہ، کھگڑیا، بیگوسرائے وغیرہ کی بھر پور نمائندگی کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی ان اضلاع کیلئے مقامی نوعیت کے صفحات شامل اخبار ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح جب اخبار کا دوسرا ایڈیشن دربھنگہ، سمستی پور، مظفر پور، مدھوبنی وغیرہ خطوں کیلئے منظر عام پر آتا ہے تو ان علاقوں کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ یعنی علاقائیت کو گلے لگاتے ہوئے قارئین کے درمیان خود کو مقبول ومعروف قرار دلانے کیلئے قومی تنظیم نے جو صحافتی حکمت عملی اپنائی ہے، اس کا بہار میں فی الوقت کوئی ثانی نہیں۔ راشٹریہ سہارا بھی نہیں بلکہ یوں کہئے کہ بیک وقت بہار کے تین شہروں سے اپنی طباعت کو یقینی بنانے والا اخبار انقلاب بھی اس صورتحال کا مقابلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہے۔

یہی وہ انفرادی خوبی ہے جو قومی تنظیم کو ریاست کے تمام دوسرے اردو اخبارات سے منفرد بناتی ہے۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ قومی تنظیم نے وقائع نویسوں اور نامہ نگاروں کا ایک ایسا مضبوط نیٹ ورک قائم کر رکھا ہے، جسے حیران کن قرار نہ دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں ایک عدد وقائع نویس یا نامہ نگار کا تقرر کافی کہلا سکتا ہے، وہاں اس اخبار نے غیر معمولی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین تین نامہ نگار مقرر کر رکھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ قومی تنظیم میں علاقائی خبروں کی غیر معمولی کثرت دیکھنے کو ملتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اضلاع، سب ڈویژن یا بلاک کی سطح پر بڑی تعداد میں نامہ نگاروں کی ماموری کو یقینی بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، بلکہ ایسے قصبوں اور گاؤں میں بھی اخبار ہذا نے نامہ نگار بٹھا رکھے ہیں جن کے ذریعہ گلیوں، محلوں، چوپالوں، چائے خانوں اور عوامی مراکز سے متعلقہ سرگرمیوں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ نتیجتاً مقامی نوعیت کی خبریں اس قدر سامنے آجاتی ہیں، جنہیں شامل اشاعت کرنا آسان نہیں کہلا سکتا۔ دشواری یہ بھی ہے کہ علاقائی صفحات کی تیاری کے دوران کس علاقہ کی خبر کو کس قدر اہمیت دی جائے اور کسے نہیں؟ پٹنہ کے مرکزی کیلئے یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں۔ پٹنہ میں برسر خدمت معاون مدیروں کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس نزاکت کو

اچھی طرح سمجھ سکیں، لہٰذا اخبار نے علاقائی سطح پر صفحات کی تیاری کیلئے مختلف علاقوں میں اپنے خصوصی مراکز قائم کر رکھے ہیں، جہاں علاقائی نوعیت کی خبریں مقامی نامہ نگاروں کے ذریعہ ارسال کی جاتی ہیں اور انہی علاقائی دفاتر میں اس نوعیت کی خبروں کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور پیج میکنگ کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ علاقائی صفحات کی تیاری کیلئے قومی تنظیم نے جو حکمت عملی وضع کی ہے، وہ کئی لحاظ سے قابل رشک ہی نہیں بلکہ دوسرے اردو اخبارات کیلئے قابل تقلید بھی ہے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تھوڑی جھلک یہاں پیش کر دی جائے تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ قومی تنظیم کی اشاعت وطباعت کس نہج پر عمل میں آرہی ہے اور یہ بھی سمجھنا آسان ہو جائے کہ کن نسخوں کو بروئے کار لانے کی وجہ سے یہ اخبار بہار کے اردو قارئین کے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے!۔

علاقائی صفحات کی تیاری کیلئے قومی تنظیم نے مختلف اضلاع میں اپنے دفاتر قائم کر رکھے ہیں۔ ان دفاتر میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور کمپوٹر آپریٹر کی سہولت موجود ہوتی ہے۔ جو سینئر وقائع نویس یا نامہ نگار ہوا کرتے ہیں انہیں علاقائی دفاتر کا نگراں بنا دیا جاتا ہے۔ اب یہ نگراں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی نگرانی میں علاقائی دفتر کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ مثال کے طور پر بیگوسرائے ، دربھنگہ اور گیا جیسے شہروں میں قومی تنظیم کے علاقائی دفاتر قائم ہیں۔ کل تک بیگوسرائے کے علاوہ دربھنگہ، مظفر پور، کھگڑیا، سہرسہ، پورینہ، آرریہ اور کشن گنج وغیرہ اضلاع کے نامہ نگاروں کو راست طور پر خبریں پٹنہ کے دفتر کو ارسال کرنا پڑتی تھیں۔ اب یہ نامہ نگار علاقائی دفاتر کو خبریں بھیجتے ہیں، کیونکہ صفحہ سازی کے جملہ عوامل ان ہی علاقائی دفاتر میں انجام پاتے ہیں۔

گویا ایک طرح سے قومی تنظیم نے مرکزی دفتر کے بوجھ کو کم کرنے اور علاقائی دفتر پر زیادہ سے زیادہ منحصر ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس سے بعض بڑے فائدوں کے ساتھ کچھ غیر معمولی نقصانات بھی جھیلنے پڑ رہے ہیں۔ علاقائی سطح پر 'قومی تنظیم' کے ذریعہ دفاتر کے قیام سے ایک بڑا فائدہ اخبار کو یہ حاصل ہو رہا ہے کہ مقامی نوعیت کی چھوٹی اور بڑی تمام تمام نوعیت کی خبریں اہتمام کے ساتھ شائع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح قارئین کی جانب سیمنا سب انداز میں مقامی خبروں کو شامل اشاعت کرنے کے حوالہ سے موصول ہونے والی شکایات کو دور کرنے کی سبیل نکل آئی ہے

جو برسوں سے ذمہ داران اخبارات تک پہنچائی جاتی رہی تھی۔ علاقائی سطح پر دفاتر کے قیام اور مقامی سطح پر صفحہ سازی کا ایک بڑا فائدہ کاروباری طور پر بھی اخبار ہذا کو مل رہا ہے۔ اشتہارات کے حصول اوراس کی اشاعت کی رفتار بھی اسی طرح بڑھی ہے جس طرح خبروں کی اشاعت کے سلسلے دراز ہوئے ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ خبروں کی اشاعت کی کوشش اس لحاظ سے نقصاندہ یاضرررساں ثابت ہورہی ہے کہ اخبار کا معیار علاقائی صفحات کی تیاری کے درمیانبطور خاص گرگیا ہے!۔

دراصل واقعہ یہ بھی ہے کہ معاون مدیروں کی عدم موجودگی میں علاقائی دفاتر میں صفحہ سازی کا عمل انجام پاتا ہے۔ جو سینئر صحافی حضرات ضلعوں کے دفاتر میں دستیاب ہیں، اُن کی ہی سرپرستی میں علاقائی دفاتر کام کرتا ہے۔ دشواری یہ بھی لاحق ہوا کرتی ہے کہ اِن سینئر مقامی صحافیوں کے دفاتر میں موجود رہتے ہوئے صفحہ سازی کو انجام تک پہنچانا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ سینئر صحافی کو چونکہ مقامی سرگرمیوں پر بھی نگاہ رکھنا ہوتی ہے اور ساتھ ہی خبر نگاری کی ذمہ داری بھی انہیں ہی نبھانی ہوتی ہے، لہٰذا ایسے مواقع پر جبکہ سینئر صحافی دفتر میں موجود نہیں ہوا کرتے ،بعض اوقات جونیئر صحافی اور آپریٹر کے اشتراک سے علاقائی صفحات تیار کئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ کبھی کبھی بڑی اور زیادہ اہمیت کی حامل خبریں نظرانداز ہوجاتی ہیں اور ایسی خبروں کو جنہیں علاقائی زبان میں ''ناشتہ جاتی'' خبر کہا جاتا ہے، انہیں بہ اہتمام شامل صفحہ کرلیا جاتا ہے۔ یہعلاقائی دفاتر مرکزی دفتر سے مربوط ہیں، لہٰذا صفحات کی تیاری کے بعد الگ الگ جگہوں سے اِن کی پٹنہ منتقلی کیلئے اوقات بھی متعین ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات سینئر صحافی کی عدم موجودگی میں ہی صفحات تیار بھی ہوتے ہیں اور پھر ان کی منتقلی بھی عمل میں آجاتی ہے۔ چنانچہ اگر پٹنہ میں معاون مدیروں میں سے کسی نے ایسے صفحات پر نظر ثانی کی زحمت کی، جب تو ناہمواریاں اور غلطیاں دور ہوجایا کرتی ہیں اور اگر نظر ثانی کا موقع نہ ملا یا کسی نے نظر ثانی کا بوجھ برداشت نہ کیا تو پھر ایسی صورت میں علاقائی صفحات اردو صحافت کو منھ چڑھاتے نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ علاقائی دفاتر میں معاون مدیروں کی عدم موجودگی میں صفحہ سازی کا عمل اُسی وقت صحیح طریقہ سے انجام پاسکتا ہے یا پاتا ہے، جبکہ کمپوٹر

آپریٹر تجربہ کار ہو اور خبروں کی اہمیت کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت سے بھی متصف۔ کچھ علاقوں میں تیار ہونے والے علاقائی صفحات اسی طرح منظر عام پر آرہے ہیں، جن میں کمیاں کم دکھائی دیتی ہیں لیکن زیادہ تر علاقوں میں تیار ہونے والے علاقائی صفحات ازخود اس کی گواہی دے رہے ہیں کہ کس طرح معیاری لحاظ سے اردو صحافت ان علاقوں میں اپنی مٹی آپ پلید کررہی ہے!۔

قصہ مختصر یہ کہ علاقائی خطوط پر دفاتر کو متحرک اور فعال کرنے کی کوشش قارئین تک زیادہ سے زیادہ خبریں پہنچانے کے حوالہ سے مفید تو ثابت ہورہی ہے لیکن صحافتی بے اعتدالیاں، ناہمواریاں اور بڑی سے بڑی غلطیاں بھی ساتھ ساتھ سرزد ہورہی ہیں، جنہیں دور کرپانا ناممکن ہوکر رہ گیا ہے ۔ضرورت اس امر کی ہے کہ علاقائی دفاتر میں کم از کم ایک عدد تجربہ کار معاون مدیر کے تقرر کو بھی یقینی بنایا جائے تاکہ زبان وبیان اور انداز پیشکش میں سنجیدگی آسکے لیکن ستم ظریفی کہہ لیجئے کہ اِس ضمن میں کسی طرح کی پیش رفت نہیں ہوسکی ہے۔ علاقائی دفاتر میں تیار ہونے والی خبروں کے بعض نمونوں کو یہاں شامل اشاعت کرنا ضروری سمجھا جارہا ہے، تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ان دفتروں میں جو خبریں تیار ہورہی ہیں، اُن کی زبان کیسی ہے، بیانیہ کا انداز کیا ہے اور لب ولہجہ میں کس حد تک شائستگی پائی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جس طرح کی زبان اور جس طرح کا بیانیہ بیگوسرائے کے علاقائی دفتر میں رواج پارہا ہے، وہی انداز اور وہی اسلوب بیان گیا کے دفتر کا بھی ہو یا ایسی ہی زبان دربھنگہ کے دفتر میں بھی فروغ پارہی ہو۔ اس کے باوجود بعض خبروں کا نمونہ یہاں اس وجہ سے پیش کیا جارہا ہے تاکہ خبروں کی زبان کے حوالہ سے حقیقی صورتحال کی ایک جھلک سامنے آسکے۔

بیگوسرائے کے علاقائی دفتر میں تیار ہونے والے مقامی صفحہ میں 12 جون 2014 کو شامل اشاعت ایک خبر کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ ہو، جس میں تعلیم کے شعبہ میں پائی جانے والی بدحالی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

خبر کی سرخی کچھ یوں ہے:

نہ کتاب، نہ ٹیچر نہ اسکول پھر بھی تعلیم یافتہ سماج میں تیزی سے ہورہا ہے اضافہ

خبر کچھ یوں لکھی گئی ہے:

''بیگوسرائے (محفوظ الرشید) بیگوسرائے ضلع کو مالی طور سے کافی مضبوط مانا جاتا ہے۔مگر یہاں پر تعلیمی معیار کی کافی کمی دیکھی جا رہی ہے۔ٹائیلنٹ سرچ کے لئے مختلف اداروں کے ذریعہ منعقد کی جانے والے امتحانات میں اس کا بار بار خلاصہ ہو رہا ہے۔اس کے بعد بھی محکمہ ایجوکیشن اس جانب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی ہے۔حال میں ضلع میں نئے ایجوکیشن آفیسر کے طور پر رتیش کمار جھا سمیت سبھی نئے ڈی پی او نے عہدہ سنبھالا ہے۔جس سے ضلع کے لوگوں کو کافی امیدیں ہیں۔

سات لاکھ بچوں کو پڑھانے کے لئے صرف بارہ ہزار ہیں ٹیچر

اگر ضلع میں پرائمری اور مڈل سطح کے تعلیم کا جائزہ لیں تو واضح ہوگا کہ ضلع میں سات لاکھ سے زائد بچوں کو پڑھانے کے لئے صرف بارہ ہزار سات سو ٹیچر تعینات ہیں۔ جس سے تعلیمی معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ایسے میں مدرسین بچوں کو کس طرح تعلیم دیتے ہوں گے۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ ضلع میں پرائمری و مڈل سطح کے کل 1536 اسکول ہیں جس میں 148 ایسے اسکول ہیں جن کے پاس آج تک اپنی بلڈنگ بھی نہیں ہو سکی ہے۔اس کے علاوہ جبکہ نویں سے بارہویں درجہ تک کے اسکولوں کی تعداد 75 ہے جس میں تقریباً بارہ ہزار بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔وہیں ڈگری کالجوں کی تعداد پانچ سرکاری و دو غیر سرکاری یعنی سات ہے۔جس میں لگ بھگ پچاس ہزار بچے زیر تعلیم ہیں۔

جہاں بچے ہیں وہاں ٹیچر نہیں اور جہاں ٹیچر ہیں وہاں بچے نہیں

ضلع میں سینکڑوں ایسے اسکول ہیں جہاں پر مدرسین کی تعداد اٹھارہ سے بیس ہے جبکہ بچوں کی تعداد ڈھائی سے تین سو کے درمیان ہے۔وہیں سینکڑوں ایسے مدارس ہیں جہاں بچوں کی تعداد سات سے آٹھ سو ہے مگر ٹیچروں کی تعداد صرف تین سے چار ہے۔

جس کی وجہ سے بچوں کو تعلیم دینے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

بغیر کتاب پڑھے ہی فارغ ہو رہے ہیں بچے

حکومت کی جانب سے بچوں کو مفت کتابیں مہیا کرانے کا دعوی گذشتہ سات سالوں سے کھوکھلا ثابت ہو رہا ہے۔آج تک بچوں کو تعلیمی اوقات میں کتابیں مہیا نہیں کرائی گئی ہیں۔ذرائع بتاتے ہیں کہ اسکول میں کتابیں اسی وقت مہیا کرائی جاتی ہیں جبکہ کلاس کے اختتام کا وقت قریب ہوتا ہے۔نتیجتاً بچے کتاب پڑھے بغیر ہی اسے ''کیلو'' کے حساب سے ردی سمجھ کر بغیر پڑھے ہی فروخت کر دیتے ہیں۔چونکہ ٹیچر بھی کتاب نہیں ملنے کی آڑ لے کر کلاس سے اکثر غائب رہتے ہیں ایسی صورت حال میں تعلیمی معیار کی بات بھی حقیقت سے کوسوں دور دکھائی پڑتی ہے۔

آر ٹی ای کا نہیں مل رہا غریب بچوں کو فائدہ

ضلع میں رائٹ ٹو ایجوکیشن ایکٹ کے تحت سبھی رجسٹرڈ پرائیویٹ اسکولوں میں 25 فیصدی بی پی ایل خاندان کے بچوں کو مفت تعلیم دلانے والا قانون خاک چاٹ رہا ہے۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ اس میں محکمہ کے افسران کی لا پرواہی ہے۔ جنہوں نے پرائیویٹ اسکولوں سے کاغذات و فیس تو جمع کر لئے مگر رجسٹریشن کے کاغذات اسکولوں کے حوالے آج تک نہیں ہو سکے ہیں۔اس کا بیورہ ضلع ایجوکیشن محکمہ کے پاس بھی موجود نہیں ہے۔

محکمہ نے شروع کی پہل

ضلع ایجوکیشن آفیسر رتیش کمار جھا کی دعووں پر اگر یقین کریں تو آئندہ تین ماہ کے اندر ضلع میں ایجوکیشن کی حالت کافی بہتری نظر آئے گی۔مسٹر جھا بتاتے ہیں کہ انہوں نے صرف تین ماہ قبل ہی ضلع میں ایجوکیشن محکمہ کا چارج سنبھالا ہے۔ یہاں آنے کے بعد احساس ہوا کہ ضلع میں ایجوکیشن محکمہ کی حالت بہتر نہیں ہے۔جس کو دیکھتے ہوئے کئی طرح کے پہل کئے گئے ہیں''۔

....

ضلع بیگوسرائے میں تعلیم کے شعبہ میں پائی جانے والی ناہمواریوں، کمیوں اور کوتاہیوں کا نقشہ یقیناً خبر نگار نے خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، مگر جس قسم کی زبان اِس خبر میں زیر استعمال لائی گئی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیسی ناقص زبان فروغ پارہی ہے۔ خبر میں ''منعقد کی جانے والے امتحانات''، ''بار بار خلاصہ'' یا پھر ''محکمہ ایجوکیشن اس جانب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کررہی ہے'' جیسے جملوں کی ساخت یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ واقعہ نگاری کے شعبہ میں خبر نگار خواہ کسی حد تک کامیاب کیوں نہ ہو، صحت زبان کا خیال رکھ پانا قطعاً ممکن نہیں ہو پارہا ہے۔ نتیجتاً تذکیر وتانیث کی بڑی اور ناقابل برداشت غلطیاں سرزد ہورہی ہیں، جن کی گرفت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ صورتحال صرف ایک علاقائی دفتر میں تیار ہونے والی خبروں کی نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر علاقائی دفاتر میں صحت زبان کا مذاق اِسی طرح نہایت شوق سے اُڑایا جارہا ہے۔ دربھنگہ میں قومی تنظیم کا علاقائی دفتر نہایت متحرک اور فعال ہے، جہاں روزانہ مقامی صفحہ تیار ہوتا ہے اور پھر تیار شدہ صفحہ کی پٹنہ منتقلی کے بعد اُس کی طباعت عمل میں آتی ہے۔ دربھنگہ میں قومی تنظیم کے بیورو چیف منصور خوشتر ہیں، جو صفحہ سازی کے نگراں بھی ہیں اور حسن اتفاق یہ بھی کہ زیر نظر مضمون کے طلبگار بھی وہی ہیں، لہٰذا خود اُن کی ناک کے نیچے اُن کی ہی سرپرستی میں اردو صحافت کس انداز سے معیاری یا غیر معیاری انداز میں آگے بڑھ رہی ہے، آیئے یہ بھی دیکھنے کی کوشش کریں۔ یہاں 6 فروری 2014 کے شمارہ کیلئے 5 فروری 2014 کو تیار ہونے والے صفحہ میں شامل ایک خبر کی سرخی کچھ یوں قائم کی گئی ہے:

اقلیتی محلّہ سے ''مورتی بھسان جلوس'' لے جانے پر دو فرقہ میں کشیدگی

خبر کچھ یوں تحریر کیا گیا ہے:

''تارڈیہہ، دربھنگہ (انعام الحق) منی گاچھی تھانہ حلقہ کے تحت واقع اجرہٹا گاؤں میں نئے راستے سے مورتی لے جانے کے معاملہ میں دو فریق آپس میں الجھ گئے اور پتھراؤ میں متعدد کو چوٹیں بھی آئی ہیں۔ تنازعہ اتنا طول پکڑا کو ضلع کلکٹر کمار روی اور ایس ایس پی

کمار ایکلے کو موقع پر پہنچا پڑا۔ دراصل جس راستہ سے کبھی بھی مورتی کو نہیں لے جایا گیا اس راستہ سے پولس انتظامیہ کی قیادت میں ٹریکٹر سے مورتی بھسان کا قافلہ لے جایا جارہا تھا ۔جس پر سخت اعتراض جتاتے ہوئے مسلمانوں نے پولس کی گاڑی سمیت قافلہ کو روک دیا اور اس راستہ سے لے جانے کی مخالفت کی۔ اس معاملہ میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے مورتی کو مسلم طبقہ کے لوگوں نے توڑ دیا جبکہ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ہندو طبقہ کے لوگوں نے ہی معاملہ کو سنگین بنانے کیلئے مورتی توڑ دیا۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے معاملہ طول پکڑتا چلا گیا اور دونوں فرقوں میں کشیدگی پھیل گئی۔ جس کے بعد انتظامیہ نے پورا گاؤں کو پولس چوکی میں تبدیل کردیا ہے۔ معاملہ پر قابو پانے کے لئے ڈی ایم، ایس پی، انسپکٹر، منی گاچھی تھانہ صدر پنکج جھا سمیت سکت پور تھانہ سیتا رام پرسا دتارڈیہہ بی ڈی او بریندر کمار شرما، منی گاچھی بی ڈی او گاؤں میں کیمپ کررہے ہیں اور معاملہ سلجھانے کیلئے دونوں فریق کے درمیان مصالحت کی کوشش کی جارہی ہے۔ البتہ موقع پر پہنچنے ڈی ایم نے جب ڈی منی گاچھی تھانہ انچارج سے پوچھا کہ اس مورتی کیلئے لائسنس لیا گیا ہے تو اس کے جواب میں تھانہ صدر نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ دوسری جانب پورے تنازعہ میں مسلم طبقہ کا کہنا ہے کہ قبل میں وشوکرما پوجا کے دوران بھی ایسا واقعہ پیش آچکا ہے جس کے بعد سابق ڈی ایس پی آلوک رنجن، انسپکٹر اودھیش کمار جھا، منی گاچھی تھانہ صدر دلجیت جھا کی قیادت میں دونو ں فریق کی نشست ہوئی تھی اور اس میں طے پایا تھا کہ اس راستے سے مورتی بھسان نہیں ہوگا اور سے متعلق تحریری سمجھوتہ بھی ہوا تھا۔ اس کے باوجود مقامی پولس کی قیادت میں اسی راستہ سے جلوس لے جایا گیا اور فرقہ وارنہ تشدد پھیلائی گئی۔ تادم تحریر ڈی ایس پی اور ایس ڈی او کی قیادت میں دونوں فرقہ کے درمیان بیٹھک چل رہی ہے اور معاملہ یہ طے کیا جارہا ہے نزدیک کے تالاب میں مورتی کا بھسان کیا جائے۔''

....

مورتی کو دریا برد کرنے کے مسئلہ پر پیدا ہونے والی فرقہ وارانہ کشیدگی کا جس انداز

میں تذکرہ کیا گیا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ معیاری زبان کے فروغ کی اہلیت سے خبر نگار پوری طرح محروم ہے۔ بیگوسرائے اور دربھنگہ کے علاقائی دفاتر کی طرح ہی گیا کا دفتر بھی علاقائی سطح پر مقامی صفحات کی تیاری کی ذمہ داری برسوں سے انجام دے رہا ہے۔ یہاں بھی وہی طریقہ اور نسخہ آزمایا جا رہا ہے، جس نہج پر دربھنگہ اور بیگوسرائے کے دفاتر میں خبروں کی تیاری، کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کے ساتھ ہی صفحہ سازی کا کام انجام پا رہا ہے۔ گیا ڈویژن کی نگرانی کی ذمہ داری فیضان عزیز کے سپرد ہے۔ اُن کی ہی تحریر کردہ ایک خبر یہاں بطور نمونہ پیش ہے، تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مگدھ کے خطہ کیلئے منظر عام پر آنے والے قومی تنظیم کے ایڈیشن میں زبان و بیان کی صورتحال کیسی ہے۔ فیضان عزیزی کی مذکورہ خبر 15 جون 2014 کو قومی تنظیم میں شائع ہوئی ہے، جس کا عنوان ہے

''شب برات کے نام پر جاری ہے آتش بازی کا سلسلہ''

خبر کچھ یوں تحریر کی گئی ہے:

''گیا (فیضان عزیزی) عقیدت مندوں نے جمعہ کے روز پوری رات اللہ کی عبادت میں گزاری، نوافل ادا کئے، تلاوت کلام پاک کیا اور اپنے مرحومین کیلئے ایصال ثواب کیا نیز اپنے گناہوں سے توبہ کیا اور پوری دنیا کے مسلمانوں کیلئے امن و امان کی دعا مانگی لیکن دوسری جانب شب برات کے نام پر آتش بازی کا سلسلہ شب برات سے ایک ہفتہ قبل جو شروع ہوا وہ اب تک جاری ہے۔ آتش بازی کے چکر میں ہی ٹکاری میں مار پیٹ کا واقعہ رونما ہوا ہندو مسلم کے درمیان من مٹاؤ و رنجش کا نیا دور شروع ہوا۔ شب برات کے موقع پر پٹاخہ پھوڑ رہے لوگوں کو منع کرنے پر ہوئے تنازعہ میں جم کر مار پیٹ ہوئی اس میں ٹکاری کے محلّہ چھاؤنی پر بیلداری ٹولہ کے فقیر چند بیلدار شدید طور پر زخمی ہو گئے یہ واقعہ جمعہ کی دیر رات رونما ہوا۔ اس واقعہ میں ٹکاری تھانہ میں سنیچر کے روز اطلاع اول درج کرائی گئی فقیر چند نے نامعلوم لوگوں کے خلاف مار پیٹ کا معاملہ درج کرایا ہے۔ ٹکاری کے تھانہ صدر پردیپ کمار نے بتایا کہ فقیر چند مندر کے باہر سویا ہوا تھا اسی کے نزدیک کچھ

نوجوانوں نے پٹاخہ چھوڑ دیا اس کے منع کرنے پر شرارتی نوجوان بھڑک گئے اور فقیر چند کے ساتھ جم کر مار پیٹ کیا۔ شب برات کے نام پر حلوا، پوری اور آتش بازی کا جو دور شروع ہوا ہے وہ اتوار کے روز بھی جاری رہا محتاط اندازے کے مطابق مسلمانوں نے لاکھوں روپئے کے پٹاخے نذر آتش کئے۔ گیا ضلع کے کئی علاقے میں پٹاخہ پھوڑنے کو لے کر آپس میں رنجش اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی کئی علاقے میں بوڑھے بزرگ لوگوں کو اس پٹاخے کی آواز نے بے چین کیا اور ان کے دل سے ان نوجوانوں کے خلاف آہ نکلی۔''

پٹاخوں کی آواز سے بزرگوں کو کتنی بے چینی ہوئی ا اور اُن کے دلوں سے ''آہ'' نکلی یا نہ نکلی، اِسے جانے دیجئے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِس خبر کو پڑھنے کے بعد اہل زبان کے دل سے ایسی صحافتی زبان کے استعمال پر ضرور ''آہ'' نکل گئی ہوگی!۔

گیا، بیگوسرائے اور دربھنگہ کے علاقائی دفاتر کی خبروں کو پڑھنے کے بعد بلا خوف تردد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ علاقائیت کو فروغ دینے کی جو کوشش قومی تنظیم نے شروع کی ہے، اُس سے صحافتی زبان میں کچھ زیادہ بگاڑ آ گیا ہے۔ دراصل اس کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ جو وقائع نویس یا نامہ نگار فرائض کی ادائیگی کیلئے مامور کئے جاتے ہیں، وہ اچھی اور معیاری زبان کے استعمال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ذمہ داران اخبار کیلئے نامہ نگاروں کی تقرری میں چونکہ اچھی زبان کا جاننا پہلی شرط نہیں ہے، لہٰذا غیر معیاری زبان کا استعمال کرنے والے صاحبان بھی بہ آسانی نامہ نگاری کیلئے بحال کر لئے جاتے ہیں۔

علاقائی دفاتر کے برخلاف جو ایڈیشن اور جو صفحات پٹنہ کے مرکزی دفتر میں تیار کئے جاتے ہیں ان میں زبان کی فاش غلطیاں عموماً کم ہوا کرتی ہیں، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پٹنہ میں تیار ہونے والے صفحات میں غلطیاں نہیں ہوتیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو نامہ نگار خبر نگاری کی ذمہ داری نبھا رہے ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر اچھی اور معیاری زبان نہیں جانتے۔ اگر کوئی اتفاق سے معیاری زبان استعمال کرنے والا شخص اس شعبہ میں وارد بھی ہوتا ہے تو اسے خبر نگاری کے فن سے واقفیت نہیں ہوا کرتی۔ چنانچہ یہ اخبارات کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ زبان پر فن کو ترجیح دے یعنی

اچھی زبان جاننے والا ناتجربہ کار شخص پیچھے چلا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس غیر فصیح اور غیر معیاری زبان استعمال کرنے والا تجربہ کار صحافی بازی مار لیتا ہے۔

اخبارات کے ذمہ داروں کو بنیادی طور پر اس سے کوئی سروکار نہیں کہ خبر کی زبان کیسی ہے بلکہ ان کی کوشش یہ ہوا کرتی ہے کہ خبر بروقت، مصدقہ اور خامیوں سے پاک انداز میں داخل دفتر ہو، خامیوں سے پاک خبروں کا مطلب یہ نہیں کہ زبان و بیان کی غلطیاں نہ ہوں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ خبریں متضاد نوعیت کی نہ ہوں، ان میں فنی لحاظ سے کمیاں نہ پائی جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قارئین کے بھروسے کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ یہی وہ بنیادی پیمانہ ہے جس کا خیال رکھتے ہوئے قومی تنظیم بہار میں عموماً نامہ نگاروں کی تقرری کرتا ہے۔ قابل ذکر نکتہ یہ بھی ہے کہ ایسے وقائع نویس بھی بلا جھجک رکھ لئے جاتے ہیں جو اردو زبان سے قطعی ناواقف ہوا کرتے ہیں اور وہ خبروں کی تیاری و ترسیل ہندی میں کرتے ہیں۔ مختلف اضلاع کے نامہ نگاروں کے علاوہ پٹنہ کے دفتر میں بھی اردو زبان سے ناواقف صحافیوں کی کمی نہیں جو ہندی میں خبریں تیار کرتے اور اسے ارسال کرتے ہیں۔ ان خبروں کے ترجمہ کیلئے دفتر میں مترجمین مامور ہیں، تاکہ بروقت ہندی میں موصول ہونے والی خبروں کا ترجمہ کیا جاسکے اور اس کی اشاعت کو یقینی بنایا جاسکے۔

برسوں قومی تنظیم کے پٹنہ دفتر میں کرائم رپورٹر کی ذمہ داری (آنجہانی) ڈاکٹر کمار سریندر نبھاتے رہے۔ قومی تنظیم سے ان کا رشتہ اس وقت تک برقرار رہا، جب تک وہ زندہ سلامت رہے۔ وہ ہندی میں خبریں لکھا کرتے تھے اور مترجمین ان کی خبروں کا ترجمہ کرتے تھے لیکن ڈاکٹر کمار سریندر اعلیٰ تعلیم یافتہ صحافی تھے۔ انہوں نے اردو رسم الخط سے واقفیت تو حاصل نہیں تھی البتہ انہیں اردو زبان بولنے پر آگے چل کر اتنی دسترس ہوگئی کہ انہوں نے ہندی میں خبریں لکھ کر دینا بند کر دیا۔ اس کی جگہ انہوں نے کمپیوٹر آپریٹر کو نہایت فصیح زبان میں راست خبریں لکھانے کا نیا سلسلہ شروع کیا۔ اس کی وجہ سے ترجمہ کے مراحل سے گزرنے کی ضرورت باقی نہ رہی اور خبروں کی تیاری میں برق رفتاری بھی آگئی۔ ابتدا میں (آنجہانی) کمار سریندر نے از خود لکھائی گئی خبروں کی زبان دانی دیکھنے کیلئے پروف ریڈر کی مدد بھی لی تاکہ نظر ثانی کے ذریعہ نقائص کو دور کر لیا جائے لیکن آگے

چل کر اس کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ ایک مشاق صحافی کی طرح ڈاکٹر کمار سریندر نے خبروں کی راست کمپوزنگ کا عمل انجام دینا شروع کر دیا۔ موصوف قومی تنظیم کے چنندہ صحافیوں میں سے ایک تھے جن پر ادارہ اور اس کے ذمہ داران کو مکمل بھروسہ تھا۔ یہی وجہ رہی کہ کرائم رپورٹر کی حیثیت سے صحافتی سرگرمیوں کو انجام دینے کے ساتھ ہی انہوں نے لمبی مدت تک مقنّنہ کی رپوٹنگ بھی خوش اسلوبی کے ساتھ کی۔ خصوصاً بہار قانون ساز کونسل کی سرگرمیوں کا احاطہ ڈاکٹر کمار سریندر ہی کیا کرتے تھے جبکہ اسمبلی کی رپورٹنگ رضوان دربھنگوی کے ذمہ ہوا کرتی تھی۔ جب کبھی رضوان دربھنگوی تعطیل پر ہوا کرتے یا دوسری مصروفیت کی وجہ سے اُن کا اسمبلی جانا ممکن نہ ہوتا، ڈاکٹر کمار سریندر اسمبلی کی کارروائی کا احاطہ کرنے کی بھی اضافی کوشش کیا کرتے۔ کہنے کا ماحصل یہ ہے کہ ڈاکٹر کمار سریندر نے اردو زبان تو نہیں سیکھی لیکن اردو بولنا سیکھ لیا۔ اس حد تک کہ معیاری زبان میں وہ خبریں بول کر کمپوز کرایا کرتے تھے اور ان کی خبریں کسی بھی زاویہ نگاہ سے ایسی نہیں ہوا کرتی تھیں جنہیں غیر معیاری تصور کیا جائے۔ پٹنہ میں اسٹاف رپورٹر کی حیثیت سے جو کارکنان فرائض کی انجام دہی پر مامور ہیں اور مقامی سطح پر خبر نگاری کی بھی ذمہ داری نبھا رہے ہیں ان میں سے زیادہ تر کارکنان بہت اچھی زبان کے استعمال پر تو قدرت نہیں لیکن ان کی زبان کو بیک جنبش قلم غیر معیاری بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ خبروں کی بروقت اور مناسب انداز میں ترسیل کی کوششوں میں قومی تنظیم پوری طرح کامیاب ہے۔ البتہ اخبار کو صد فیصد غیر جانبدار قرار دینے کی گنجائش نہیں نکلتی۔ قومی تنظیم کو ایک مصلحت پسند اخبار کے زمرہ میں رکھنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ یہ اخبار بسا اوقات کاروباری مصلحتوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اخبار کی نگاہ میں حق گوئی، بے باکی اور جرأت پسندی سے کہیں زیادہ مصلحتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اخباری صفحات تیار کرنا ضروری ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متنازعہ نوعیت کی خبروں کو شامل اشاعت کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ سنسنی خیزی سے اخبار بہر حال پوری طرح پاک ہے اور شاید جس حد تک یہ اخبار اعتدال کی راہ پر گامزن رہا ہے، اس کی نظیر کم از کم بہار میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

کچھ لوگ قومی تنظیم کو ارباب اقتدار کا مداح اخبار تصور کرتے ہیں۔ ایسی رائے قائم کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ اخبار ہذا اکثر ریاستی حکومت کی مدح سرائی کرتا ہے اور نتیجتاً غیر جانبداری کے تقاضوں کا خیال رکھ پانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ خیال صد فیصد درست تو نہیں البتہ اخباری صفحات کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ اخبار کاروباری مقاصد کو اولیت دیتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ریاستی حکومت کی شان میں بسا اوقات توصیفی کلمات بھی ادا کئے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ریاستی حکومت اخبار کے ساتھ اشتہارات کی فراہمی کے معاملہ میں فیاضی کا مظاہرہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی تنظیم کے تئیں ریاستی حکومت کا رویہ بھی نہایت مشفقانہ دکھائی دیتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ اخبار کسی خاص جماعت کا ہم خیال ثابت ہو رہا ہے بلکہ مشاہدے سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ریاست میں خواہ کوئی بھی جماعت اقتدار میں آئے، قومی تنظیم کے تعلقات ہمیشہ ہی برسر اقتدار جماعت سے خوشگوار ثابت ہوتے ہیں۔

اگر تھوڑا پیچھے ہٹ کر ماضی کی صورتحال کا جائزہ لینے کی سعی کی جاتی ہے تو پتہ یہ چلتا ہے کہ بہار میں جب پندرہ برسوں تک لالو یادو اور رابڑی دیوی کی حکمرانی رہی، اُس عہد میں یہ اخبار لالو یادو اور ان کی حکومت کی تعریف میں آسمان سے قلابے ملاتا نظر آیا لیکن جب پندرہ برسوں کی حکمرانی ختم ہوئی اور بہار کے زمام اقتدار پر جنتا دل متحدہ کا قبضہ ہوا اور نتیش کمار وزیراعلیٰ بن گئے تو یہی اخبار لالو پرشاد اور راشٹریہ جنتا دل کی جگہ جنتا دل متحدہ اور نتیش کمار کے تئیں فراخ دلی کا غیر معمولی انداز میں مظاہرہ کرنے لگ گیا۔ حکمراں جماعت کی تعریف و توصیف میں فراخدلی کا جذبہ دکھانا اپنی جگہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ خاص بات یہ بھی ہے کہ اخبار مذکور حزب مخالف کو بھی نظر انداز نہیں کرتا بلکہ تھوڑے فرق کے ساتھ اپوزیشن کی آوازوں کو بھی مناسب انداز نمائندگی دی جاتی ہے۔

ایسے میں یہ سوال کھڑا ہونا بھی فطری ہے کہ جب اپوزیشن کی آواز کو اخبار دباتا نہیں ہے تو پھر اخبار مذکور کو ارباب اقتدار کا ہم خیال اخبار کیوں کر تصور کیا جائے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے جو نکتے ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ توجہ طلب اور لائق تجزیہ کہلا سکتے ہیں۔ بسا اوقات

یہ دیکھا جاتا رہا ہے کہ جب کبھی بہار میں کوئی متنازعہ مسئلہ سامنے آتا ہے جس میں حکومت کو پشیمانی جھیلنی پڑتی ہے، ایسے موقع پر اکثر قومی تنظیم غیر جانبداری کے تقاضوں کو نبھانے کی بجائے ارباب اقتدار کے موقف کو یا تو جائز ٹھہرانے کی کوشش کرتا ہے یا پھر کسی نہ کسی انداز میں حکومت کے اقدام کے دفاع کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ اسی طرح جب کبھی حکومت کے کسی فیصلہ سے اقلیتوں بالالفاظ دیگر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے لگ جاتے ہیں تو ایسی صورت میں یہ اخبار یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ کھل کر اقلیتوں کے موقف کی ترجمانی کرے۔ حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ اقلیتوں کے مفادات کو اخبار کبھی بھی نظر انداز نہیں کرتا لیکن ایسے موقع پر جبکہ اقلیتوں کیلئے آوازیں بلند کرنے سے ریاستی حکومت کے مفادات کو چوٹ پہنچنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، قومی تنظیم اقلیتوں کی ترجمانی اپنے انداز میں نہیں کرتا بلکہ اس کیلئے وہ ایک ایسی حکمت عملی اختیار کرتا ہے جسے دلچسپ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اقلیتوں پر افتاد پڑے یا اردو پر ستم ڈھایا جائے، اخبار مذکور اپوزیشن کے کاندھے کا خوبصورتی کے ساتھ سہارا لیتا ہے یا پھر سرکار کے کسی سابقہ فیصلے کی دہائی دیتا ہے جس سے یہ باور کرانا آسان ہو جاتا ہے کہ حکومت نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس سے اقلیتیں ناراض ہیں اور یہ کہ اضطراب اور بے چینی عمومی طور پر پائی جارہی ہے لیکن کبھی بھی اور کہیں بھی یہ دیکھنے کو نہیں ملتا کہ اخبار ہذا ریاستی حکومت کے کسی بھی 'عوام دشمن' فیصلے یا 'اقلیت مخالف رویۓ' کے خلاف شمشیر برہنہ بن جائے اور اقلیتوں کے مفادات کو کچلنے والے کسی بھی فیصلے یا اقدام کے خلاف اخبار از خود صدائے احتجاج بلند کرے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کو ذہن میں رکھتے ہوئے کچھ لوگ اخبار کی غیر جانبداری پر بڑا سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ بعض مواقع پر خود اخبار نے جو لائن لی یا جو حکمت عملی اختیار کی، اس سے اس کی غیر جانبداری کٹہرے میں کھڑی ہوگئی! بطور مثال یہاں فاربس گنج کے اس المیہ کو نشان زد کیا جا سکتا ہے جس میں ریاستی حکومت کا رویہ اقلیتوں کے تئیں دشمنانہ ثابت ہوا۔

3/جون 2011 کو فاربس گنج میں حکومت بہار کے ایک فیصلہ کے خلاف مقامی شہریوں نے احتجاج کی صدا بلند کی تھی، جس پر شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے حکومت نے بہار پولیس کے

ذریعہ ظلم وجبر کا ایسا بدترین نمونہ پیش کیا تھا جس کی نظیر بہار میں کم از کم پچھلے 30-25 برسوں کے درمیان ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتی۔ احتجاج کاروں پر پولیس نے نہ صرف یہ کہ گولیاں برسائیں بلکہ چھ ماہ کے شیرخوار معصوم اور ایک خاتون کو بھی پولیس کی سفاکی کا شکار بن کر موت کی آغوش میں پہنچ جانا پڑ گیا۔ اس واقعہ کے حوالہ سے قومی میڈیا میں زور وشور کے ساتھ خبر آئی اور اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ قومی حقوق انسانی کمیشن اور اقلیتی کمیشن نے اس واقعہ میں غیر معمولی سنجیدگی کا مظاہرہ بھی کیا اور حکومت بہار کے اقدام کی چوطرفہ مذمت کی گئی۔ ہفتوں یہ معاملہ قومی ذرائع ابلاغ کیلئے توجہ کا محور بنا رہا، لیکن بہار کی اردو صحافت نے بالخصوص اور ریاست کی مین اسٹریم میڈیا نے بالعموم جس طرح اس واقعہ کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی وہ لائق توجہ ہی نہیں بلکہ قابل استفسار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھنے والوں نے اس کا سخت نوٹس بھی لیا اور تجزیہ میں یہ بات بطور خاص لائی گئی کہ آخر کیا سبب ہے کہ بہار کے میڈیا نے اس خبر کو اس انداز میں شائع کرنے سے گریز کیا جو اس کا حق ہونا چاہئے تھا۔ قومی تنظیم نے گرچہ صف اول پر تین کالم پر مشتمل یہ خبر شائع کی لیکن خبر سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ پولیس نے سفاکی کا مظاہرہ کیا، کہیں یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ انسانی حقوق کی پامالی کی گئی، کہیں یہ نہیں ظاہر ہو رہا تھا کہ بہار پولیس کا رویہ اقلیتوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے سے متعلق رہا۔ مذکورہ خبر میں کہیں بھی یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ نتیش کمار کی حکومت نے حکمراں طبقہ سے تعلق رکھنے والے کسی خاص لیڈر کے مفادات کے تحفظ کی خاطر ایسی حکمت عملی اختیار کی جو فاربس گنج کے مسلمانوں کیلئے اندوہناک بن گئی اور جائز مطالبات کیلئے احتجاج کرنے والے مسلمانوں پر پولس نے گولیاں برسائیں۔ غرض کہ عمومی نوعیت کی ایک ایسی خبر منظر عام پر لائی گئی جسے محض خانہ پری کہا جا سکتا ہے۔ اس چھوٹی سی مثال کو یہاں پیش کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ قومی تنظیم نے غیر جانبدارانہ صحافت کا لحاظ نہ رکھنے کی جو کوشش کی یا اس ضمن میں اس کا جو عمومی رویہ ہے، اسے نشان زد کیا جا سکے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ کہ فاربس گنج کے اس واقعہ پر ملک بھر میں میڈیا نے الگ الگ انداز میں تجزیوں اور تبصروں کا سلسلہ دراز کیا اور تقریباً تمام بڑے چھوٹے اخبارات نے اس معاملہ میں اداریہ کے

ذریعہ بہار پولیس کی بربریت پر رائے زنی کی، لیکن بہار کے اخبارات کیلئے نہ تو یہ خبر بڑی خبر بن سکی اور نہ ہی اداریہ کا موضوع۔ قومی تنظیم بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا اور گویا ایک طرح سے قومی تنظیم نے بھی فاربس گنج کے مظلومین کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ نہیں کیا۔

ارباب اقتدار کے مفادات کا تحفظ کرنے کی روایت بہار میں بطور خاص تب شروع ہوئی، جب اقتدار پر جنتا دل متحدہ کا قبضہ ہوا اور بحیثیت وزیراعلیٰ نتیش کمار نے اقتدار کی کمان سنبھالی۔ کہا جاتا ہے نتیش کمار میڈیا کی تنقید برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ جس جس اخبار نے خواہ وہ کسی بھی زبان سے متعلق کیوں نہ ہو، نتیش حکومت کے خلاف خبریں شائع کیں ،اُسے حکومت بہار کی جانب سے کنارہ لگانے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ یعنی بہار کے محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ سے جاری ہونے والے اشتہارات سے ان اخباروں کو محروم ہونا پڑ گیا جو ریاستی حکومت کی تنقید کرنے کے مجرم ٹھہرے!۔ حد تو یہ بھی ہے کہ ہندی میڈیا کا مضبوط ستون کہلانے والا ممتاز اخبار ''دینک جاگرن'' بھی حکومت بہار کے اس رویہ کا شکار بنا جسے مخصوص دورانیہ کیلئے اشتہارات سے محروم ہو جانا پڑا۔ چنانچہ بہار میں ایک طرح سے نتیش کمار کی حکومت نے میڈیا کو اپنے قابو میں رکھنے یا اُسے اپنا دست نگر بنانے کی حکمت عملی نہایت خوبصورتی کے ساتھ انجام دی۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ریاست کے اردو اخبارات کہیں نہ کہیں اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ میں ناکام نظر آنے لگ گئے اور اس کے برخلاف حکومت کی مفادات کا تحفظ انہیں زیادہ عزیز نظر آنے لگ گیا۔

فاربس گنج کے واقعہ میں قومی تنظیم کی چشم پوشی کو اسی تناظر میں دیکھنا غلط نہ ہوگا۔ حالانکہ ذمہ داران اخبارات اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے اور مجہول تاویلیں بیان کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قومی تنظیم بطور خاص ریاست کی اردو آباد کے مفادات کا پوری طرح خیال رکھنے کیلئے کوشاں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے مصداق صاحبان اخبار ارباب اقتدار کی خوشامد پرستی کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ قومی تنظیم ریاست کا منفرد ایسا اخبار ہے جو جملہ وسائل اور حصول اطلاعات کے نظام سے

آراستہ ہونے کے باوجود پوری طرح صحافتی غیر جانبداری کا لحاظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہے۔ حالانکہ خود اخبار کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک ایسا غیر جانبدار اخبار ہے جو آئینہ دکھانے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہے اور کسی بھی طبقہ کی حمایت یا مخالفت سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں۔ اس خیال کی ترجمانی کیلئے اخبار مذکور نے جمیل مظہری کا یہ شعر اداریہ کے سر پر بٹھا رکھا ہے۔

نہ سیاہی کے ہیں دشمن نہ سفیدی کے ہیں دوست
ہم کو آئینہ دِکھانا ہے دِکھا دیتے ہیں

حالانکہ جب اخبار ہذا کے مشمولات کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جاتا ہے تو اس حقیقت کی ترجمانی کا احساس ہمیں نہیں ہوتا۔ کیونکہ اخبار ہذا سبھوں کا خیال رکھنے کے درمیان اپنے مالی مفادات کے تحفظ میں زیادہ فراخدل یا کوشاں نظر آنے لگ جاتا ہے۔ کاروباری نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ رجحان غلط بھی نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو فطری طور پر کہیں نہ کہیں اخبار کے کاروباری پہلو کو نقصان پہنچنا بھی فطری ہے۔ چنانچہ قومی تنظیم نے ایک طرح سے یہ فیصلہ لے لیا ہے کہ ریاستی حکومت کو زیادہ سے زیادہ بہتر انداز میں کوریج دینے کی کوشش کی جائے تاکہ ''سرکار بہادر'' کی عنایات اور مہربانیوں میں کوئی کمی واقع نہ ہو اور اس طرح اخبار کا کاروباری معاملہ آگے بڑھتا رہے ۔صحافتی نقطہ نظر سے ایسا کیا جانا کہاں تک ضروری ہے اور مناسب؟ بہرحال یہ سوال ضرور کھڑا ہو جاتا ہے۔

قومی تنظیم کے علاوہ بہار کے جو دوسرے اردو اخبارات انفرادی کوششوں کے تحت منظر عام پر آرہے ہیں اور جن کے قارئین کا اچھا خاصا حلقہ موجود ہے ان میں چار پانچ اخبارات بطور خاص شمار میں لائے جاسکتے ہیں۔ فاروقی تنظیم، پندار، سنگم، امین اور انقلاب جدید وہ اخبارات ہیں جو پٹنہ اور قرب وجوار کے کئی ضلعوں میں اپنی موجودگی کا خوشگوار انداز میں احساس دلا جاتے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر اخبارات ایسے ہی ہیں جن کی اشاعت و ترسیل کا دائرہ محدود ہے اور بہار کے درجن بھر اضلاع میں یہ اخبارات فروخت کیلئے نہیں بھیجے جاتے۔ فاروقی تنظیم کسی حد تک مذکورہ اخبارات میں بہتر کہلانے کا مستحق ضرور ہے جو مکمل بہار کا احاطہ تو نہیں کرتا لیکن پٹنہ کے قرب وجوار سے تعلق

رکھنے والے زیادہ تر ضلعوں میں 'فاروقی تنظیم' کی کاپیاں فروخت کیلئے بھیجی بھی جاتی ہیں اور یہ اخبار ایک خاص طبقہ کے درمیان پسند بھی کیا جاتا ہے۔ رہی بات کارپوریٹ گھرانہ سے تعلق رکھنے والے اردو اخبارات کی تو یہ رائے قائم کرنا غلط نہ ہوگا کہ بڑے میڈیا گھرانوں سے تعلق رکھنے والے دونوں اخبارات (راشٹریہ سہارا اور انقلاب) کا دائرۂ ترسیل بھی بڑا ہے اور اخبارات کے دفاتر بھی جملہ وسائل سے پوری طرح متصف۔ البتہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انقلاب اور راشٹریہ سہارا نے بہار میں اپنی موجودگی درج کرانے میں کامیابی حاصل کر لینے کے باوجود بہار کے اردو قارئین کے دلوں میں جگہ بنالی ہے۔ یہ دونوں ہی اخبارات قومی تنظیم سے زیادہ مالی لحاظ سے مستحکم بھی کہلا سکتے ہیں کیونکہ ان کی پشت پر بڑے کاروباری طبقہ کا ہاتھ بھی ہے، مگر بہار کے اردو قارئین کے درمیان ان دونوں اخباروں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا ہے جو مرتبہ قومی تنظیم کو حاصل ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہی ہے کہ یہ دونوں ہی اخبارات بہار کے اردو قارئین کے جذبات واحساسات کا پوری طرح خیال رکھنے سے قاصر ہیں۔

بہار کی اردو صحافت ویسے انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہو رہی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس تغیر وتبدل میں راشٹریہ سہارا اور انقلاب کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ مذکورہ دونوں اخبارات کی آمد سے قبل تک بہار میں صحافتی مسابقہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے برعکس بہت سارے معاملوں میں 'قومی تنظیم' کی من مانی بھی چل رہی تھی کیونکہ بہار کے کسی بھی دوسرے اردو اخبار میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ پوری طرح ''قومی تنظیم'' سے آنکھیں ملا سکے۔ آج کی تاریخ میں کم از کم ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ قومی تنظیم کی ذرا سی غفلت کے نتیجہ میں یہاں اب راشٹریہ سہارا اور انقلاب کے بازی مار لینے کا بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ذمہ داران اخبارات کے مزاج و انداز اور رویوں میں بھی بڑی تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ قارئین کیلئے اچھی بات یہ ہے کہ تین اخبارات (راشٹریہ سہارا، انقلاب اور قومی تنظیم) کے درمیان مسابقہ کی شروعات سے صحافت کا معیار بھی کچھ بلند ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خبروں، مضامین اور خصوصی گوشوں کی اشاعت میں بھی چستی اور پھرتی آگئی ہے۔ بعض معاملوں میں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ تینوں ہی اخبارات اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں

کہ کیسے دوسروں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے قارئین تک زیادہ موثر انداز میں رسائی حاصل کی جائے۔ اس طرح موقع کا فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش ہوتی ہے تاکہ کسی نہ کسی شکل میں بہار کی اردو صحافت میں نمبر ایک بننے کی کوششوں کو شرمندۂ تعبیر کیا جاسکے۔

راشٹریہ سہارا اور انقلاب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد روایتی مزاج رکھنے والے اخبار ''قومی تنظیم'' کیلئے بھی یہ ناگزیر ہوگیا کہ وہ تزئین و ترتیب اور تہذیب پر بھی خاص توجہ دے۔ یہی وجہ ہے کہ حال کے برسوں میں خوبصورت انداز میں صفحہ سازی کی کوشش دیکھنے کو مل رہی ہے۔ ویسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تزئین و ترتیب کے معاملہ میں پھر بھی 'قومی تنظیم' نے یا بہار کے کسی دوسرے مقامی اردو روزنامہ نے روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' یا روزنامہ 'انقلاب' کی ہمسری کر لی ہے۔ یہ دونوں ہی اخبارات گٹ اپ کے لحاظ سے تمام دوسرے اردو اخبارات سے بہتر تصور کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ اردو قارئین گٹ اپ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے لیکن زیادہ تر لوگوں کا گٹ اپ کے تعلق سے شکایتی لہجہ تو سننے اور دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ البتہ وہ قومی تنظیم سے اپنے تعلقات منقطع کرتے ہوئے کسی دوسرے اردو اخبار سے ربط جوڑنے کو ذہنی طور پر آمادہ نہیں۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' اور روزنامہ 'انقلاب' کی آمد کے بعد قومی تنظیم اور دوسرے اردو اخبارات نے بھی صفحات کو پُرکشش اور جاذب نظر بنانے کی کوشش شروع کی ہے، لیکن قومی تنظیم کیلئے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ روایتی طریقہ اور مزاج ترک کرنے کو پوری طرح آمادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمپیوٹر کے اس عہد میں بھی کئی صفحات ایسے ہیں جن کی تیاری آج بھی خودکار (مینول) انداز میں ہو رہی ہے۔ یعنی خبروں کی کمپوزنگ کے بعد اسے پرنٹ دے دیا جاتا ہے اور پیسٹر روایتی انداز میں خودکار طریقہ سے صفحہ سازی کی گتھی سلجھاتا ہے۔

بہار میں یک نفری خطوط کے تحت منظر عام پر آنے والے دوسرے بڑے یا درمیانہ درجہ کے اُن اخبارات کا تذکرہ نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی، جو پورے بہار میں اردو صحافت کے دائرہ کو بھلے ہی وسعت نہ دے پا رہے ہوں لیکن پٹنہ اور قرب و جوار میں ان کی ترسیل و اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔ ایسے ہی اخبارات میں روزنامہ فاروقی تنظیم، روزنامہ پندار، روزنامہ انقلاب جدید، روزنامہ

سنگم اور روزنامہ امین کو بطور خاص شمار میں لایا جاسکتا ہے۔ انفرادی کوششوں کے تحت منظر عام پر آنے والے ان متذکرہ اخبارات میں سے چند ایسے ضرور ہیں جن کا مخصوص حلقہ میں دائرہ اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر روزنامہ فاروقی تنظیم کو شمار میں لانا غلط نہ ہوگا۔ فاروقی تنظیم 1984 سے منظر عام پر آرہا ہے اس اخبار کے مدیر اور مالک محمد ظفر فاروقی ہیں جنہوں نے اپنے والد بزرگوار مولانا فاروق الحسنی کی یاد میں اس اخبار کی داغ بیل ڈالی۔ ابتدا میں یہ اخبار ہفت روزہ تھا اور محض چار صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ بعدازاں 1986 میں اسے روزنامہ کی شکل میں تبدیل کیا گیا۔ قومی تنظیم کے بعد بہار میں انفرادی کوششوں کے تحت منظر عام پر آنے والا یہ دوسرا بڑا اخبار ہے، جس کی اشاعت اور ترسیل کا دائرہ محدود نہیں ہے۔ یہ اخبار بھی اپنی بساط بھر یہ کوشش کر رہا ہے کہ اپنا دائرہ اثر بڑھایا جائے۔ چنانچہ اس نے بھی علاحدہ علاحدہ خطوں کیلئے الگ الگ ایڈیشن کی اشاعت کو یقینی بنانے کی کوشش شروع کی ہے۔ فی الوقت اس اخبار کا تین منفرد ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ اس اخبار کو قومی تنظیم کے مقابلہ میں زیادہ بے باک روزنامہ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ اخبار زیادہ مصلحت پسند نہیں ہے۔ بسا اوقات ارباب اقتدار کے غلط اور نامناسب فیصلوں پر احتجاج درج کرانا یہ اخبار اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ بعض جذباتی قسم کے صحافیوں کی وابستگی کی بنا پر کبھی کبھی یہ پیغام بھی ابھرتا ہے کہ فاروقی تنظیم جذبات نگاری کو ہوا دے رہا ہے۔ البتہ ادارتی عملوں کی مجموعی خدمات اور صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فاروقی تنظیم محض جذبات کی رو میں بہہ جانے والا اخبار ہے۔ کیونکہ بہت سے بامعنی اداریے، فکر انگیز مضامین اور بے باک نوعیت کی خبریں بھی اس اخبار میں نمایاں انداز میں شائع کی جاتی ہیں۔

ادارت کی ٹیم میں بعض سنجیدہ و متین خیالات کے حامل صحافیوں کی شمولیت کی وجہ سے اخبار کا مزاج اور انداز کچھ ایسا دیکھنے کو ملتا ہے جسے صرف اور صرف جذبات نگاری کا مرقع قرار دینا مناسب نہیں کہلا سکتا۔ فاروقی تنظیم کے ادارتی عملوں میں شامل چند سنجیدہ حضرات متوازن صحافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں یقین رکھتے ہیں جبکہ کئی ایسے بھی ہیں جو اخبار کو جذبات کی رو میں بہا دینا بھی چاہتے ہیں۔ گویا اس طرح یہ اخبار غیر متوازن انداز میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے

اور اپنے دائرۂ اثر کو بڑھانے کیلئے کوشاں ہے۔ پٹنہ کے علاوہ ریاست کے جن خطوں میں اس اخبار کی ترسیل کو یقینی بنایا جارہا ہے،ان میں ویشالی،سارن، مظفرپور، سمستی پور ،دربھنگہ ،بیگوسرائے ،مشرقی ومغربی چمپارن، سیتامڑھی اور آرا وغیرہ اضلاع قابل ذکر ہیں۔ان شہروں میں نہ صرف یہ کہ فاروقی تنظیم کی ترسیل کو یقینی بنایا جارہا ہے بلکہ یہاں اخبار نے اپنے نامہ نگاروں کی تقرری بھی کررکھی ہے جس کی وجہ سے مقامی خبروں کی اشاعت بھی خوب خوب ہورہی ہے۔اسی طرح روزنامہ ’پندار‘ اور روزنامہ ’ انقلاب جدید‘ بھی مخصوص حلقہ اثر میں اپنا اپنا منفرد شناخت رکھتا ہے۔ روزنامہ ’ پندار‘ کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ یہ ایک خاتون خانہ کی ادارت میں نکلنے والا اخبار ہے۔ 1974 میں محترمہ جہاں آرا نے اپنے شوہر اے کے احسانی کے تعاون سے اس اخبار کی شروعات کی تھی۔ یہ اخبار بھی ’ فاروقی تنظیم‘ اور ’ قومی تنظیم‘ کی طرح ہی ابتدا میں ہفتہ وار نوعیت کا اخبار تھا لیکن آگے چل کر اس نے بھی خود کو روزنامہ کی شکل میں متعارف کرایا۔1988 سے مسلسل یہ اخبار روزنامہ کی شکل میں منظر عام پر آرہا ہے۔اس اخبار سے بہار کے کئی معروف صحافی وابستہ رہ چکے ہیں یا اب بھی ہیں،جن میں چیف ایڈیٹر ریحان غنی کے علاوہ شوکت فرید اور ایس ایم اشرف قابل ذکر ہیں۔ جہاں آرا بحیثیت مالک و پرنٹر اینڈ پبلشر اخبار کی سرپرستی کی ذمہ داری نبھارہی ہیں ۔8 صفحات پر محیط یہ اخبار معتدل مزاج کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ اس اخبار میں بھی سبھوں کو ساتھ لے کر چلنے کی روایت برسوں سے برقرار ہے۔البتہ حکومت وقت کی پالیسی کو عام کرنا اخبار کی ترجیحات کا گویا ایک طرح سے لازمی حصہ ہے۔اس اخبار نے بھی 2008 میں اپنی شکل وشباہت تبدیل کی اور بلیک اینڈ وائٹ کی جگہ رنگین صفحات کی اشاعت عمل میں آنی شروع ہوگئی۔ ترسیلی دائرہ بہرحال محدود ہے اور پابندی کے ساتھ اس اخبار کی اشاعت عمل میں تو آتی ہے لیکن دور افتادہ خطوں تک اس کی ترسیل نہیں ہو پاتی ہے۔

اسی طرح اور اسی نوعیت کا اخبار روزنامہ ’ انقلاب جدید‘ بھی ہے، جس کا آغاز 10 ستمبر 1995 کو ہوا تھا۔اس اخبار کا آغاز بڑے ہی طمطراق کے ساتھ ہوا تھا جس کی وجہ سے یہ پیغام ابھرا کہ شاید یہ روزنامہ بہار میں اردو صحافت کو نئی بلندی عطا کرے گا۔ جدید ٹیکنالوجی کا سہارا

لینے کی خوب خوب کوشش کی گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ تجربہ کار صحافیوں کی ٹیم کی خدمات کو یقینی بنانے کی سعی بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ابتدا میں اس اخبار نے شہرت ومقبولیت بھی خوب خوب حاصل کی ،لیکن آگے چل کر ایک عرصہ تک یہ اخبار گمنامی کا شکار رہا۔ جو بڑے صحافی اس اخبار سے وابستہ ہوئے ، انہوں نے یکے بعد دیگرے اس اخبار سے اپنا تعلق ختم کرلیا جس کی وجہ سے ’انقلاب جدید‘ نے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ہی برسوں میں عروج سے زوال تک کا سفر طے کرلیا۔ گو کہ اب بھی ’انقلاب جدید‘ کی اشاعت عمل میں آرہی ہے لیکن ریاست کے دیگر شہروں تک اخبار کی رسائی نہیں ہے۔

بہار کے مقبول ومعروف اردو اخبارات کے درمیان روزنامہ ’ سنگم‘ ایک ایسا اخبار ہے جس نے کبھی بہار کی سیاست کے رخ کو تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی لیکن آج وہ بھی بہار کی اردو صحافت میں ایک کمزور اور لاغر اخبار کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانے پر مجبور ہے۔ ’ سنگم‘ بہرحال بہار کے قدیم ترین اخباروں میں سے ایک ہے ۔ مرحوم غلام سرور نے 1953 میں ’ سنگم‘ کو ہفت روزہ کی شکل میں جاری کیا تھا جو بعد میں روزنامہ اخبار میں بدل گیا۔ فرقہ پرستی ،نفرت اور خوف وہراس کی مسموم فضاؤں کو دور کرنے یا کم کرنے کی غرض سے غلام سرور نے اس اخبار کی داغ بیل ڈالی تھی۔

سنگم کسی زمانہ میں بہار کا سب سے زیادہ مقبول اور معروف روزنامہ ہوا کرتا تھا جس سے بہار کے بڑے صحافی بڑی تعداد میں وابستہ تھے مثلاً شاہد رام نگری، معین انصاری ،عبدالمغنی ،مظفر حسن ، امتیاز کریم اور مظاہر الدین کے اسمائے گرامی بطور خاص قبل ذکر ہیں۔ ’ سنگم‘ کو بیتاب صدیقی، شاہ مشتاق احمد اور کئی دیگر ذی علم ہستیوں کا بھی بھرپور تعاون حاصل رہا۔ غلام سرور کے زمانہ میں یہ اخبار کانگریس کے ان فیصلوں پر احتجاج درج کرانا اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا جو اقلیتوں کے تعلق سے نامناسب کہلانے کے مستحق ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری کا خیال ہے کہ سنگم نے بہار کی اردو صحافت کو ایک نیا طرز ، نیا موڑ اور نیا انداز دیا۔ غلام سرور چونکہ بہار کے ایک معروف سیاستداں بھی تھے اور جہد کار بھی، لہٰذا صحافتی سرگرمیوں سے کہیں زیادہ وہ سیاسی معاملوں میں بھی

متحرک اور فعال ہوا کرتے تھے لہٰذا ان کی عدم موجودگی میں مرحوم عبدالمغنی اخبار کیلئے اداریہ تحریر کیا کرتے تھے۔ متعدد بار مختلف معاملوں میں احتجاج کے دوران غلام سرور کو گرفتار بھی کیا گیا اور انہیں جیل میں بھی رہنا پڑا۔ ایسے مواقع پر عبدالمغنی، شاہد رام نگری، معین انصاری اور مظاہر الدین وغیرہ کی یہ کوشش ہوتی کہ غلام سرور کی عدم موجودگی کا احساس کسی بڑی کمی یا کوتاہی کی شکل میں نہ ہو۔ جب تک غلام سرور زندہ رہے، سرد اور گرم انداز میں یہ اخبار نکلتا رہا اور قارئین کے درمیان توجہ کا مرکز بھی بنا رہا۔ غلام سرور کے بعد کچھ دنوں کیلئے اخبار کی اشاعت کا سلسلہ موقوف ہو گیا لیکن پھر ان کے داماد ڈاکٹر اعجاز علی نے از سر نو اس کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی۔ نئے نگراں کی نگرانی میں یوں تو سنگم کی اشاعت کا دوبارہ سلسلہ 2009 سے شروع ہو گیا لیکن دور حاضر تک کے دورانیہ میں کبھی بھی یہ احساس نہ ہو سکا کہ یہ وہی 'سنگم' ہے جس کے ذریعہ کبھی غلام سرور اپنی صحافتی سرگرمیوں کو آگے بڑھاتے ہوئے بہار کے سیاسی افق پر ایک نئی پہچان اور نئی علامت کے طور پر ابھرے۔ سنگم کی اشاعت ثانی کو بعض لوگ محض کاغذی خانہ پری تصور کرتے ہیں کیونکہ نہ تو اس اخبار میں ماضی کی طرح جوش و ولولہ دکھائی دیتا ہے نہ ہی اقلیتوں کی ترجمانی کی فکر اور نہ ہی اردو زبان کے تحفظ کیلئے مر مٹنے کا جذبہ۔ بس ایک رسم کے تحت اخبار کی اشاعت جاری ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اعجاز علی اپنے خسر کی نشانی کو محض باقی رکھنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اخبار کی پالیسی میں بھی بڑی تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔

بہار کی اردو صحافت کا عمومی طور پر جائزہ لینے اور نبض ٹٹولنے کے بعد یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جو صحافتی ادارے وسائل سے آراستہ ہیں اور جن کے یہاں حصول اطلاعات کا مربوط اور مستحکم نظام موجود ہے، ان میں یک نفری خطوط کے تحت منظر عام پر آنے والے اخبارات قومی تنظیم اور کسی تک فاروقی تنظیم ہی ہیں۔ اس کے علاوہ بہار کی اردو صحافت میں اپنی موجودگی درج کرانے والے دیگر مقامی اخبارات میں سے کوئی بھی روزنامہ ایسا نہیں جسے ترقی یافتہ عہد کا نمائندہ اخبار گردانا جا سکے۔ پندار، سنگم، انقلاب جدید، پیاری اردو، ایک قوم، نوید صبح، المومن، ہمارا سماج، حالات بہار اور ان دنوں وغیرہ اخبارات تک عام قارئین کی رسائی نہیں ہے یا بالکل کم ہے

کیونکہ یہ وہ اخبارات ہیں جو پٹنہ کی چند گلیوں، چوراہوں اور محلوں میں اپنا چہرہ تو دکھا دیتے ہیں لیکن بہار کی اردو صحافت کو نئی جہت عطا کرنے یا اردو صحافت کو بہار میں زندہ رکھنے میں ان کا کہیں کوئی رول دکھائی نہیں دیتا۔ بعض تجزیہ کاروں کا یہ خیال برحق معلوم ہوتا ہے جس میں یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ" ریاست بہار میں بھی سرکاری اشتہارات پر قبضہ جمانے کی غرض سے بڑے پیمانے پر ایسے فرضی لوگ وادی صحافت میں در آئے ہیں جنہیں صحافت سے کوئی سروکار نہیں'۔ اس خیال کو مسترد کرنے کی گنجائش اس وجہ سے نہیں نکل پاتی کیونکہ بہار میں کم از کم 30-25 اردو اخبارات ایسے ہمیں نظر آ جاتے ہیں جن تک عام قارئین کی رسائی بالکل نہیں ہے لیکن اپنے ترسیلی دعوؤں میں ان میں سے کوئی بھی اخبار ایسا نہیں ہے جو ہزاروں کی تعداد میں نہ چھپتا ہو۔ اب ایسے میں یہ سوال ضرور کھڑا ہو جاتا ہے کہ آر این آئی اور ڈی اے وی پی کو فراہم کردہ اعداد و شمار کی اصلی حقیقت کیا ہے۔

بہار کے بازارِ صحافت میں راشٹریہ سہارا ...

بڑے یا کارپوریٹ میڈیا گھرانہ سے تعلق رکھنے والے جو دو اردو اخبارات بہار سے شائع ہو رہے ہیں، اُن میں پہلا نام روزنامہ راشٹریہ سہارا کا لیا جا سکتا ہے کیونکہ 'انقلاب' سے قبل روزنامہ راشٹریہ سہارا نے بہار کی وادیٔ اردو صحافت میں اپنی موجودگی درج کرائی، لیکن ان دونوں ہی اخباروں (راشٹریہ سہارا اور انقلاب)) میں مقامی خبروں کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوا کرتی جو انفرادی کوششوں کے تحت منظر عام پر آنے والے اخبارات کو حاصل ہے۔ حالانکہ راشٹریہ سہارا اور انقلاب نے مقامی خبروں کو مناسب انداز میں کور کرنے کیلئے علاقائی صفحات میں اضافہ سے کبھی گریز نہیں کیا ہے۔ راشٹریہ سہارا نے بہار میں اپنی اشاعت کے آغاز کے بعد اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ وہ دہلی کی طرح بہار میں بھی نمبر ون پوزیشن حاصل کر لے، حالانکہ ابھی تک اس ضمن میں اسے کوئی کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ راشٹریہ سہارا کے پٹنہ ایڈیشن میں عظیم آباد کے علاوہ گیا، شیر گھاٹی، بکسر، سہسرام، حاجی پور، چھپرا، سیوان، گوپال گنج، مظفر پور، دربھنگہ، مدھوبنی، موتیہاری، بیتیا، کٹیہار، برونی، بیگوسرائے، سہرسہ، پورنیہ، کھگڑیا اور کشن گنج وغیرہ کی خبروں کو زیادہ اہمیت کے

ساتھ شامل اشاعت کیا جاتا ہے تا کہ قارئین کے درمیان یہ تاثر ابھر سکے کہ اس اخبار نے ریاست کے معاملات و مسائل کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اسی شدت کے ساتھ مقامی نوعیت کے معاملوں کو اخبار نے اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے، جس اہتمام کے ساتھ مقامی اخبارات مقامی خبروں کو شامل اشاعت کرنے کے عادی ہیں۔ یعنی راشٹریہ سہارا نے بہار میں قدم رکھنے کے بعد اس بات کی کما حقہ کوشش کی کہ وہ خود کو اس انداز میں متعارف کرائے کہ قارئین یہ محسوس کریں کہ یہ اخبار بھی ان کا اپنا اخبار ہے۔ اس کوشش کے تحت بعض اوقات غیر اہم اور غیر مناسب خبروں کو بھی اہمیت کے ساتھ شائع کیا جاتا رہا اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں اب بھی جاری ہے۔ راشٹریہ سہارا نے جب بہار میں اپنی اشاعت کا آغاز کیا تو اس وقت قومی تنظیم اور فاروقی تنظیم وغیرہ اخبارات گھبراہٹ کے شکار بھی نظر آئے۔ ان میں سے بعض کو یہ خطرہ بھی لاحق ہوا کہ جس طرح بڑی مچھلیاں تالاب میں چھوٹی مچھلیوں کو زندہ نہیں رہنے دیتیں، کہیں اسی طرح بہار کی اردو صحافت میں راشٹریہ سہارا کا داخلہ مقامی اخبارات کی اشاعت کیلئے مضر نہ ثابت ہو۔ چنانچہ اس قسم کی فکر مندیاں اخباری صفحات میں دیکھی جانے لگیں اور یہ سلسلہ ابتدائی چند مہینوں تک برقرار رہا لیکن دوسری جانب راشٹریہ سہارا نے تنازعات سے اپنا دامن بچاتے ہوئے ایسی حکمت عملی اختیار کی جو صحت مند اردو صحافت کے ارتقا کا باعث ہی نہیں بنا بلکہ صحت مند ترسیلی مسابقہ کا بھی ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ ریلوے اسٹیشنوں، چوک چوراہوں اور بازار عام کے اہم مراکز پر جہاں کل تک ہندی کے ساتھ ہی ساتھ اردو کے اخبارات خال خال نظر آیا کرتے تھے، راشٹریہ سہارا نے ان جگہوں پر نہایت فعال حکمت کے ساتھ اپنی نمائندگی درج کرانے کی کوشش کی۔ خصوصاً بہار کے مقامی ٹرینوں میں سفر کرنے والے اردو قارئین کیلئے راشٹریہ سہارا کی آمد سے قبل تک یہ ممکن نہ تھا کہ وہ دوران سفر اردو کا کوئی اخبار خرید سکیں کیونکہ بہار کا کوئی بھی اخبار ہاکروں کے ذریعہ ٹرینوں میں اپنے اخبار کی ترسیل نہیں کیا کرتا تھا۔ راشٹریہ سہارا نے اس کمی کو نہ صرف یہ کہ پورا کیا بلکہ ایسے تمام مقامات میں جہاں اردو اخبارات کی جگہ خالی تھی، اس اخبار نے اپنی نمائندگی ہی درج نہیں کرائی بلکہ اردو صحافت کے دائرہ کو عملی لحاظ سے وسعت بھی عطا کیا۔ 20 جولائی 2006 کو پٹنہ سے اپنی اشاعت کا آغاز کرتے

ہوئے راشٹریہ سہارا نے بہر حال یہ پیغام دینے کی کوشش ضرور کی کہ وہ بہار کی اردو صحافت پر مکمل طور پر قبضہ جمانے کا خواہشمند ہے۔ اسی کوشش کے تحت ابتدائی ایام میں ہی 16 صفحات پر مشتمل اخبار نذر قارئین کیا گیا۔ 16 صفحات کیا تھے؟ مختلف ایڈیشن سے درآمد شدہ علاقائی خبروں کا انہیں گلدستہ کہہ لیجئے! انہیں پٹنہ ایڈیشن میں شامل اشاعت کرتے ہوئے غالباً قاری کو یہ بتانا مقصود تھا کہ راشٹریہ سہارا قومی تنظیم یا دیگر مقامی اخبارات کے مقابلہ کافی بھاری بھرکم اخبار ہے۔

ذہن نشیں رہے کہ اُن ایام میں قومی تنظیم اور فاروقی تنظیم سمیت بہار کے زیادہ تر اردو اخبارات محض 8 صفحات پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ ایسے میں راشٹریہ سہارا نے 16 صفحات کا اخبار نذر قارئین کیا تا کہ قارئین کے درمیان اس فکر کی ترویج ہو کہ راشٹریہ سہارا 16 صفحات پر مشتمل اخبار ہونے کی وجہ سے اولیت کا حقدار ہے لیکن یہ بھی نوٹ کرنے کی بات رہی کہ راشٹریہ سہارا نے صفحات کی تعداد بڑھاتے ہوئے چونکہ مقامی خبروں کیلئے فراخدلی نہیں دکھائی بلکہ دوسرے ایڈیشن سے درآمد شدہ صفحات کو ہی شامل اشاعت کیا۔ اس وجہ سے قارئین کے درمیان کوئی مثبت اور بامعنی پیغام نہیں ابھر سکا۔ یہ ایک فطری نتیجہ کہلا سکتا ہے کہ 8 صفحات پر مشتمل اخبارات کو قارئین کے ذریعہ اولیت دینے کی کوشش ہوئی اور 16 صفحات پر مشتمل اخبار اہمیت کے لحاظ سے ثانوی زمرہ میں جگہ پانے کا مستحق ٹھہرا۔

بہار کے بازارِ صحافت میں انقلاب ...

راشٹریہ سہارا کی اشاعت کا سلسلہ بہار سے شروع ہونے کے بعد ریاست میں اردو صحافت کو ایک نئی زندگی ملی، اس سچائی سے بھلے ہی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اِس سے بھی بڑی حقیقت یہ ہے کہ ’انقلاب‘ نے اپنا اشاعتی سلسلہ شروع کرتے ہوئے ریاست میں اردو صحافت کو انقلابی تبدیلیوں کا گواہ بنانے کا بھی پیغام دیا۔ یہ اور بات ہے کہ ’انقلاب‘ کی آمد کے بعد بھی بہار کی اردو صحافت میں کسی طرح کا انقلاب نہ آسکا۔ ایسے وقت میں جبکہ روزنامہ راشٹریہ سہارا کی ’’دیدہ زیبی‘‘ کی وجہ سے مقامی اخبارات کو اپنا حلیہ بہتر کرنے پر مجبور ہونا پڑا، خبروں کی پیشکش کے معاملہ میں صحت مند مسابقہ کا نیا سلسلہ شروع ہوا، انقلاب نے دستک دے دی۔ یوں سمجھئے کہ ابھی راشٹریہ

سہارا کی آمد کی شکل میں شروع ہونے والا مسابقہ اپنے جواہر دکھا ہی رہا تھا کہ وہ گھڑی بھی آن پہنچی، جب کارپوریٹ گھرانہ سے تعلق رکھنے والے دوسرے اردو اخبار انقلاب نے بہار کی جانب رخ کیا۔ انقلاب نے بہار سے اپنی اشاعت کا آغاز شمالی ہند کیلئے توسیعی منصوبہ کے آغاز کے ساتھ ہی کیا۔ پہلے اتر پردیش اور دہلی میں 'انقلاب' نے اپنی موجودگی درج کرائی اور اس کے بعد اِس نے بہار کا رخ کیا۔ خاص بات یہ بھی رہی کہ پٹنہ کے علاوہ مظفر پور اور بھاگلپور سے بھی 'انقلاب' کی طباعت کا باضابطہ بندوبست کیا گیا جس کی وجہ سے مقامی کہلانے والے ان تمام اخبارات کیلئے پریشانیوں کا بھی ایک نیا دور شروع ہو گیا، جو اب تک بہار کے اردو حلقوں میں مقبول و معروف اخبارات کی حیثیت سے اپنی مخصوص شناخت رکھتے تھے۔ مظفر پور اور بھاگلپور سے راشٹریہ سہارا یا قومی تنظیم وغیرہ اخبارات کی طباعت کا چونکہ کوئی بندوبست نہیں تھا، اس لئے 'انقلاب' کیلئے یہ آسان ہو گیا کہ وہ یہاں قدم جمائے۔ دیر رات تک کی خبروں کو شامل اشاعت کرتے ہوئے بہرحال انقلاب نے پٹنہ کے علاوہ مذکورہ دونوں طباعتی مراکز سے اپنے اخبار کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا۔ نتیجہ یہ سامنے آنے لگ گیا کہ جو خبریں راشٹریہ سہارا اور قومی تنظیم کے علاوہ دوسرے مقامی اخبارات میں بوجہ خاص بروقت شائع نہیں ہو پا رہی تھیں، ایسی خبروں کو انقلاب نے نمایاں انداز میں فوکس کرنے کی کوشش کی۔ یہ حکمت عملی 'انقلاب' کو جلد از جلد بہار میں مقبولیت دلانے کا بھی ایک اضافی سبب بن گئی لیکن اس سچائی سے بھی منھ موڑنا مشکل ہے کہ 'انقلاب' بھی مقامی خبروں کو اُس انداز میں شاملِ اشاعت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس طرح مقامی خبروں کی اشاعت کی طویل روایت یہاں کے مقامی اخبارات میں موجود ہے۔ اس کے باوجود انقلاب کو مخصوص طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا کیونکہ نوٹ کرنے والی بات یہ بھی ہے کہ مخصوص مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے قارئین کیلئے انقلاب میں دلچسپی کا بھرپور سامان فراہم کرایا گیا۔ علاوہ ازیں خبروں سے الگ ہٹ کر 'انقلاب' میں ایسا بہت کچھ مواد پیش کیا جا رہا ہے جو عام قارئین کیلئے بھی دلچسپی کا سبب بن رہا ہے۔ لہٰذا ایسے قارئین جو دو اخبارات کی خریداری کی سکت رکھتے ہیں، انہوں نے 'انقلاب' کو پابندی کے ساتھ خریدنا شروع کر دیا۔ 'انقلاب' نے بہار کی صحافت میں بڑی

یا انقلابی تبدیلی لائی ہے، یہ کہنا بہرحال ابھی جلد بازی ہوگی کیونکہ یہ نتیجہ اخذ کرنے کیلئے ہمیں کچھ اور مدت تک انتظار کے عمل سے گزرنا ہوگا تاکہ ریاست کی وادئ اردو صحافت میں رونما ہونے والے تغیر و تبدل کے بعد صحافت کا مطلع صاف ہو سکے اور انقلاب کی 'انقلابی' کوششوں کا نتیجہ واضح شکل میں سامنے آ جائے۔

سر دست یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ 'انقلاب' نے بہار میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی یہ پیغام ضرور دے دیا ہے کہ بہت جلد ریاست کی اردو صحافت انقلابی تبدیلی سے دوچار ہوگی۔ چونکہ ابھی بہار کے نشیب و فراز کو پوری طرح یہ اخبار سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے، اس لئے پوری طرح عوامی جذبات کی آئینہ داری کی کوشش سر دست کامیاب نہیں ہو سکی ہے لیکن تجربات کی پیہم کوششیں یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ آنے والے دنوں میں انقلاب ریاست میں اپنی جڑیں نہایت تیزی کے ساتھ مضبوط کرنے میں کامیاب ہوگا کیونکہ اس کی پشت پر سب سے بڑا ہندی اخبار دینک جاگرن کھڑا ہے جس کی مارکیٹنگ اور ترسیل کا دائرہ دونوں ہی نہایت وسیع ہے۔

عام تاثر یہ بھی ہے کہ چونکہ ابتدا میں 'انقلاب' نے بھی راشٹریہ سہارا کی طرح ہی زیادہ سے زیادہ اخباری صفحات دوسرے ایڈیشنوں سے منتقل کراتے ہوئے اخبار کی صورت گری پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی، اس وجہ سے بہار کے عمومی حلقوں میں اسے وہ پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی ہے جس کی توقع ذمہ داران اخبار کو رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ قابل ذکر نکتہ یہ بھی ہے کہ مقامی سطح پر زیادہ سے زیادہ وقائع نویسوں کی ماموری فی الوقت نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ نامہ نگاروں کی کمی یا خلا سے پیدا ہونے والی صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے یہ حکمت عملی ضرور اپنائی گئی ہے کہ جو خبریں انقلاب کے نامہ نگاروں کے ذریعہ فراہم نہیں کرائی جا رہی ہیں، ان خبروں کیلئے اپنے پارٹنر ہندی نیٹ ورک یعنی دینک جاگرن سے مدد لی جائے۔ چنانچہ متواتر دینک جاگرن کے نامہ نگاروں کی اہم اور دلچسپ خبریں اردو کے قالب میں ڈھال کر نذر قارئین کی جا رہی ہیں لیکن اہم بات یہ بھی ہے کہ ہندی سے ترجمہ شدہ جو خبریں 'انقلاب' میں شائع ہوا کرتی ہیں ان میں عموماً اردو داں طبقہ کیلئے توجہ کا سامان بہت کم ہوا کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دینک جاگرن سے ترجمہ کی گئی

خبریں جب 'انقلاب' میں شامل اشاعت ہوا کرتی ہیں تو بعض اوقات اردو قارئین کے مزاج اور موقف کی ترجمانی کی بجائے دلآزاری کا بھی ذریعہ بن جاتی ہیں۔ محل نظر رہے کہ دینک جاگرن میں بالعموم ایسی خبروں کو زیادہ پرکشش انداز میں شامل اشاعت کیا جاتا ہے جو کہیں نہ کہیں مسلم مخالف خبروں کے زمرہ میں جگہ پانے کی مستحق قرار پاتی ہیں۔ معاملہ خواہ فرقہ وارانہ امور سے متعلق ہو یا پھر دہشت گردی جیسے موضوع کا احاطہ کرنے والی ہو، عموماً دینک جاگرن کی خبریں جب اردو کے قالب میں ڈھالی جاتی ہیں تو ایسی خبریں اردو قارئین کیلئے گراں بار ثابت ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا نامناسب بھی نہیں کہ اردو خواں طبقہ کی ترجمانی کے معاملہ میں 'انقلاب' بہت زیادہ بہتر انداز میں اپنا صحافتی فرض نبھانے سے قاصر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکلا جا سکتا کہ انقلاب بہار کی اردو آبادی کے جذبات کا خیال نہیں رکھتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ اردو خواں طبقہ کی ترجمانی کی کوشش بہ اہتمام ہو رہی ہے لیکن وقائع نویسوں اور نامہ نگاروں کی کمی کی وجہ سے یا پھر ان کی عدم مستعدی کی بنا پر جن خبروں کیلئے انقلاب کو دینک جاگرن پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے، وہاں اردو آبادی کی ترجمانی کی کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہی ہے۔ انقلاب نے مقامی سطح پر ادارتی امور کی نگرانی یا سرپرستی کیلئے جن صحافیوں کو مامور کیا ہے، ان کی ذہنیت، ان کا صحافتی طرز عمل، ان کا مزاج و انداز بھی کہیں نہ کہیں اخبار کی تیاری کے عمل کو مخصوص سمت میں لے جانے کا باعث بن رہا ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بے محل معلوم نہیں ہوتا کہ بہار سے تعلق رکھنے والے درجنوں ممتاز صحافیوں نے 'انقلاب' میں قسمت آزمانا اپنی شان کے خلاف سمجھ لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مبتدی کیلئے انٹرویو کے عمل میں شریک ہونا قابل گوارا ہو سکتا ہے لیکن ایسے صحافیوں کیلئے جو کہ صحافت کے طویل تجربات رکھتے ہوں اور بہار کے ممتاز و معروف روزناموں میں کلیدی ذمہ داریاں نبھا رہے ہوں، انہیں اہمیت نہ دینا اور عمومی انٹرویو میں شرکت کیلئے ان ہیں مدعو کرنا ان کی شان کے خلاف ہے۔ بہار کی صحافت میں بہرحال ایسی درجن بھر مقبول و معروف ہستیاں موجود ہیں جن کے اس استدلال کو نظر انداز یا مسترد کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ رہی کہ جب انقلاب کی اشاعت

وطباعت کا سلسلہ بہار کے تین شہروں سے شروع ہوا تو انقلاب کی ادارتی ٹیم میں خورشید ہاشمی کے علاوہ پٹنہ کا کوئی معروف و مقبول صحافی وابستہ نہ ہو سکا۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہے کہ انقلاب بہار میں اردو صحافت کو انقلابی ڈگر پر آگے بڑھانے میں اب تک پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ حالانکہ 16 صفحات پر مشتمل یہ اخبار رنگین طباعت اور تزئین میں دوسرے تمام اردو اخبارات میں سبقت لے جانے کا مستحق ہے۔ مجموعی طور پر اخبار دیدہ زیب بھی ہے، جاذب نظر بھی اور ظاہری حسن سے مالا مال بھی، لیکن مقامی خبروں کو بہ اہمیت شائع کرنے کے حوالہ سے یہ اخبار بہت زیادہ بااثر کردار نبھانے میں ناکام دکھائی دیتا ہے۔

16 صفحات پر مشتمل اخبار کے صفحات کا عمومی طور پر جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخبار علاقائیت پسندی کے رجحان کو تقویت پہنچانے میں اس طرح کامیاب نہیں ہو سکا ہے جس طرح ریاست کے دوسرے اخبارات کلی طور پر علاقائیت پسندی کے دام میں گرفتار ہیں۔ بہرحال ان تمام کوششوں سے قطعی نظر یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا کہ انقلاب بہار میں واقعی اردو صحافت کو انقلابی تبدیلیوں سے دوچند کرے گا آیا نہیں۔ پٹنہ، مظفر پور اور بھاگلپور سے بہرحال اس کی طباعت اور ترسیل کا سلسلہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر بہار کے قارئین کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنے کی کوشش کی گئی اور عوامی جذبات واحساسات کا عمومی طور پر خیال رکھنے کی سعی کی گئی تو آنے والے دنوں میں انقلاب کو ریاست میں سکہ رائج الوقت کا درجہ ضرور مل ہو سکتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ انقلاب کیلئے بہار میں امکانات کی موجودگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پٹنہ، مظفر پور اور بھاگلپور سے اخبار کی طباعت اور ترسیل انقلاب کیلئے نہایت آسان ہو گیا ہے کیونکہ ہندی میڈیا گروپ دینک جاگرن کا پریس اور اس کے دفاتر متذکرہ شہروں میں نہ صرف یہ کہ موجود ہیں بلکہ انقلاب کی ترویج واشاعت میں دینک جاگرن نے سرپرستی و معاونت کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ چونکہ بہار میں دینک جاگرن کو ہندی کا سب سے مقبول و معروف اخبار تصور کیا جاتا ہے اور اس کی مارکیٹنگ کا بھی بڑا زبردست بندوبست ہے لہٰذا یہ بھی فطری ہے کہ انقلاب کے دائرے کو مزید وسعت دینے میں ہر قدم پر دینک جاگرن کا تعاون اسے حاصل رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ابتدائی کوششیں یہ پوری

طرح ظاہر نہیں کرتیں کہ انقلاب کامیابی کے اعلیٰ مدارج طے کرنے میں کامیاب ہے۔اس کی دیگر وجہوں کے علاوہ جو بنیادی سبب مانع وحارج رہی ہے ،اس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ دوسری جو وجہیں قابل ذکر کہلاسکتی ہیں، ان میں مقامی خبروں کی کمی کے علاوہ اچھے مقامی قلمکاروں کیلئے گنجائش فراہم نہ کرانے کا معاملہ بھی سرفہرست ہے۔حالانکہ انقلاب کے پارٹنر ادارہ دینک جاگرن کے وقائع نویس اور نامہ نگار بہار کے ہر ایک شہر میں موجود ہیں حتی کہ کوئی بلاک ایسا موجود نہیں جہاں سے جاگرن کی نمائندگی نہ ہورہی ہو لیکن یہ بھی المیہ ہی ہے کہ ایک مضبوط پارٹنر ہونے کے باوجود انقلاب علاقائی خبروں کو فوقیت دینے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا ہے کیونکہ نہ تو دینک جاگرن کی خبریں ہی ترجمہ کی شکل میں انقلاب کے صفحات کا مناسب انداز میں حصہ بن رہی ہیں اور نہ ہی انقلاب نے بہار میں نامہ نگاروں کا اس طرح جال پھیلا رکھا ہے جس طرح قومی تنظیم نے نامہ نگاروں کی ایک لمبی چوڑی ٹیم تیار کررکھی ہے۔ستم بالائے ستم یہ بھی کہ بہار کے اچھے قلمکاروں کو بھی مسلسل انقلاب نظرانداز کررہا ہے جن کی تحریروں کی اشاعت کی صورت میں ’انقلاب‘ کو اردو برادری کے درمیان بھرپور پذیرائی ملنے کی امید کی جاسکتی ہے۔بہار کے اچھے قلمکاروں، کالم نویسوں اور شوقیہ مضامین لکھنے والوں کو کیوں ’انقلاب‘ نظرانداز کررہا ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے پر معلوم یہ ہوا کہ وہ تمام کے تمام صفحات جن میں اس نوعیت کی تحریریں شامل اشاعت کی جاسکتی ہیں، پٹنہ میں تیار ہی نہیں ہوا کرتیں، بلکہ ممبئی سے براہ دہلی ایسے صفحات کی پٹنہ منتقلی ہوتی ہے۔

بہار میں اردو صحافت 163 سالہ سفر مکمل کرچکی ہے۔(کیونکہ اب تک کی تحقیق کے مطابق 1853 میں بہار کے آرا سے پہلا اردو اخبار’’انوارالانوار‘‘ منظر عام پر آیا تھا) اس طویل عرصہ میں مجموعی اعتبار سے بہار کی اردوصحافت نے شکل وشباہت میں بھی نمایاں طور پر تبدیلی لائی اور طرز اظہار میں بھی انقلابی تبدیلی آ گئی۔یعنی اردوصحافت نے تبدیل ہوتے تقاضوں کے مطابق جدید طریقہ کار کو اپنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔خصوصاً ٹیکنالوجی کو فروغ دینے اور جدید سہولیات سے خود کو آراستہ کرنے کی جو کوشش بہار میں اردو صحافت کے ذریعہ کی گئی ہے ، اسے قابل قدر گردانا جاسکتا ہے کیونکہ بشمول قومی تنظیم بہار کے زیادہ تر اردو اخبارات نے جدت پسندی کی جانب

تیزی کے ساتھ قدم بڑھایا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ایسی تمام تر کوششوں کے باوجود بہار کی اردوصحافت معنوی لحاظ سے ایسا کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکی ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ بہار کی اردوصحافت کی انفرادی پہچان قومی سطح پر قائم ہوگئی ہے۔حالانکہ یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بہار میں ایسے صحافیوں کی کمی نہیں جنہوں نے اپنی متوازن تحریروں کے ذریعہ صحافت کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہ طور خاص بہار کی ادبی صحافت پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑانے کے بعد یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر عہد میں معیاری قلمکار اس وادی کی سیاحی کرتے رہے۔ انجم مانپوری سے لے کر وہاب اشرفی تک ایسی درجنوں معتبر شخصیات موجود دکھائی دیتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دور میں ادب اور صحافت دونوں ہی شعبوں میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔سہیل عظیم آبادی کا تذکرہ ہو، کلام حیدری کا قصہ چھڑے یا غلام سرور کی بات کی جائے ، انہوں نے اپنی ادبی وصحافتی خدمات کے ذریعہ بہار کے سرمایہ ادب وصحافت میں گراں قدر باب کا اضافہ تو کیا لیکن اس کے باوجود ایسی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں ہوسکی ، جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ بہار کی اردوصحافت کو قومی اردوصحافت پر کسی بھی طرح کی برتری حاصل ہوگئی ہے یا پھر یہ کہ بہار کی اردوصحافت نے اپنی کوئی انفرادی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ عہد بہ عہد اردوصحافت کو تندرستی وتوانائی بخشنے والے ہونہار صحافی بہار میں موجود رہے، اور اب بھی ہیں لیکن اس کے باوجود بہار کی اردوصحافت قومی اُفق پر اپنا پرچم اُس طرح بلند نہیں کرسکی ہے، جسے دوسری ریاستوں کیلئے قابل رشک یا لائق تقلید کہا جاسکے۔اس کے برخلاف متواتر ناقص زبان کے استعمال سے کبیدہ خاطر لوگوں کی مضبوط رائے اب یہ بھی ہے بہار کے اردو اخبارات کی مسلسل قرأت سے انہیں وحشت ہوتی ہے کیونکہ انہیں اپنی زبان خراب ہوجانے کا ڈر بھی ستاتا ہے۔واقعی یہ المیہ ہی ہے کہ کل تک لوگ بچوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ زبان سیکھنی ہو تو اخبارات پڑھو اور آج عالم یہ ہے کہ اہل زبان کو مسلسل اردو اخبارات کی قرأت سے خود اپنی زبان کے بگڑ جانے کا ڈر پیدا ہو گیا ہے۔

مضمون نگار کا رابطہ(shahid.hindustan@gmail.com)

مجیر احمد آزاد،، دربھنگہ

دربھنگہ ٹائمز کی خدمات

(دربھنگہ میں ادبی صحافت کے حوالے سے)

دربھنگہ ٹائمز کا ضخیم اور دیدہ زیب شمارہ 'افسانہ نمبر' (جلد ۱۱ شمارہ ۴۔۵) کے بعد ۴۵۲ صفحے پر محیط باوقار اور معیاری 'ناول نمبر' دیکھتے ہی پرانی یادیں تازہ ہو اٹھیں۔ اس کے ابتدائی خدوخال اور کاوشیں ذہن پر دستک دینے لگیں۔ پندرہ روزہ اخباری سائز کا یہ رسالہ اس انداز سے سفر پر گامزن ہوا کہ مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ یوں تو اخبار و رسائل جاری رکھنے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ حوصلہ اور دلجمعی کے ساتھ اپنی دیوانگی کو زندہ رکھا جاسکتا ہے۔ دربھنگہ ٹائمز کے اولین شمارے جنوری ۲۰۰۶ کی پیشانی پر پروفیسر عبدالمنان طرزی کا یہ شعر اس رسالے کے عزائم کا پتہ دیتا ہے۔

قافلوں کے کام آئے کچھ میرا بھی خون دل
رہ گزر پر رکھ دیا میں نے جلا کر اک چراغ

اس شمارہ کی شعری ترتیب میں جگن ناتھ آزادؔ، پروفیسر اویس احمد دوراںؔ اور ڈاکٹر حنیف ترینؔ ترین شامل ہیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (تم چپ رہو)، اقبال انصاری (ناداں) اور علیم صبا نویدی (چیل) کے افسانے قابل ستائش ہیں۔ جبکہ محمد بدیع الزماں، عطا عابدی، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر خالد حسین کے مضامین موضوعاتی تنوع رکھتے ہیں۔ اگلے شمارہ میں حسن امام درد پر بطور خاص صفحات مختص کیے گئے ہیں۔ حسن امام دردؔ نے شعر و نثر دونوں میں یکساں طور پر اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی طویل ادبی کاوشوں کا اعتراف یہ لازمی تھا۔ اس باب میں ان کا افسانہ ''اور آزادی مل رہی تھی''، ''صبا برگد'' ان کی شخصیت اور شاعری کے حوالہ سے صلاح الدین رام نگری اور منظر شہاب کے مضامین درد صاحب سے لیا گیا انٹرویو، عبدالمنان طرزی کا منظوم اظہاریہ اور منتخب غزلیں شامل ہیں۔ مذکورہ اشاریہ ایک کہنہ مشق شاعر و ادیب کو جاننے میں معاون ہے۔ عہد گذشتہ کی تصویر کے

عنوان سے ایک مختصر تعارف اور ایک غزل کی پیش کاری کرتے ہوئے نظر عالم نے شاداں فاروقی کو یاد کیا ہے۔ شاداں فاروقی کا نام آتے ہی ان کا ایک مشہور شعر یاد آیا۔

بڑی تھی کروفر لیکن مآل زندگی یہ ہے چلا جاتا ہے لاشہ دوش پر آہستہ آہستہ

اس شمارہ میں ایک اہم مسئلہ زنا بالجبر پر مشہور منصفہ شمع اختر کاظمی کا مضمون ''اب دیکھنا یہ ہے کہ پہلا پتھر کون مارے گا'' نہایت بصیرت افروز ہے۔ شمارہ ۴۔۵ میں ناصر بغدادی (اذان)، احمد ہمیش (اگلا جنم) اور اقبال انصاری (اپریل کی صبح) افسانے ذہن و دل پر دستک دیتے ہیں۔ عہد گذشتہ کی تصویر کے تحت مولانا عبدالعلیم آسی کا تعارف اور ان کی ایک غزل شامل ہے۔ اس شمارہ میں جمال اویسی کا ترتیب کردہ نظموں اور غزلوں کا انتخاب اور ان سے مکالمہ کرتے ہوئے ترتیب کار متاثر کرتے ہیں۔ اگلا شمارہ اپنے معمول کے مطابق مشمولات کے علاوہ پروفیسر اویس احمد دوراں کے گوشے پر محیط ہے۔ اویس احمد دوراں کیلئے مختص گوشے میں ڈاکٹر محمد حسن، جمال اویسی، مجیر احمد آزاد اور فیاض احمد وجیہ کے مضامین ان کی شخصیت اور کارگذاریوں کو واضح کرتے ہیں۔ ان وقیع مضامین کے ساتھ ان سے لیا گیا انٹرویو اور منتخب نظمیں، غزلیں دوراں صاحب کی خدمات کو روشن کرتی ہیں۔ اسی شمارے میں شفیع جاوید کا افسانہ ''تعریف اس خدا کی'' خالد عبادی کی رباعیات اور جمال اویسی کی ''منتخب غزلیں اور اردو نظمیں عہد بہ عہد'' خاص ہیں۔ نظموں کے ترتیب میں امیر خسرو سے اختر شیرانی تک کے نمایاں نظم نگاران کی ایک ایک تخلیق قارئین کے لئے فرحت و انبساط کا سامان ہے۔ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء کا دربھنگہ ٹائمس گذشتہ شماروں سے الگ ہے۔ اس میں پروفیسر دوراں کی تحریر ''خلد بریں ارمانوں کی'' کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ دیروز اور دریچہ کے عنوان سے ن م راشد اور احسان دربھنگوی یاد کیے گئے ہیں، ساتھ ہی ساتھ مشہور شاعر غلام مرتضیٰ راہی کا گوشہ شامل ہے۔ ان کے فکر و فن پر پروفیسر شارب رودولوی، جمال اویسی، محمد ناظم صدیقی، محمد اسمٰعیل کی تحریریں شامل گوشہ ہیں۔ ان کی شاعری سے غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فیاض احمد وجیہ کا مضمون مصباح کے حوالے سے اور ڈاکٹر جاوید نسیمی کا افسانہ ''شاخ بریدہ کی بہار'' اور دیگر مشمولات نے اس شمارے کو قدرے منفرد بنا دیا ہے۔ اس شمارے میں عورت کی روح

کے عنوان سے استاد شاعر جناب رہبر چندن پٹوی کی طویل نظم پر اثر اور مزیدار ہے۔ سن ۲۰۰۶ء کے آخری شمارے میں افسانوں کی حکمرانی ہے۔ کارمن (قرۃ العین حیدر)، موسم جو بیت گیا (وصال احمد)، اندر کا آدمی (مجیر احمد آزاد)، پانچواں شخص (جنید عالم آروی)، غم گسار (مبینہ امام) افسانے عمدہ ہیں۔ رونق جمال کے آتش پارے (افسانچے) بھی اچھے ہیں۔ جمال اویسی کا مضمون جمیل مظہری کے حوالے سے نہایت پر مغز ہے۔

دربھنگہ ٹائمز کے پہلے سال کا سفر کامیاب رہا ہے۔ اس کے اداریوں میں عصری مسائل و میلانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقامی ادباء و شعراء کی تخلیقات کو بھی جگہ ملی ہے۔ تبصرے کے ضمن میں بھی نئی کتابوں کا تعارف و تجزیہ مبصروں نے غیر جانبدارای سے کیا ہے۔ خیال آباد کی سرخی سے قارئین کے خطوط کو اہمیت سے جگہ دی گئی ہے۔ کل ملا کر اس رسالے کی ترقی کا راستہ ہموار ہوتا نظر آتا ہے۔ پہلے سال کی مضبوط بنیاد پر یہ رسالہ آگے کی جانب رواں دواں ہوتا ہے اور اہل قلم کا حلقہ اور وسیع ہوجاتا ہے۔ جنوری۔ فروری ۲۰۰۷ء کے شمارے میں کملیشور کی تحریر ''ہندی اردو کے نام پر'' لسانی تعصب کے شکار ڈاکٹر گیان چند جین کی گرفت اور جینون تخلیق کار کے دل کی صدا ہے۔ اسی شمارے میں شکیل الرحمٰن، قاضی مشتاق احمد، ڈاکٹر خلیق انجم کی شمولیت ہوئی ہے۔ افسانوں کے باب میں فیاض احمد وجیہ کا افسانہ ''آخری انسان'' اور اقبال انصاری کی کہانی ''تاریخ داں'' شامل ہے۔ دونوں تخلیقات عمدہ ہیں اور قاری کی فکر آ کاش کو متاثر کرتے ہیں۔ اس شمارے کا شعری حصہ ملک کے نامور شعراء کے کلام سے مزین ہے۔ کرشن کمار طور، شکیل اعظمی، علقمہ شبلی، سعید رحمانی، ہارون سیٹھ، حمایت علی خاں، سیفی سرونجی، بھگوان داس اعجاز وہ اسمائے گرامی ہیں جن کی تخلیقات سے دربھنگہ ٹائمز کے صفحات جگمگا رہے ہیں۔

کوئی بھی ادبی رسالہ اپنی کاوشوں سے ماحول سازی کا عمل پیش کرتا ہے۔ رسالے مشمولات سے اس کی پسند و ناپسند اور نظریے کا علم ہوتا ہے۔ ٹائمز نے ادب کی صحت مند روایات کو اپنا شعار بنایا اور ثابت قدمی سے نئے رجحانات سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ مئی ۲۰۰۹ء کا شمارہ میرا جی کا اجنبی مسافر (جمال اویسی)، ''محمد بدیع الزماں ایک بیحد منفرد اقبال شناس'' (پروفیسر وہاب

اشرفی)، ''علامہ قتیل دانا پوری کی نعت گوئی (ڈاکٹر فرقان احمد انجم)، ''جوگندر پال کی جمنائی (فیاض احمد وجیہ) مضامین سے آراستہ ہے۔ ڈاکٹر ترنم ریاض (ٹیڈی بیئر)، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (دو افسانچے)، ویریندر پٹواری (ان کہی محبت کی داستان)، رونق جمال (کمال کا کنواں)، مراق مرزا (ایک ٹی وی شو کے تین کردار)، کی کہانیاں دربھنگہ ٹائمز کے اس شمارے کو وقیع بناتی ہیں۔ شعری حصے میں شمیم فاروقی، شان الرحمٰن، عطا عابدی، شارق عدیل، گوتم مترا گوتم، ڈاکٹر ولی مکرانی، رونق شہری وغیرہ کی غزلیں رنگ بکھیرتی ہیں۔

اردو کے رسائل و جرائد کی تاریخ دیکھی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا سفر رفتہ رفتہ آگے بڑھا ہے۔ تخلیق کاروں کی وابستگی اور قارئین کی تعداد میں اضافہ نیز نظریہ سازی میں معاونت ایسے نکات ہیں جن سے ادبی رسائل کا معیار و وقار فزوں تر ہوتا ہے۔ اس کا رنگ و روپ تبدیل ہوتا ہے اور ظاہری گٹ اپ بھی خوش نما اضافے ہونے لگتے ہیں۔ دربھنگہ ٹائمز کے مذکورہ شمارے کا سائز تھوڑا بڑا تھا۔ رنگ کا استعمال میں بھی سیاہ و سفید کا غلبہ تھا۔ لیکن جلد ہی اس رسالے نے اخبار نما سائز کا چولا اتار لیا اور کتابی شکل میں دیدہ زیب سرورق کے ساتھ قارئین کی دلچسپی اور پسند کا سامان بن گیا۔ اب ۲۰۱۱ء کا پہلا شمارہ دیکھئے تو اس رسالے کے منتظمین کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ خوبصورت ٹائٹیل پر یہ شعر خوب پھبتا ہے:

حوادث سے جو تنہا لڑ رہا تھا اسی بوڑھے شجر کا حوصلہ تھا

اس کے مشمولات پر نگاہ ڈالئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نمائندہ ادباء کی تحریروں کو رسائل کے ذریعہ عام کرنے کا تجربہ اس کا نمایاں پہلو ہے۔ پروفیسر قمر رئیس، وزیر آغا، پروفیسر محمد حسین، ڈاکٹر جمال اویسی، قمر جہاں وغیرہ کے مضامین سے مزین یہ شمارہ شمائل احمد، شفیع مشہدی، فخر الدین عارفی، مناظر عاشق ہرگانوی، شفیع جاوید، گلشن کھنہ کی تخلیقات کی آنچ رکھتا ہے۔ اس کے کئی افسانے اور مضامین قارئین کے تسکین کا سامان ہیں۔ اس شمارے میں چند نوجوان قلم کاروں کی تحریریں بھی متاثر کرتی ہیں۔ شعری حصے میں خورشید اکبر، ڈاکٹر شعیب راہی، شہریار، شمیم فاروقی، سلطان اختر، گوتم مترا وغیرہ کی تخلیقات صدائے دل معلوم پڑتی ہیں۔ سن ۲۰۱۴ء کا شمارہ پورے آب و تاب کے

ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور مضامین کی تنوع اور عصری ادب کے خدوخال نمایاں کرتے ہوئے قارئین کو مطالعہ کے لئے مہمیز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اپنے پسندیدہ موضوع جمالیات کو بروئے کارلاتے ہوئے ستیہ پال آنند کی شاعری کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ اردو میں تراجم کی صورت حال پر ڈاکٹر قاسیم خورشید نے ایمانداری سے تجزیہ کرتے ہوئے اس جانب مزید توجہ دینے کی بات کی ہے۔ سید اظفر رضوی نے فیض احمد فیض کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے کہ فیض کی شخصیت کے کئی رنگ سامنے آگئے ہیں۔ تسلیم الٰہی زلفی نے پروین شاکر کے تعلق سے ذاتی باتیں اور یادوں کو الفاظ کا جامہ عطا کیا ہے۔ اس مضمون کا خاتمہ شعر پر ہوا ہے جس میں صداقت ہے اور ایک کسک بھی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

کس دھیان سے پرانی کتابیں کھلی تھیں کل آئی ہوا تو کتنے ورق ہی الٹ گئے

مشرف عالم ذوقی نے ''کچھ نالہ شب گیر کے بارے میں'' جو لکھا ہے اس کی بنت میں عورت کی آزادی، خودمختاری اور کھلی فضا میں سانس لینے کی چاہت کا جذبہ کارفرما ہے۔ ڈاکٹر جمال اویسی نے بشیر بدر کی غزلوں سے مباحثہ کرتے ہوئے چند غزلیں پیش کی ہیں۔ فیاض احمد وجیہ نے جمال اویسی کی نظم کی قرات اور اس سے پیدا شدہ فکری جہات کو اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ کھویا ہوا زمان و مکان کی تفہیم و تنقید کے لئے جو قاری اساس پیمانہ وضع کیا گیا ہے اس کے درون میں تخلیقی امیج، معاشرتی تشخص نیز اردو شاعری کے نمایاں و روشن پہلو کے ساتھ تجرید کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔ انور شمیم نے عالم خورشید کی شاعری پر کارزیاں کے حوالے سے گفتگو کی ہے تو شیخ عقیل احمد نے فرید پربتی کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی کی تخلیق ''نثر نگاران دربھنگہ'' کی پہلی قسط اس شمارے میں شائع ہوئی ہے جسے بعد میں مدیر دربھنگہ ٹائمس منصور خوشتر نے الگ سے کتابی شکل دی۔ افسانوں کے باب میں یہ شمارہ مضامین کے مقابلے میں قدرے قلیل صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ تسخیر (نعیم بیگ)، شریف آدمی (اقبال حسن آزاد)، ڈاک خانے کے ملازم (دیپک بدکی)، افسانے عصری حالات و مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ شعری حصہ میں احمد اشفاق فلق، ناصر امروہوی، ناصر ملک، فرزانہ فرحت اور شفیق مراد کی غزلیں اردو شاعری کے حسین پلوں سے آشنائی

کراتے ہیں۔ اس کو کڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے ماضی قریب میں شائع ہوئے دوتین شماروں پر نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ رساہ کا انداز پوری طرح تبدیل ہو کر نئی صورت میں قارئین کو متاثر کرنے لگا ہے۔ اب پوری طرح گٹ اپ کتابی شکل کے رسائل جیسا بن گیا ہے اور طباعت و پیش کش میں حسن کاری دیکھی جاسکتی ہے۔ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۵ء کا مشترکہ شمارہ دوسو چھپن صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں اکیس مضامین، نو افسانے شامل ہیں۔ مضامین میں تنوع ہے۔ منٹو، مولانا آزاد، وزیر آغا، کرشن چندر، صلاح الدین پرویز، ذکیہ مشہدی کے فکروفن کے حوالے سے مشاہیر ادباء کے مضامین معلومات افزا ہیں۔ طویل مختصر افسانہ کی تحقیقی جستجو ممتاز شریں کی تحریر سے عیاں ہے۔ ناصر عباس نیر نے ساختیات کی اہم اصطلاح سے بصیرت افروز مکالمہ کیا ہے۔ ادبی تھیوریز کے باب میں یہ مضمون اہمیت رکھتا ہے۔ احتشام الحق نے تبصرہ نگاری پر سیر حاصل مضمون قلم بند کیا ہے اس کے محتویات میں تبصرہ نگاری کی تکنیک اور عصری تقاضے شامل ہیں۔ افتخار راغب، احمد مشتاق، عبدالمنان طرزی، فرہاد آزاد، اسلم جمشید پوری، پروفیسر ظفر حبیب وغیرہ کی تخلیقات (نثر/شاعری) کے حوالے سے مضامین بھی شامل اشاعت ہیں۔ کوثر مظہری نے قرات اور مکالمہ کے عنوان سے اپنے تحقیقی و تنقیدی مضمون میں مشرقی و مغربی افکار سے اپنی فکر کو مدلل بنایا ہے۔ آہٹ (نعیم بیگ)، شاہ محمد کا ٹانگہ (علی اکبر ناطق)، وجود (شمش درانی)، اسکاؤٹ گرل (پرویز شہریار)، گلٹی (فرخ ندیم)، قاتلوں میں لپٹی لاش (ماہ لبیس صدیقی)، الم آشنا دل (دیپک بدکی)، مٹی کی ٹھوٹھیاں (سین علی) اور پردہ (احمد نثار)، افسانے لائق مطالعہ ہیں اور ذہن کو طنابت بخشتے ہیں۔ جمیل مظہری، عطا عابدی، سید عقیل شاہ اور افروز عالم کی غزلوں کی اشاعت بطور خاص کی گئی ہے۔ اس شمارے کی نظمیں بھی اپیل کرتی ہیں۔ احمد سہیل، مرزا ساجد، مرغوب اثر فاطمی، احسان ثاقب وغیرہ کی مشمولہ غزلوں کا رنگ نکھرا ہوا ہے اور اس شمارے کو مکمل کرنے میں مددگار رہے۔ ابھی حالیہ شمارہ جسے افسانہ نمبر کا نام دیا گیا ہے کا ذکر ضروری جان پڑتا ہے۔ اس رسالے کی یہ کاوش نہ صرف قابل تحسین ہے بلکہ باب افسانہ میں اسے سرخروئی ہونے کے امکان روشن معلوم پڑتے ہیں۔ پوری طرح افسانوں کے لئے مختص شمارہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ عصری منظر نامہ پر افسانہ نگاری کے

حوالے سے نمایاں اسمائے گرامی کے تخلیقات اس افسانہ نمبر میں جمع ہیں۔ ایک ساتھ بیس افسانے الگ الگ موضوعات پر ہمارے عصر کو نگاہ اور دل سے محسوس کراتے ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کے نمایاں رنگ اور معاشرے کی اصل صورت گری موجود ہے۔ ان میں محبت بھی ہے تو نفرت کا جذبہ بھی۔ سماج کی بے رخی بھی ہے تو گلے لگانے والوں کا قصہ بھی۔ اجتماعی فکر کی پیش کاری ہے تو انفرادی عمل کا سراغ بھی ہے۔ ان افسانوں سے براہ راست محظوظ ہونے کے لئے ان کی قرأت ضروری ہے۔ بالغ النظر قاری انہیں پڑھ کر صرف عصری افسانہ نگاری کے خدوخال اور امکانات کو جاننے میں کامیاب ہوگا بلکہ انسانی زندگی کے حالات واقعات نگاہوں کے سامنے گذرنے کی کیفیت سے بھی ضرور دو چار ہوگا۔ اس شمارے کے دوسرے حصہ میں افسانوں کے حوالے سے مضامین شامل ہیں۔ مشمولہ بیس مضامین اردو افسانہ نگاری کے مشہور تخلیق کاروں کے حوالے سے ہیں۔ کرشن چندر، رشید جہاں، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، غزال ضیغم، اختر اورینوی، الیاس احمد گدی وغیرہ کی افسانی نگاری کے نمایاں پہلوؤں پر مضامین اس ترتیب میں رکھے گئے ہیں۔ اس میں پرانے اور نئے لکھنے والے موجود ہیں۔ کل ملا کر یہ شمارہ مشمولات کے اعتبار سے یادگار ہے اور اگر اہل فکر و نظر تک اس کی رسائی ہو جائے تو اپنی ترتیب کی بنا پر اس کے افادی پہلو اور بھی نمایاں ہو جائینگے۔ مذکورہ مشمولات کے علاوہ تبصرے، خیال آباد اور ادرایہ مستقبل عوانین کے تحت تحریر کیے گئے ہیں۔ 'ناول نمبر' کی اس قدر پذیرائی ہو رہی ہے کہ اس کا مطالعہ ان حضرات کے لئے ناگزیر ہے جو عصری تناظر میں ناول اور ناول نگاران کے جذبات جاننا چاہتے ہیں۔ اس کے مشمولات میں ناول نگاری کا ماضی اور حال روشن ہے۔

اس تاثراتی مطالعے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ادبی رسائل کے سروکار، قارئین کی پسند و ناپسند اور ناقدین کی تثلیث سے جو نتیجہ برآمد ہوا ہے اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ادبی رسائل کے خون کی حرارت میں جو چیزیں درکاری ہوتی ہیں ان میں سب سے اہم ہے دیانت داری۔ دیانت داری کا تقاضہ تو یہ گر ہزنہیں کہ کسی کے کاوشوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یوں بھی اردو رسائل و جرائد کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ جو رسالے شائع ہو رہے ہیں ان کی کوششوں سے چشم

پوشی زبان وادب کے لئے سم قاتل ہے۔ دربھنگہ ٹائمز کے شماروں کا ایک جائزہ آپ کی نگاہوں سے گزرا ہے۔ اس کے مشمولات سے آپ روبرو ہوئے ہیں۔ فیصلہ باذوق قاری کریں گے کہ اس رسالے کی محتویات میں جو تابناکی، توانائی اور نیاپن ہے کیا اس کا استقبال اور اعتراف نہیں ہونا چاہئے؟

☆☆☆

☆نوٹ۔ دربھنگہ میں عصری ادبی صحافت کا مطالعہ خوشگوار لمحوں سے سرشار کرتا ہے۔ یہ اس خطہ کی فعال صحافتی کارگزاریوں کا امین ہے تو یہاں کی ادبی روایت کا تسلسل بھی۔ فی الوقت دربھنگہ سے شائع ہونے والے رسائل کی دھمک دور تک سنائی دیتی ہے۔ خوف طوالت سے میں نے ان رسائل میں سے صرف ایک (دربھنگہ ٹائمز) کی کارکردگی کو اپنی اس تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ ممکن ہے اس کے ذریعے یہاں کی ادبی صحافت کا کوئی نقش بن سکے۔

جمیل اختر

بہار میں جرائد نسواں: صحافت کا ایک گمشدہ باب

خواتین کے ادب اور خواتین کی صحافت کو ہمارے اہل علم و دانش نے کبھی قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادب اردو میں ان کے ذکر تک تو لا حاصل سمجھا گیا۔ شاعری، نثر، فکشن اور تنقید کی جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں بھی سوائے چند کے (بیسویں صدی کی خواتین) کسی اور کا ذکر نہیں ملتا۔ آج ادب کی کوئی ایسی تاریخ نہیں ہے جس میں خواتین کی ادبی حیثیت کو عہد بہ عہد تسلیم کیا گیا ہو۔ اردو ادب کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں خواتین نے شاعری نہیں کی ہے یا شعر نہیں لکھتی رہی ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ کا سرسری ذکر تذکروں میں موجود ہے۔ اور زیادہ تر لکھنے والی خواتین کا کام اور نام ریکارڈ پر نہیں ہے۔ فکشن ہی کو لیجئے اس صنف میں خواتین نے انیسویں صدی کے ربع ا? خر ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ افسانے اور ناول کے ساتھ ساتھ مضامین اور بچوں کی کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ بچوں کا اخبار 'پھول' اور خواتین کے رسالے 'شریف بیبیاں'، 'تہذیب نسواں' اور دیگر نسوانی جرائد کے اوراق اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ ہماری تاریخ میں کیسی اعلیٰ تخلیقی ہستیاں خواتین میں موجود تھیں جو اواخر انیسویں صدی میں اپنی دھوم مچا رہی تھیں۔ یعنی جن کی شہرت آسماں پر تھی۔ 1898 میں 'تہذیب نسواں' نکلا اور اس کی ایڈیٹر محمدی بیگم (شمس العلماء مولوی ممتاز علی کی بیگم اور سید امتیاز علی تاج کی والدہ) تھیں اور محمدی بیگم اپنے وقت کی معروف ادیبہ تھیں۔ انہوں نے تین ناول صفیہ بیگم (1913) 'ا? جکل' اور 'شریف بیٹی' تصنیف کیے۔ اسی طرح بیگم ممتاز علی ایڈیٹر 'مشیر مادر' لاہور (1905) مسز خاموش ایڈیٹر 'پردہ نشیں' آگرہ (1905) بھی اپنے وقت کی قابل قدر ادیبہ شمار کی جاتی ہیں۔ اکبری بیگم (والدہ افضل علی) اور بنت نذر الباقر (بیگم سجاد حیدر یلدرم اور والدہ قر? العین حیدر) بھی انہی اولین ادیبہ میں شامل تھیں۔ بنت نذر الباقر کا ناول 'اختر النساء بیگم' کتابی صورت

میں دار الاشاعت پنجاب لاہور نے 1911 میں شائع کر دیا تھا۔ جب کہ یہ ناول پہلے قسط وار تہذیب نسواں میں شائع ہو چکا تھا اور بے حد مقبول ہوا تھا۔ انہوں نے شروع میں نذر زہرہ بیگم کے نام سے بھی لکھا ہے اور شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کے نام سے - ایسے اور بھی بہت سے نام ہیں جیسے اکبری بیگم کا ناول 'گودڑ کا لال' 1907 میں ہی شائع ہو چکا تھا۔ آبرو بیگم ہمشیرہ ابوالکلام آزاد، راحت خاتون بیگم بدر الدین طیب جی، زہرا فیضی، نثار فاطمہ، سید سجاد حیدر یلدرم کی چچا زاد بہن وغیرہ ایسے بے شمار نام ہیں جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ربع اول سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن میں خواتین افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، کہانی کار، شاعرہ بچوں کا ادب لکھنے والیوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود تھیں۔ تخلیق کار خواتین کے اتنے جگمگاتے روپ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ادبی تاریخ نگاروں نے انہیں نظر انداز کیا۔

اُردو ناول کی تاریخ ہو یا افسانے کا عہد بہ عہد جائزہ، مضمون نگاری کی صنف کا بیان ہو یا بچوں کے ادب کی تاریخ کا ذکر، دبستاں شاعری کا معاملہ ہو یا ادب کی کسی بھی صنف کی تاریخ ہو خواتین کے ذکر سے عام طور پر گریز کا رویہ ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب کہ ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر اور مرزا رسوا کے عہد میں بھی خواتین افسانے اور ناول لکھ رہی تھیں، جس طرح نذیر احمد کے یہاں ابتدائی خد و خال تلاش کیے گئے عبدالحلیم شرر اور مرزا رسوا تک ناول کی بنیاد کھڑی کی گئی۔ ہمارے ادبی تاریخ داں کی نظر اس عہد کی خواتین لکھنے والیوں کی طرف کیوں نہیں گئی ان کا ذکر کر کے غیر معیاری قرار دے کر ہی سہی بات ختم کر دیتے تو کم از کم تاریخ میں ان کا ذکر اس صنف کی کاوش کے سلسلے میں تو ہو جاتا لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔ 'اردو ناول کی تنقیدی تاریخ' ہو یا 'اردو ناول سمت و رفتار' یا عبدالقادر سرمدی کی 'دنیائے افسانہ' یا 'وقار عظیم' کی 'داستان سے افسانے تک'، سہیل بخاری کی 'اردو ناول نگاری' ہو یا یوسف سرمست کی 'بیسویں صدی میں اردو ناول'، سبھی ان کے ذکر سے عاری ہیں۔ خواتین کی بات آتی ہے تو اردو ناول اور افسانے کا سفر رشید جہاں اور عصمت چغتائی سے شروع ہوتا ہے اور ان سے قبل کی لکھنے والیوں کا ذکر تک نہیں ہوتا۔

ذرا غور فرمائیے ناول نگار خواتین میں رشید النساء، نادر جہاں، اکبری بیگم، محمدی بیگم، مسز

عباس طیب جی، صغرا ہمایوں مرزا، عباس بیگم، نذر سجاد حیدر وغیرہ اور افسانہ نگاروں میں، عظمت النساء، نذر سجاد حیدر، مسز یوسف زماں، رضیہ ناصرہ، ایس نصرت رعنا وغیرہ کا ذکر کسی بھی کتاب میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ جبکہ اصلاحی، رومانی اور معاشرتی افسانے اور ناول اس دور میں ان لوگوں نے لکھا جب ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی اور تعلیم نسواں کے لیے فضا سازگار بنائی۔ تب ہی رشید النساء کا ناول 'اصلاح النساء' 1881 میں آیا۔ نذیر احمد کے یہ ناول اگر تحریک نسواں اور تعلیم نسواں کا نقطۂ آغاز ہیں تو رشید النساء کا ناول 'اصلاح النساء' تحریک کا پہلا ثمر اور نثر میں نسوانی ادب کا نقطۂ آغاز۔

رشید النساء کا ناول 'اصلاح النساء' (1881) کے بعد نادر جہاں کا 'افسانہ نادر جہاں' یا 'فسانۂ طاہرہ'، مسز سراج الدین کا ناول 'دکن' ماہنامہ خاتون علی گڑھ میں 1905 میں قسط وار شائع ہوا۔ اکبری بیگم کا ناول 'گودڑ کا لال' (1907) محمدی بیگم کا ناول صفیہ بیگم (1913)، 'آجکل' شریف بیٹی، مسز عباس طیب جی کا ناول 'شوکت آراء' (1917) تین جلدوں میں، بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک منظر عام پر آچکے تھے۔ اور ان لوگوں کی اصلاحی کوششوں سے خواتین میں تعلیمی بے داری اس قدر آئی کہ خواتین لکھنے والیوں کی ایک زبردست ٹیم تیار ہوگئی۔ جس کے گواہ خواتین کے وہ رسالے ہیں جو انیسویں صدی کے ربع آخر سے 1920 تک منظر شہود پر آئے اور جن میں لکھنے والیاں زیادہ تر خواتین تھیں۔ لیکن ا?ج ہمارا ادب ان لکھنے والیوں کے تذکرے سے خالی ہے۔

ذرا اور پیچھے نظر ڈالیں تو ہمیں تلاش بسیار کے بعد کچھ نہ کچھ کارنامے خواتین کے ضرور نظر آجائیں گے۔ مثلاً 1803ء میں منور بیگم نے ''گوشۂ عافیت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ (اُردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ ص 55) 1847ء میں خدیجہ النساء نے مشاعرات کا ایک تذکرہ ''افکار خواتین'' مرتب کیا (تذکرۂ شاعرات اُردو ص 152) 1884ء میں بی بی فاطمہ بنت مریم نے ''مراۃ النساء'' لکھی۔ ان کے علاوہ صرف نواب شاہ جہاں بیگم نے 43 کتابیں تصنیف کیں (حیات سلطانی از محمد امین زبیری) اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خواتین نے شعر و سخن کے ساتھ ساتھ

اُردو نثر میں بھی قابلِ قدر سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔

اب جہاں تک صحافت نسواں کی تاریخ کا سوال ہے تو یہ گوشہ بھی اور گوشوں کی طرح بے اعتنائی اور بے توجہی کا شکار ہے۔ اُردو صحافت کی جتنی بھی تاریخیں لکھی گئی ہیں یا صحافت پر اب تک جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں خواتین کے رسائل و جرائد کا ذکر خال خال ہی ملتا ہے۔ اخبارات و رسائل کا سب سے پہلا تذکرہ اختر الدولہ محمد اشرف نقوی نے ''اختر شہنشاہی'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ 1888ء میں شائع ہوا اور 1887ء تک 1518 مطابع گل دستوں، اخبارات و رسائل کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ ان میں صرف پانچ خواتین سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد مولانا امداد صابری کی پانچ ضخیم جلدوں میں ''تاریخ صحافت اُردو'' ہے۔ ان میں ابتدائے صحافت سے 1930ء تک کے تقریباً ڈھائی ہزار اخبارات و رسائل اور گل دستوں کا تذکرہ ہے لیکن خواتین کے صرف 27 اخبارات و رسائل کا ذکر ہے اور وہ بھی بے حد مختصر اور سرسری سا۔ پاکستان میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ''صحافت پاک و ہند میں'' اور ڈاکٹر طاہر مسعود نے ''اُردو صحافت انیسویں صدی میں'' جیسی بڑی جامع اور وقیع کتاب تصنیف کی لیکن ان دونوں حضرات نے نسوانی اخبارات و رسائل کا تذکرہ کرنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ جب صحافت کی تاریخ پر اتنی معرکتہ آرا کتابوں کا یہ عالم ہے تو دوسری چھوٹی موٹی کتابوں کا ذکر ہی کیا۔ صحافت کی دوسری کتابوں میں بھی خواتین کے اخبارات و رسائل کا ذکر برائے نام کیا گیا ہے۔ جیسے یہ موضوع توجہ کے قابل تھا ہی نہیں۔ تحقیق میں یہ موضوع ''اَن چھوا'' ہی رہا۔ صحافت کی تاریخ لکھنے والے محققین نے ادب کی تاریخ لکھنے والوں کی ہی پیروی کی اور اس اہم موضوع کو جانے ان جانے نظر انداز کر دیا۔ جب کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے بلکہ اہلِ علم حضرات بھی صحافت کے باب میں خواتین کے کردار اور کارناموں سے کماحقہٗ واقف نہیں ہیں۔ ابھی تک صحافت نسواں پر کوئی تحقیقی کام اس نوعیت کا نہیں ہو سکا جو اس تشنگی کو دور کر سکے جس کا احساس اس طرف توجہ کرنے پر بار بار ہوتا ہے۔

اواخر انیسویں صدی میں تعلیم نسواں کی تحریک کو گھر گھر پہنچانے اور عورتوں میں بے داری پیدا کرنے کے لیے زنانہ رسائل کے اجراء کی ضرورت محسوس کی جانے لگی اور اس میں پہل عیسائی

مشنریوں کی طرف سے ہوا اور 5 مارچ 1884ء کو لکھنؤ سے اردو اور ہندی میں پندرہ روزہ 'رفیق نسواں' اصلاحی اور تبلیغی ضرورتوں کے لیے جاری کیا گیا۔ اسی سال یعنی یکم اگست 1884ء میں دہلی سے سید احمد دہلوی نے پندرہ روزہ جریدہ 'اخبار النساء' جاری کیا جسے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ ان سے حوصلہ پا کر دوسرے نسوانی رسائل میدان میں آئے۔ پھر لاہور سے شریف بی بی (1893) حیدر آباد سے معلم نسواں (1894) لاہور سے 'تہذیب نسواں' (1898) لکھنؤ سے 'پردہ عصمت' (1900) دہلی سے 'شمس النہار' (1902) متواتر جاری ہوئے۔

ان سبھی نسوانی رسالوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ عورتوں کے اندر دینی اور تعلیمی بیداری پیدا کرنا، جہالت کی تاریکی اور توہم پرستی سے ان کو باہر نکالنا۔ پردے کی بے جا قیود و بند سے اس صنف کو آزادی دلانا۔ شرعی پردہ کے حدود کے اندر علم گاہ جانے کا راستہ ہموار کرنا اور معاشرے کو اس بات کے لیے تیار کرنا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے لیے موثر اور ٹھوس قدم اٹھائے تاکہ گھر اور باہر میں توازن پیدا ہو سکے اور ایک بہتر سماج کی تشکیل کی راہ ہموار ہو سکے۔ لہٰذا تحریک نسواں اور تعلیم نسواں کے حامی زیادہ تر بزرگوں نے رسالے کو موثر ذریعہ بنایا اور تعلیم کی بھرپور وکالت کی۔ معلم نسواں، تہذیب نسواں اور پردۂ عصمت کو ان میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ تینوں رسالے انیسویں صدی کے اواخر میں اس وقت منظر شہود پر آئے جب اس تحریک کو ایک طاقت ور سہارے کی سخت ضرورت تھی اور ان رسالوں نے مخالفت کے باوجود چند برسوں میں ایسی صحت مند فضا بندی کی کہ تعلیم سے رغبت کی ہوا چل پڑی۔ مسلم سماج میں عورتوں کی تعلیم کے لیے ماحول بہت حد تک ساز گار ہو گیا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔

شیخ عبداللہ نے بھی اپنی تحریکِ نسواں میں جان ڈالنے کے لیے ایک نسوانی رسالہ کے اجراء کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور بالآخر جولائی 1904 میں 'خاتون' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا۔ اس رسالے کے اجراء سے تحریک تعلیم نسواں کے مشن کو کامیابی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے میں بے حد مدد ملی۔ جس کے نتیجے میں آخر کار 19 اکتوبر 1906

میں مدرسۂ نسواں علی گڑھ میں قائم ہوا۔

علی گڑھ میں مدرسۂ نسواں کا قیام خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے کئی معنوں میں مفید ثابت ہوا۔ ایک تو مخالفت کا طوفان تھما۔ دوسرے ان حلقوں کو بڑی حد تک خاموش کر دیا جو خواتین کی تعلیم کے حامی تو تھے لیکن خواتین کے گھروں سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا عوام میں اب بھی اثر موجود تھا۔ اور یہ لوگ بیسویں صدی کے آغاز میں بھی تعلیم کے لیے عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس کے قیام کے ساتھ جب اس مہم کا آغاز ہوا تو مخالف حلقہ اس کی کوئی پرزور مخالفت نہیں کر سکا اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر سمجھا۔ اس سے لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ کے خاتمہ میں بڑی حد تک مدد ملی۔

بیسویں صدی کے اوائل عشرہ میں ہی تحریک میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لیے ہندوستان کے طول و عرض سے کئی رسائل و جرائد اس مقصد کے تحت نکالے گئے۔ علامہ راشد الخیری نے ماہنامہ 'عصمت' جاری کیا۔ جسے 'تہذیب نسواں' کے بعد خواتین میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ عصمت خواتین کے رسائل میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان تمام رسائل نے مل کر ہندوستان کے طول و عرض میں نسوانی تعلیم کے پیغام کو گھر گھر پہنچا دیا۔ اس طرح تحریک تعلیم نسواں اور بے داری نسواں کے مشن کو ان بزرگوں کی مساعی جمیلہ سے بے حد فروغ حاصل ہوا۔ انہی جرائد و رسائل کی بدولت بہت سی خواتین علم و ادب سے آراستہ ہو کر طبقہ نسواں کے اصلاحی مشن میں شامل ہو گئیں اور بہت ہی فعال کردار ادا کیا۔ لکھنے والی خواتین کا ایک بڑا گروہ بھی ذہنی آبیاری کے نتیجے میں زرخیز ذہن اور نئی فکر کے ساتھ میدان عمل میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے متحرک ہو گیا۔ اس طرح مردوں کی رہنمائی میں اٹھنے والی تحریک کی کمان بہت سی خواتین نے مختلف صوبوں میں اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح تحریک کو ایک نئی سمت ملی نیا خون ملا اور قافلہ اپنی منزل کی جانب نئے رنگ و انداز کے ساتھ گامزن ہو گیا۔ تحریک کے لیے زمین ہموار کرنے اور ماحول کو سازگار بنانے کے مقصد سے ہندوستان کے چھوٹے بڑے مختلف شہروں سے نسوانی رسالے نکلنے لگے ان شہروں میں دہلی، میرٹھ، لکھنؤ، آگرہ، علی

گڑھ، بھوپال، امروہہ، حیدرآباد، کلکتہ، امرتسر، بمبئی، گجرات، پیلی بھیت، اور پٹنہ شامل ہیں۔

عفت۔ پٹنہ، دسمبر 1926ء

تعلیم نسواں اور بیداری نسواں کے سلسلے میں جو تحریک ملک کے طول و عرض میں چل رہی تھی بھلا صوبۂ بہار اس میں کیوں کر پیچھے رہ سکتا تھا۔ گرچہ تعلیمی اعتبار سے یہ صوبہ شروع سے پسماندہ رہا ہے۔ لیکن تحریکی اعتبار سے ہمیشہ سے سرگرم۔ بلکہ بعض تحریکات تو بہار ہی سے اٹھیں اور ملک کے طول و عرض میں پھیل گئیں۔ لیکن نہ جانے کیوں بہت سی سیاسی تحریکات تو اس سرزمین سے اٹھیں لیکن تعلیمی تحریک یہاں سے کوئی پیدا نہیں ہوسکی۔ عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں تو یہ صوبہ آج بھی بے حد پسماندہ ہے۔ ادھر لوگوں کے خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور تعلیم نسواں کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھا ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کے لحاظ سے ابھی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

ماہنامہ 'عفت' اس صوبے سے نکلنے والا خواتین کا پہلا رسالہ ہے۔ اس سے قبل کسی اور رسالے کا کوئی سراغ اب تک نہیں مل سکا ہے زنانہ رسالوں میں اوّلیت کا اعلان یہ رسالہ خود بھی کرتا ہے۔ اس کی پیشانی پر واضح خط میں یہ لکھا ہوا ہے۔ ''بہار و بنگال کا واحد زنانہ ماہوار صحیفہ'' 'عفت' دسمبر 1926 میں آستانہ گورگانواں ڈاک خانہ کھگول پٹنہ سے جاری ہوا۔ اس کی مدیرہ صالحہ خاتون تھیں۔ یہ 48 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ تین روپے تھا۔ اس زمانے میں سالانہ چندہ عام طور پر یہی ہوا کرتا تھا۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ مسلم خواتین کا ادبی ماہنامہ تھا اور رسالے کی لوح پر لکھا ہوا ہے۔ ''مسلم خواتین کی ادبی سہیلی'' گرچہ اس رسالے میں ازواج مطہرات اور ہندوستان کی مشہور و معروف خواتین کے حالات زندگی کے علاوہ حفظان صحت اور خانگی معاملات پر مضامین شائع ہوتے تھے اور زیادہ تر مضامین خواتین ہی کے تحریر ہوتے تھے۔ رسالے کا غالب رجحان ادب کی طرف تھا۔ اور رسالے میں اس دور کی مشہور لکھنے والی خواتین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ بیگم مظفر الدین ایم اے، حافظ جمال، بیگم مرزا محمد مجتبیٰ ا? فندی اور خدیجۃ الکبریٰ کے مضامین اس رسالے کی زینت بنتے تھے۔ اپنے دور میں اس رسالے کی اپنی خاص پہچان تھی۔

اپنے دور کے زنانہ رسائل میں عفت کا سرورق بھی خصوصیت کا حامل تھا۔ ٹائٹل گل و بوٹے

سے مزین ہوتا تھا۔ اور دور سے ہی دیکھنے والوں کو ایک زنانہ رسالے کا احساس دلاتا تھا۔

مولانا امداد صابری نے بھی اپنی کتاب تاریخ صحافت اُردو جلد پنجم میں اس رسالے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس رسالے پر جنوری 1927ء کے اُردو میں یہ تبصرہ شائع ہوا جس میں اس کی کامیابی کی توقع ظاہر کی گئی۔ تبصرہ یہ ہے:

''یہ ماہانہ رسالہ عورتوں کی اصلاح وفلاح کی غرض سے گورگانوان ڈاک خانہ کھگول پٹنے سے شائع ہوا ہے، صالحہ خاتون صاحبہ اس کی ایڈیٹر ہیں۔ بہار کا غالباً یہ پہلا رسالہ ہے جو اس مقصد کے ساتھ نکلا ہے۔ مضامین کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مقصد اس کے پیشِ نظر ہے اس میں ضرور کامیاب ہوگا۔ لکھنے والوں میں بھی زیادہ تعداد خواتین کی ہے۔ ایسی مجلسیں اور انجمنیں، اخبار اور رسالے، جن کی غرض تعلیم واصلاح نسواں ہے، ان میں جب تک عورتیں خود شریک نہ ہوں ان کے فرائض کو انجام نہ دیں گی، کبھی کامیابی نہ ہوگی۔ اس رسالے کے چلنے اور کامیابی کی توقع اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی کارپرداز اور لکھنے والی زیادہ
تر عورتیں ہیں۔'' (72)

میں یہاں جنوری 1927ء کے شمارے کی فہرست درج کر رہا ہوں تاکہ اس کے معیار ومقاصد دونوں کا صحیح انداز ہوسکے۔ حضرت زینب، سیدہ بیگم مظفر الدین ایم۔اے۔ شادی، ا? غا حشر کاشمیری بتول بنت رسول، مولانا سید مرتضیٰ حسن، عفت اور عورت، محترمہ جمال صاحبہ بوڑھی ماما، جناب شنکری پاشا، احسانِ خاص وعام سید ابوالعاص صاحب۔ گدگدیاں، محترمہ بیگم مرزا محمد مجتبیٰ ا? فندی صاحبہ حیرت انگیز ایجادات، کام کی باتیں خیر مقدم کے مختلف طریقے، حفظان صحت، مجلس عفت، نقد وتبصرہ، ایڈیٹر۔

مضامین کا انتخاب معیاری ہے اور حصول مقصد کی شہادت دے رہا ہے۔ تربیت واصلاح کا جذبہ صادق ہے۔ لکھنے والے تمام کے تمام اپنے عہد کے نامور لوگ ہیں۔ ایک معیاری رسالے کے تمام گُن اس کے اندر ہیں۔ کب تک نکلا اور کب بند ہوا یہ معلوم نہیں ہوسکا۔

''رہبر'' گیا بہار، 1927ء

''رہبر'' گیا، ماہنامہ ''عفت'' کے بعد بہار سے شائع ہونے والا خواتین کا دوسرا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ شاہ محمد عمیر کی ادارت میں ارول، ضلع گیا صوبہ بہار سے 1927ء میں جاری ہوا۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ رسالہ خاص بیواؤں کی حمایت میں نکلا تھا۔ اسی طرح کے خاص مقصد کو سامنے رکھ کر مولوی ممتاز علی نے 1905ء میں ''مشیر مادر'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جو خاص طور پر ان عورتوں کی اصلاح اور ترتیب کے لیے تھا جو مائیں بن چکی تھیں۔ ان کی تقلید میں اس مقصد کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہ محمد عمیر نے بیواو?ں کی حمایت میں اس رسالے کا اجرا کیا۔ جو اپنے ا?پ میں بڑی بات تھی۔ 1926ء کے تہذیب نسواں میں مولوی ممتاز علی نے ''مشیر مادر'' کے اجرا کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

''اس وقت صنف نازک کے لیے جتنے رسالے اور اخبار اُردو میں جاری ہیں۔ ان میں نہ کوئی صرف لڑکیوں کے لیے ہے، نہ کوئی صرف عورتوں کے لیے، نہ کوئی صرف ماو?ں کے لیے۔ اس طرح نہ کوئی ایسا رسالہ ہے جس نے عورتوں کی دینی تعلیم کا کام اپنے ذمے لے رکھا ہو۔ نہ کوئی ایسا اخبار ہے جو دستکاری وغیرہ کے متعلق ہو یا عورتوں کو اور مفید ہنر سکھا سکے۔ اس طرح کی بیسیوں ضرورتیں ہیں، جن پر علیحدہ علیحدہ رسالے نکالنے کی ضرورت ہے۔'' (77)

اس ضرورت کو شاہ محمد عمیر نے محسوس کیا اور مولوی صاحب کے خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ اس پر رسالہ ''اُردو'' اورنگ آباد، دکن نے یہ تبصرہ شائع کیا:

''اس رسالے کا خاص مقصد بیواو?ں کی حمایت ہے۔ کسی خاص مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر رسالہ جاری کرنا ہمت اور تعریف کی بات ہے، اور ایسے رسالے، خواہ ان کی اشاعت محدود ہی کیوں نہ ہو، معمولی رسالوں کی نسبت زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔'' (78)

اس رسالے کے بارے میں اس کے علاوہ اور کہیں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

''زیور'' پٹنہ، 1967ء

ماہ نامہ ''زیور'' دسمبر 1967ء میں پٹنے سے جاری ہوا۔ اس کے چیف ایڈیٹر رضوان احمد بارہ بنکوی تھے۔ ادارت میں سلمٰی جاوید اور مہر یعقوب کے نام شامل تھے۔ زرِ سالانہ سات روپے

پچاس پیسے تھا۔ آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ نمبر 6 میں طبع ہو کر دفتر ماہ نامہ ''زیور'' پٹنہ 4 سے شائع ہوتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہندوستان کی بیگم کا پیغام درج ہے:

یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ آپ کی کوششوں سے خواتین کے لیے ایک اُردو ماہ نامہ ''زیور'' جلدی منظر عام پر آنے والا ہے۔ نام تو آپ نے بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔ خدا کرے، یہ نام ''زیور'' اسم بامسمّیٰ ثابت ہو۔ (8)

اس کی ایڈیٹر سلمٰی جاوید صاحبہ 'آرسی' کے عنوان سے اداریے میں لکھتی ہیں:

''زیور'' ایک ایسا پودا ہے جو پتھریلی زمین توڑ کر نکلا ہے۔ کوئی بھی پودا لگاتے ہوئے انسان کو اس کا کوئی خطرہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی اسے توڑ نہ دے، مگر مجھے اس کا کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ میرے ساتھ ہزاروں بہنوں کا تعاون ہے جو اس کی آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنانے میں مدد دیں گی۔۔۔۔''زیور'' میں ہم صرف اُردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے بہترین ادب کو پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (9)

اس رسالے میں مضامین، افسانے اُردو شعر و شاعری کے علاوہ دسترخوان، خواب اور اس کی تعبیر، کڑھائی بنائی، طب و صحت، مشورے مستقل عنوانات تھے۔ لکھنے والوں میں مرد اور خواتین دونوں اہلِ قلم کی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں:

''بیگم محمد علی'' (مناظر عاشق ہرگانوی)، ''نشاط النساء بیگم'' (مناظر عاشو ہرگانوی)، ''دادی اماں'' (سعیدہ وارثی)، ''یہ شوہر'' (محمود سعید)، ''کالی لڑکی'' (شعور فاطمہ) وغیرہ کے علاوہ حمیدہ سلطان، شکیلہ بھوپالی، رفیعہ شبنم، ثریا نذیر، نصیرہ بانو ا?فریں، رخسانہ اعجاز کے مضامین اور افسانے اس رسالے کی زینت بنتے رہے۔

غرض اس رسالے نے اپنے شائع ہونے والے مواد کے ذریعے خواتین میں یہ احساس بیدار کیا کہ وہ معاشرے کا ایک اہم رکن ہیں۔ زندگی کے ہر طبقے میں چاہے وہ مذہب ہو یا سیاست، سائنس ہو یا فلسفہ، اپنی کارگردی دکھا سکتی ہیں۔ ان میں زبان و ادب سے محبت اور گہری وابستگی بھی

پیدا کی اور ان کو یہ احساس دلایا کہ جس طرح ان پر دوسری معاشرتی ذمے داریاں ہیں اسی طرح زبان وادب کی حفاظت اور اُردو کی ترویج اور بقاء کی ذمے داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔ یہ احساس نسوانی صحافت میں ''زیور'' کے علاوہ کوئی دوسرا رسالہ پیدا نہ کرسکا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ آج بہار سے خواتین کے لیے کوئی بھی رسالہ نہیں نکل رہا ہے۔اس کا براہ راست اثر ہماری خواتین پر پڑ رہا ہے۔اکیسویں صدی جو کہ سائینس وٹیکنالوجی کے انقلاب کی صدی ہے اس دور میں بھی اس صوبے کی خواتین تعلیمی بیداری کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، معاشی، علمی وادبی بیداری میں ترقی کے تمام تر دعوں کے باوجود بے حد پسماندہ ہے۔اگر اس صوبے میں مسلم خواتین کو ''جدید عورت'' بنانا ہے تو نسوانی رسالے کو شروع کرنا ہوگا۔اس صوبے کی خواتین کو جدید عہد کے تقاضوں سے ان رسائل کے ذریعے ا؟ گاہی بخشنی ہوگی۔تب ہمارے بزرگوں کا وہ مشن یعنی تحریک تعلیم نسواں اور بے داری نسواں کے مقصد کے حصول کی راہ شاید ممکن ہوسکے۔لیکن اس میں پہل کرے گا کون یہ دیکھنے کی بات ہوگی۔

☆☆☆

عبدالمتین قاسمی

بہار کی موجودہ اردو صحافت

(زبان اور معیار کے حوالے سے)

ہندستان میں اردو صحافت کی داغ بیل پر آشوب دور میں پڑی تھی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں انگریزی سامراج کا تسلط قائم تھا اور عوام کی بنیادی آزادی سلب کرلی گئی تھی ۔ان مشکل اور پریشان کن حالات میں بھی کلمہ حق ادا کرنے کی جرأت اردو صحافت نے دکھائی تھی ۔کیونکہ اردو صحافت ایک بڑے مشن اور مقصد کے تحت وجود میں آئی تھی ۔اس لئے اپنی ابتدا کے دوسو سال بعد آج بھی اس میں مقصدیت اور جرأت اظہار کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے ۔ دوسری زبانوں کے اخبارات کے مقابلے میں اردو اخبارات ملک ،قوم اور سماج کے تئیں زیادہ ذمہ داری کا جذبہ رکھتے ہیں اور انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مادی نقصانات کی قیمت پر بھی وہ اپنے مشن سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں ۔آج بھی اردو کے متعدد ایسے اخبارات شائع ہورہے ہیں جو خسارے کی مار جھیل رہے ہیں لیکن حالات کے آگے سپر نہیں ڈالی ہے ۔اردو کے اخبارات اپنی ابتدا سے ہی نا مساعد حالات کا مقابلہ کرتے رہے ہیں ۔خبروں کی حصولیابی سے لے کر طباعت کے پیچیدہ مسائل تک اردو اخبارات نے ایسا کٹھن دور دیکھا ہے جو حوصلہ شکنی کے لئے کافی تھا۔لیکن اردو صحافی ان نا مساعد حالات اور تکنیکی دشواریوں کے باوجود بھی اخبارات کو اپنے خون دل سے سینچتے رہے ہیں ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو صحافت مشکل ترین دور سے گزر کر آج ملٹی کلر طباعت ،کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ایڈیشن کے دور میں داخل ہوچکی ہے ۔اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے تمام ذرائع کو پورے اعتماد کے ساتھ برت رہی ہے اور گلوبلائزیشن کے اس دور میں اردو اخبارات دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے اخبارات کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کررہی ہے ۔ان کی تعداد کے علاوہ سرکولیشن میں بھی بتدریج اضافہ ہورہا ہے اور اردو کے تئیں سرکاری اور عوامی ہر دو سطح پر تعصب اور بے توجہی کے باوجود آج بھی اردو اخبارات ورسائل اشاعت کے اعتبار سے ہندی اور انگریزی کے بعد ملک میں تیسرے نمبر پر ہیں ۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا تجزیہ ہے کہ:

''اردو کے خلاف تعصب، سازش اور عدم توجہی کے باوجود اکیسویں صدی میں اٹھارہ ریاستوں سے اردو اخبار و رسائل اچھی خاصی تعداد میں نکل رہے ہیں۔ اشاعت کے اعتبار سے سرکاری سروے رپورٹ کے مطابق آندھرا پردیش سے شائع ہونے والے اخبار و رسائل کی مجموعی تعداد چار سو پانچ (۴۰۵) اور مجموعی اشاعت چار لاکھ ستر ہزار ہے۔ بہار کے اخبار و رسائل کی مجموعی تعداد ایک سو چھپن ہے مگر مجموعی اشاعت پانچ لاکھ بائیس ہزار ہے۔ جموں و کشمیر سے ایک سو چوراسی اخبار اور رسائل نکلتے ہے لیکن مجموعی اشاعت دو لاکھ انیس ہزار ہے۔ مغربی بنگال کے اخبار و رسائل کی تعداد صرف تریسٹھ ہے اور مجموعی اشاعت نوے ہزار ہے۔ اور مہاراشٹر سے ایک سو اڑسٹھ اخبار و رسائل نکلتے ہیں اور مجموعی اشاعت ایک لاکھ پانچ ہزار ہے۔ جبکہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد ملک میں پانچ کڑور سے زیادہ ہے۔''

(گفتنی: ہم عصر اردو رسائل: جائزہ۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ص ۱۱)

یہ اعداد و شمار کس حد تک درست ہیں اور انہیں کہاں سے حاصل کیا گیا ہے مجھے معلوم نہیں، پھر بھی اگر انہیں صحیح تسلیم کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ موجودہ صورت حال کو اگر اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا تو بہت زیادہ مایوسی کی بھی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی ہے۔ البتہ اس سے موجودہ اردو صحافت کی پیش رفت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو اخبارات و رسائل اپنے عہد کے نہ صرف تخلیقی شعور و سمت کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ سماج، ثقافت اور دیگر عوامل کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ اپنے دامن میں زبان و ادب، ادیب، شاعر، صحافی اور فنکار کے علاوہ معاشرہ سے متعلق قیمتی ذخائر رکھتے ہیں۔ یہ تہذیبی روایتوں کی پاسداری کا بھی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اخبارات و رسائل کی اہمیت و افادیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ اگر ان اخبارات و رسائل کے اداریوں، ادارتی اعلانات اور ان میں شامل تخلیقی مواد اور قارئین کے مکتوبات کو دیکھا جائے تو اس سے اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف تحریکات و نظریات نیز موضوعات و مسائل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ

چیزیں اپنے آپ میں اردو کی ادبی تاریخ کے مختلف گوشوں کو روشن کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ذمہ دارانہ امر ہے اور اسے انجام دینے کیلئے متعلقہ افراد میں ذمہ دار صحافی کی خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔ بہت سے مدیروں نے ان خصوصیات کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنے اخبارات و رسائل کے ذریعہ اردو زبان و ادب پر گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ نیز زبان و ادب کی آبیاری کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی کا قول ہے کہ:

''اردو شعر و ادب پر رسائل و جرائد نے ہمیشہ اثرات مرتب کئے ہیں اور ہر دور میں چند ایماندار اور مخلص مدیران کے رسائل و جرائد نے اردو شعر و ادب کے فروغ اور ترویج میں حصہ لیا ہے۔''

(مجلّہ ''دستاویز''، دوحہ قطر، ۱۲-۲۰۱۱)

لہٰذا زبان و ادب کی ترویج کیلئے اخبارات و رسائل کس قدر ضروری ہیں اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یقیناً زبان و ادب کے ارتقا میں اخبارات و رسائل کا کردار دیگر ذرائع سے زیادہ قابل قدر رہا ہے۔ بہار کے اخبارات و رسائل نے بھی زبان و ادب کے ارتقا میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سید احمد قادری نے بہار میں اردو صحافت کے حوالے سے اپنی تحقیق میں اس امر کی نشاندہی کی ہے۔ وہ بہار کی اردو صحافت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''کسی بھی قوم و ملک کی ترقی و خوشحالی کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس ملک کا ادب زندہ اور متحرک ہو اور اس فرض کی ادائیگی میں بہار کی ادبی صحافت ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتی ہے۔''

(اردو صحافت بہار میں، ڈاکٹر سید احمد قادری، ص ۱۴۹)

بلاشبہ ماضی میں اردو اخبارات نے اردو زبان کی ترقی اور ترویج میں بے حد اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو اخبارات نے بڑے پیمانے پر اردو کے شعرا اور ادیبوں کو عوام الناس میں متعارف کرایا۔ زبان کو فروغ دینے، عصری تقاضوں کو پورا کرنے اور جدید ترین علوم و تحقیقات سے اردو کو ہم آہنگ کرنے کے لیے ان اخبارات نے نئی اصطلاحات وضع کیں اور اسے عوام و خواص میں

متعارف کرایا۔اس کے دور رس اثرات زبان وادب پر مرتب بھی ہوئے ، اردو آبادی کی بھر پور ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی ، سیاسی اور ملی ہر سطح پر رہنمائی بھی ہوتی رہی ہے ۔ یہ وہ دور تھا جب اردو کے اخبارات کی ادارت ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں تھی اور قومی سطح پر مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، چراغ حسنی مسرت، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی ، حیات اللہ انصاری ، مولانا عبد الماجد دریابادی ، مولانا عثمان فارقلیط اور سالار اردو غلام سرور اور ریاستی سطح پر سہیل عظیم آبادی، کلام حیدری، شین مظفر پوری، محمود ایوبی، شاہد رام نگری، قیوم خضر، عبدالرافع محمد مرغوب اور رضوان احمد جیسے صحافی سرگرم عمل تھے۔

بیسویں صدی (۲۰۰۰ء) تک بہار کی اردو صحافت میں مذکورہ تمام خصوصیات کہیں پوری شدت کے ساتھ، تو کہیں مدھم طور پر جلوہ گر دکھائی دیتی ہیں۔لیکن اکیسویں صدی (2001ء) شروع ہوتے ہی اس میں کمی درآنے لگی اور رفتہ رفتہ بہار کی اردو صحافت زبان و معیار کے حوالے سے انحطاط کا شکار ہونے لگی۔ بعد کے صحافی اردو صحافت کے اس اہم پہلو کی طرف سے لاپرواہ نظر آتے ہیں، اس بے اعتنائی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت میں زبان کی صحت، قواعد کا پاس ولحاظ، جدید اصلاحات کی کھوج، سرکاری دفاتر اور پرائیوٹ اداروں میں دفتری زبان کے طور پر مستعمل ہندی اور انگریزی کے اصلاحات کی مناسب ترجمانی کے اوصاف رخصت ہونے لگتے ہیں۔آج کل اردو اخبارات ورسائل میں اردو زبان کی جو درگت بن رہی ہے وہ بڑی حد تک سوہان روح ہے ۔اردو اخبارات، اردو زبان کو بیدردی سے مسخ کرنے اور اس پر انگریزی اور ہندی کے الفاظ کو زبردستی تھوپنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں ۔ بلاشبہ زندہ زبانیں دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اندر جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں اور اردو کا فروغ اس کی اسی وسعت قلبی کا مظہر ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ الفاظ کے اخذ وقبول کے وقت زبان کے مزاج کا خیال نہ رکھا جائے اور اس کی روح کو ہی مسخ کردیا جائے ۔ اردو اخبارات ماضی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے متوازن طریقہ سے حالات حاضرہ اور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کیلئے نئی اصطلاحات وضع کرنے کے بجائے اردو کو انگریزی کے تختہ دار پر چڑھا رہے ہیں ۔ اردو کی خوبصورت اصطلاحات اور الفاظ ترک

کر رہے ہیں۔گذشتہ تین دہائیوں میں اردو کی صحافتی زبان پر انگریزی اور ہندی کا غلبہ روز بڑھا ہے۔ اردو صحافت کی زبان میں آئی گراوٹ سے خاصے متفکر رئیس الدین فریدی اردو اکادمی دہلی کی جانب سے ۱۹۸۷ء میں منعقد سمینار میں پیش کردہ اپنے مقالے ''اردو صحافت عہد بعہد'' میں رقمطراز ہیں:

> ''اردو کے اخباروں نے زبان کی لطافت کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔صاف، سلیس، صحیح اور شستہ زبان ہمیشہ ان کی سرخیوں، خبروں اور مضامین کی جان رہی ہے۔مگر بدقسمتی سے آج کل اخبار والے زبان اور دل کش زبان لکھنے کی خصوصیت سے عاری ہوتے چلے جارہے ہے۔اخباروں میں جملوں کی ترتیب، مذکر مؤنث اور واحد جمع کی غلطیاں عام ہوگی ہیں حالاں کہ جو زبان اپنے قواعد وضوابط سے عاری ہوا سے زبان کہنا ہی مشکل ہے اور وہ روبہ زوال ہی ہوسکتی ہے ۔ یہ خرابی زیادہ تر اس وجہ سے ترقی پذیر ہے کہ اردو کی تعلیم کا معیار بہت کمزور ہوتا چلا جارہا ہے۔ انگریزی سے بھی لوگ بے بہرہ ہوتے چلے جارہے ہیں۔اس لئے صحیح ترجمہ ہوتو کیسے اور رواں دواں زبان میں مضامین لکھے جائیں تو کس طرح۔اب نئی مصیبت یہ ہے کہ ہندی کی اندھی تقلید شروع ہوگئی ہے۔''فلاں مجلس میں اس سوال کو لے کے بڑی بحث چلی''۔''وزیراعظم کی طرف سے مخالف پارٹیوں کے الزام کی تردید ''جیسے فقرے عام طور پر لکھے جارہے ہیں۔ایک سرکاری خبر نامے میں غدر پارٹی کو بار بار غدار پارٹی لکھا دیکھ سر پیٹنے کو دل چاہا مگر اس قسم کی غلطیوں پر کوئی کب تک سر پیٹے اور کتنا پیٹے۔اردو کو بچانا ہے تو اس طرف بھی توجہ کرنی پڑے گی۔''

(اردو صحافت: انور علی دہلی ص ۵۹)

ظاہر ہے رئیس الدین فریدی نے یہ باتیں ملکی تناظر میں کہی ہیں اور صوبہ بہار اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔مقالہ نگار نے جن نقائص کی طرف توجہ دلائی ہے وہ تمام خامیاں یہاں کے اخبارات میں بھی پائے جاتے ہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ بہار سے نکلنے والے بیشتر اردو اخبارات میں خبروں کی زبان معیاری صحافت کے تقاضے کو پورا نہیں کرتی ہے۔حالانکہ اس کے بنیادی اسباب

بھی ہیں جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم ان اسباب پر غور کریں تو سب سے پہلے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے ان دنوں خبروں کی حصولیابی کے جو ذرائع ہیں وہ ہندی یا انگریزی میں ہیں۔ خواہ وہ واقعات اور تقریبات کی سطح پر ہو یا دفتر کو موصول ہونے والی پریس ریلیز۔ چونکہ ہر جگہ خبروں کے حصول میں ہندی الفاظ سے واسطہ پڑتا ہے اور جو لوگ خبروں کی تشکیل کا کام کرتے ہیں وہ عام طور پر زبان کے طالب علم نہیں ہوتے ہیں، خود ان کی تعلیم ہندی یا انگریزی میڈیم میں ہوئی ہوتی ہے۔ کچھ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں صرف خواندہ کے زمرے رکھا جا سکتا ہے، ان کی اردو زبان سے واقفیت واجبی سی بھی نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہندی/انگریزی الفاظ و تراکیب کو اردو زبان کے مزاج کے مطابق ڈھالنا تو دور مافی الضمیر کی بھرپور ادائیگی بھی نہیں کر پاتے ہیں۔ دھیرے دھیرے ایسے الفاظ اس کی خراد پر چڑھ جاتے ہیں اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ وہ جس زبان میں صحافت کر رہا ہے یہ اس زبان کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ اس پر المیہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو خود بھی یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں اور تلاش و دریافت کے راستے صحت زبان و بیان کی طرف بڑھتے رہیں۔ جبکہ اصلاح کے لیے میڈیا میں فیڈ بیک کا موثر طریقہ رائج ہے، لیکن اردو صحافت اس فیڈ بیک کا اس پیمانہ پر استعمال نہیں کر پاتی ہے جو اس کا ترجیحی مقصد ہے اور جیسے ہندی اور انگریزی اخبارات کے لوگ اپنی اصلاح کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن تھا کہ زبان پر دسترس رکھنے والے افراد، اس کی جانب تھوڑی سی توجہ دیتے اور معیار کی بقا کیلئے ادارتی عملے کی توجہ اس جانب مبذول کراتے، اسے بھی ''واہ واہ، سبحان اللہ اور ماشاء اللہ'' کی نذر کر دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

زبان میں گراوٹ کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ عام طور پر میڈیا میں (جس سے اردو میڈیا بھی الگ نہیں ہے) ایسے لوگ جگہ بنا رہے ہیں جو اپنے کیریئر سازی کے مرحلہ میں مطلوبہ مقام کی حصولیابی میں ناکام ہو گئے ہیں اور کہیں روزگار کا ذریعہ میسر نہیں ہوا تو اب صحافت کو اپنا لیا ہے۔ ایسے حالات میں ان سے اصولی کام اور بہتر کارکردگی کی توقع کرنا بھی فضول ہے۔ البتہ اس کی تلافی

اس طور پر ممکن تھی کہ ان کو بہتر اعزازیہ دیا جاتا، انہیں پیشہ وارانہ تربیت دی جاتی اور مطلوبہ ذمہ داری کے اہل بنایا جاتا، تب ان سے اچھے کام کی توقع کی جاتی، لیکن اس سطح پر بھی بے حسی دکھائی دیتی ہے اور ایسے لوگوں کو یہاں بھی استحصال کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اخبارات انہیں مناسب محنتانہ سے محروم رکھتے ہیں نتیجتاً اخباری نمائندے صحافتی اقدار کی پامالی کا راستہ اختیار کر بیٹھتے ہیں اور پھر یہاں سے معیار اور وقار کے ساتھ مصالحت کی راہ کھل جاتی ہے۔ سچی اور پروقار صحافت مجروح ہونے لگتی ہے، زبان کا بھی سخت نقصان ہوتا ہے اس کے سبب بسا اوقات دوسرے ایماندار اور ہنرمند صحافی بونے ثابت ہونے لگتے ہیں۔ مالکان اخبار بھی ایسے جینوین اور ہنرمند صحافیوں کو نظرانداز کرنے لگتے ہیں۔

زبان کی سطح پر تنزلی کی ایک بنیادی وجہ اردو اخبارات میں اخباری عملہ کے بیچ حفظ مراتب کا خیال نہ رکھنا بھی ہے۔ عام طور پر معیاری اخبارات میں الگ الگ کاموں کیلئے اس کی مناسبت سے لیاقت رکھنے والے افراد لگائے جاتے ہیں اور ان کے بیچ مراتب و مراعات کا فرق رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اردو اخبارات (بطور خاص ریجنل اخبارات) میں اس کلیہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر معمولی خبر نویس بھی خود کو تجربہ کار صحافی کے ہم پلہ شمار کرتا ہے۔ اس کی نظیر آئے دن اردو اخبارات میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ نچلی سطح کا نمائندہ خبر لکھ کر، بے تکی سرخی جڑ کر، کمپوز شدہ خبر براہ راست ڈسک پر بھیج دیتا ہے اور ادارتی عملہ آنکھ موند کر بغیر کسی تصحیح و ترمیم کے اسے من و عن شائع کر دیتا ہے۔ ایسی خبروں میں نہ تو جملے درست ہوتے ہیں، نہ املا کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سرخی اور ذیلی سرخی بھی کم تر درجے کی ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات فاش غلطیاں پوری خبر کو مسخ کر دیتی ہیں۔

زبان کے تعلق سے یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ ان دنوں جو نئی نسل اردو صحافت میں آرہی ہے اس میں سے کچھ لوگ تو ادب کی معلومات رکھتے ہیں لیکن بہرحال اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ زبان کے مزاج اور صرف و نحو سے بڑی حد تک ناواقف ہوتے ہیں۔ جبکہ کسی بھی صحافی کیلئے زبان کی صحت بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں ان کو مبتدا، خبر، موصوف صفت، عدد معدود، ممیز تمیز، مضاف مضاف الیہ، موصول صلہ، الفاظ و تراکیب کی بندش وغیرہ کی شد بد نہیں

ہوتی ہے۔اس طرح کی معلومات نہیں ہونے کی وجہ سے بھی کئی طرح کی خامیاں راہ پا جاتی ہیں، خبر کی حیثیت مجہول ہو جاتی ہے، عبارت میں سلاست، روانی اور عام فہم ہونے کے بجائے اس میں پیچیدگی، الجھاؤ اور عامیانہ پن دیکھنے کو ملتی ہے۔

ذیل میں چند ایسی ہی قواعد کی خلاف ورزی کی طرف نشان دہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جن کے تئیں غلط ہونے کا احساس بھی اب رخصت ہونے لگا ہے:

☆ مثال کے طور پر دو ہندی الفاظ یا ایک ہندی اور ایک عربی/فارسی لفظ کے درمیان عطف کے طور 'و' کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ جیسے 'سوچ و فکر' بلکہ یہاں لازما 'اور' استعمال کریں گے۔ 'واو عطف' ہمیشہ عربی یا فارسی الفاظ کے درمیان ہی آتا ہے۔ اردو اخبارات میں یہ غلطیاں بالکل عام ہو گئی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادارتی عملہ اس بداحتیاطی سے لاپرواہ ہے۔

☆ اردو خبروں میں (فلاں معاملے) ''کو لے کر'' بہت استعمال ہوتا ہے۔ یہ 'کو لے کر' اردو مزاج کے مطابق فقرہ نہیں ہے۔ ہندی زبان میں یہ استعمال ہوتا ہے۔ اردو اخبارات کے لوگ اسے ہندی کی طرز پر عموماً استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لئے بہتر فقرہ 'مدنظر'، کی بابت، کے سلسلہ میں، کی وجہ سے، ہیں۔ان کا استعمال موقع کی مناسبت سے کیا جا سکتا ہے۔

☆ ایک لفظ 'مدعا' ہے جس کو اردو میڈیا 'مدا' لکھنے لگا ہے۔ حالانکہ وہاں اردو زبان کے مزاج کے مطابق نہ 'مدعا' مناسب ہے اور نہ 'مدا' موزوں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہندی کے لوگ 'مخالفت' کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے لفظ 'خلافت' لکھتے اور بولتے ہیں۔ یہاں 'مسئلۂ'، 'امر' وغیرہ لکھنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی اور یہ اردو زبان کے عین مزاج کے مطابق ہوگا۔

☆ 'اہل صبح' یہ ترکیب ہندی میں 'علی الصباح' کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اردو کے اخباری نمائندے بھی 'اہل صبح' لکھنے لگے ہیں۔ جو اخبارات میں شائع بھی ہو جاتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ادارتی عملہ بھی اس معاملے میں بے حسی کا شکار ہے۔

☆ اضافت کے استعمال میں بھی بے ضابطگی برتی جا رہی ہے۔ مثال کے طور

پر 'لبِ سڑک' کو لیجئے اس کا استعمال اردو والے بھی کثرت سے کرنے لگے ہیں۔ جبکہ 'لب' فارسی اور 'سڑک' ہندی کا لفظ ہے اور ان کے بیچ (زیر) کی اضافت مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ اضافت ہمیشہ عربی یا فارسی الفاظ کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا حسب ضابطہ 'لب راہ'، 'لب شاہراہ' لکھا جانا چاہئے۔

☆ اسی طرح واحد، جمع کے استعمال میں بھی بے راہ روی کا دور دورہ ہے، اردو کے لوگ بھی ہندی کی طرح جذباتوں، احکاماتوں اور خیالاتوں جیسی جمع لکھنے لگے ہیں، جبکہ اردو میں جذبہ کی جمع جذبات، حکم کی جمع احکام اور خیال کی جمع خیالات مستعمل ہیں، لیکن ہندی والے درج بالا الفاظ کے اخیر میں 'وں' کا اضافہ کر کے جمع کے طور پر ان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ عربی/فارسی کی طرح اردو میں بھی واحد، جمع اور جمع الجمع کے لئے الگ الگ صیغہ موجود ہے۔

☆ اردو اخبارات میں مذکر و مؤنث میں بڑی بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ مثلاً لفظ 'عوام' کو ہی لیا جائے۔ یہ مذکر ہے، لیکن چونکہ ہندی میں لفظ 'جنتا' مؤنث ہے اس لیے اردو والے بھی ہندی کی طرز پر 'عوام' کو مؤنث لکھ ڈالتے ہیں۔ ایک اور لفظ 'چرچا' ہے یہ ہندی میں مؤنث ہے لیکن اردو میں مذکر ہے، اس لفظ کو بھی اردو والے مؤنث گردان لیتے ہیں۔اس کے علاوہ مبتدا خبر میں تذکیر و تانیث کی مطابقت میں بے توجہی پائی جاتی ہے۔

☆ اخبارات کے زبان و بیان کے لحاظ سے اصطلاح سازی پر بھی غور و فکر اور کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ دور حاضر میں ٹیکنالوجی کی ترقی نے تمام شعبۂ حیات پر اثر ڈالا ہے، جدید ایجادات سامنے آئیں ہیں۔ نئے مسائل ابھرے ہیں۔ نت نئے افکار سے ہمارا سامنا ہے۔اس کے سبب نئی اصطلاحیں وضع ہوئی ہیں۔ جب ایسی اصطلاحات اردو اخبارات میں خبر کا حصہ بنتی ہیں تو اخباری نمائندوں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش آتا ہے کہ وہ ان ہندی/انگریزی اصطلاحوں بعینہ اردو کے قالب میں اتار دیں یا خود ساختہ ترجمہ کریں۔ اکثر انہیں ہو بہو استعمال کر لیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ کوئی ممنوع بات نہیں ہے لیکن اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو ہماری زبان کہاں

رہے گی، اس پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر یہ کہ ہر زبان ایسے الفاظ کو اپنے مزاج کے مطابق ہی ڈھال کر استعمال کرتی ہے۔ جہاں تک زندہ زبانوں کے ذریعہ الفاظ کے اخذ وقبول کا مسئلہ ہے تو ہم یہاں ہندی زبان کو ملحوظ نظر رکھیں۔ بلا شبہ ملک میں ہندی زبان کی حیثیت مستحکم ہے۔ ہندی والے ثقیل الفاظ کو من وعن بھی استعمال کرتے ہیں اور جہاں اردو کے الفاظ اخذ کرتے ہیں وہاں اسے اپنے مزاج کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں صحافی احتشام الحق نے سہ ماہی 'اسالیب' سرگودھا پاکستان کے جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ کے شمارے میں بڑی معقول بات لکھی ہے:

> ''یہ صحیح ہے کہ زندہ زبان نئی ایجادوں کو قبول کرنے سے بھاگتی نہیں ہے لیکن ایک زندہ زبان نئی چیزوں کو اپنے رنگ میں ڈھال کر ہی اسے استعمال میں لاتی ہے۔ اس کے لیے اصطلاح سازی کی ضرورت ہے۔ ایک علمی زبان کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اصطلاح سازی کا کام ہمیشہ جاری رہے۔ تب ہی ایک زندہ زبان کی اپنی خصوصیتیں باقی رہ سکتی ہیں۔ ہمارے لیے ہندی زبان اس کا نمونہ ہے۔ وہ نئے الفاظ کو اپنی اصطلاح دے کر ہی استعمال کرتی ہے۔ خواہ وہ لفظ سنسکرت سے ماخوذ ہونے کی وجہ سے کتنا ہی ثقیل کیوں نہ ہو۔ ان دنوں دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ علمی موضوعات تو درکنار ادبی زبان میں بھی انگریزی الفاظ ہو بہو استعمال کئے جانے لگے ہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اردو میں انجذابی صلاحیت ہے ۔ اگر یوں ہی نئے الفاظ اپنی تمام تر خصوصیتوں کے ساتھ لیے جانے لگیں تو بہت جلد یہ زبان دوسری زبان میں ضم ہو کر رہ جائے گی۔''

جدید ترین علمی تحقیقات کی اشاعت اور نئے مسائل وموضوعات کے سامنے آنے کے بعد اس ضرورت کا احساس شدید ہو جاتا ہے کہ اردو اخبارات کیلئے وقفے وقفے سے ایسے الفاظ کی فہرست جاری کی جائے جو نئے اصطلاحات کی ترجمانی کرتے ہوں۔ یہ کام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ذریعہ شائع ''فرہنگ اصطلاحات- ماس کمیونی کیشن'' میں ضرور کیا گیا ہے

،لیکن اب بات آگے نکل چکی ہے اور اس کے بعد بھی بہت سی نئی اصطلاحیں سامنے آئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نوع کی فرہنگ تک اخباری نمائندے تو کجا، ڈیسک کی سطح پر کام کرنے والے لوگوں کی بھی رسائی نہیں ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ وقتاً فوقتاً اخبارات اپنے نمائندوں کی تربیت کیلئے ورکشاپ کا اہتمام کرے، ورک شاپ کے ذریعہ ماہرین نئی اصطلاحات، تکنیک اور جدید پیش رفت سے باخبر کرائیں اور انہیں صحافتی اقدار کی طرف متوجہ کرائیں۔ ہندی/انگریزی اخبارات میں خبروں کو موثر بنانے اور زبان وبیان کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے ڈیسک پر کام کرنے والوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔ ششماہی یا سالانہ اس امتحان میں حالات حاضرہ، سیاسی، انتظامی اور عدالتی نظام سے جڑی اصطلاحوں سے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اردو اخبارات میں بھی اس نہج پر پہل کرنے ضرورت ہے کیونکہ اس قدم سے اردو اخبارات کے ادارتی عملہ اور وابستگان میں نئی روح پھونکی جاسکتی ہے اور تبھی اردو صحافت موضوع، مواد اور تکنیک کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کے معیار کی سطح پر آگے بڑھنے کا دعوی کرسکتی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس تجزیہ کے دوران بہت سی ناگوار باتیں ضبط تحریر میں آگئی ہیں، لیکن اسے نیک نیتی پر محمول کرنا چاہئے کیونکہ... **خوگر ہم سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے... ہمیشہ** سنجیدہ زبان وادب اور صحافت کی اساس رہی ہے۔

☆☆☆

حوالے:

۱۔ رہبر اخبار نویسی، سید اقبال قادری
۲۔ من شاہ جہانم، مفتی اعجاز ارشد قاسمی
۳۔ بہار میں اردو صحافت، سید احمد قادری
۴۔ ہم عصر اردو رسائل: جائزہ، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
۵۔ اردو صحافت، انور علی دہلوی
۶۔ ماہنامہ 'آجکل' دہلی (متعدد شمارے)
۷۔ ماہنامہ اردو دنیا دہلی (متعدد شمارے)
۸۔ زبان وادب پٹنہ (متعدد شمارے)

ڈاکٹر احسان عالم
الحرا پبلک اسکول، رحم خاں، دربھنگہ

بہار میں اردو صحافت ۔آغاز وارتقا

آج کے تیز رفتار زندگی میں ذرائع ابلاغ انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام تر حصے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ کی ہی خوبی اور کرشمہ سازی ہے کہ سکنڈوں میں دنیا بھر کی خبریں دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں دستیاب ہو جاتی ہیں۔آج اکیسویں صدی میں صحافت کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ایک پرنٹ میڈیا اور دوسرا الیکٹرانک میڈیا۔الیکٹرانک میڈیا میں کشش زیادہ ہے لیکن پرنٹ میڈیا کی اپنی خصوصیات برقرار ہے۔ پرنٹ میڈیا آج بھی اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔

واقعات یا حقائق جاننے کا نام صحافت ہے۔سچائی اور انکشافات کا پتہ لگانا ہی صحافت ہے۔عوام کو سچائی اور تمام تر واقعات سے باخبر کرنا ہی صحافت ہے۔صحافت کی تعریف مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں دی ہے، لیکن سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔

☆ سید صفی مرتضیٰ اپنے کتاب ''اصناف ادب'' میں لکھتے ہیں:

''اس کے معنی کتاب یا نامہ کے ہیں اور اس کا کام ترسیل وابلاغ، افکار و نظریات اور خیالات ہے۔''

☆ عبدالسلام خورشید اپنی کتاب ''فن صحافت'' میں لکھتے ہیں:

''صحافت کا لفظ صحیفے سے نکلا ہے۔صحیفہ کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ بہر حال عملاً ایک عرصے دراز سے صحیفہ سے مراد ایک ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقتوں پر شائع ہوتا ہے چنانچہ تمام اخبارات و رسائل صحیفہ ہیں۔''

☆ ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے صحافت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی کتاب ''ابلاغیات'' میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''صحافت خبر ہے، اطلاع ہے، جانکاری ہے۔صحافت عوام کے لئے عوام کے بارے میں تخلیق کیا گیا مواد ہے۔ یہ دن بھر کے واقعات کو تحریر میں نکھار کر آواز میں سجا کر تصویروں میں سمو کر انسان کی اس خواہش کی تکمیل کرتی ہے۔جس کے تحت وہ ہر نئی بات جاننے کے لئے بے چین رہتا ہے۔''

☆ ڈاکٹر جاوید حیات نے ''مبادیات صحافت'' میں اس طرح لکھا ہے:

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر صحافت کسے کہتے ہیں؟ اس سلسلے میں جب ہماری نگاہیں اس کے لغوی معنی ومفہوم کی طرف جاتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ عربی النسل ہے اور اس کا ماخذ صحیفہ ہے۔جس کے معنی کتب و رسائل کے ہیں۔''

ان سبھی لغوی معنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحافت، صحیفہ نگاری ہے اور Journalism یا صحافت کی تعریف بھی صحیفے یا Journal سے ملتی جلتی ہے۔ صحیفے کے معنی ومفہوم سے صحافت کی تعریف میں مدد ملتی ہے۔

☆ انسائیکلو پیڈیا آف امریکانہ کے مطابق:

"Jounalism is the collection and periodical dissemination of current news and events or more strictly the business of managing, editing or writing for journals & newspapers."

صحافت میں حقیقت اور سچائی سب سے اہم چیزیں ہیں اور انہیں بہتر الفاظ میں ادا کرنا

ایک فن ہے۔ کسی بھی خبر کو ایک خاص انداز میں ڈھال کر اس طرح پیش کرنا جو لوگوں کے سمجھ میں آسانی سے آجائے اور اس میں دلچسپی بھی پیدا ہو جائے، صحافت ہے۔

☆ ڈیوڈ وین رائٹ نے اپنی کتاب ''جرنلزم میڈ سمپل'' میں لکھا ہے:

"What is journalism? Journalism is information. It is communication. It is the events of the day distilled into a few words, sounds or pictures. Journalism is basically news."

صحافت ایک ایسا فن ہے جس میں بہت کچھ کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو وسیع کرنا نہایت ضروری ہے۔ آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور میں اخبارات کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے۔ اخبارات وہ ذریعہ ہے جو عوام کی رائے کو عوام کے سامنے لانے کا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جہاں قلم کی جنگ لڑی جاتی ہے۔ اس لئے بڑی سے بڑی طاقتیں صحافت کی طاقت سے ڈرتی ہیں۔ کئی حکومتیں اس کی طاقت سے پلٹ گئیں۔ کئی نئی حکومتیں بنیں۔ کسی بھی ملک کی جنگ کا انحصار بھی اس ملک کی صحافت پر ہوتا ہے۔ نذرالحفیظ ندوی نے اپنی کتاب ''مغربی میڈیا اور اس کے اثرات'' میں لکھا ہے:

''میڈیا کے ماہرین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ حکومتوں کی خارجہ پالیسی کے اجزائے ترکیبی میں ذرائع ابلاغ کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس کے علاوہ جو عناصر خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتے ہیں ان میں تاریخی پس منظر، جغرافیائی محل وقوع، آبادی، اقتصادی اور قومی قوت کے ساتھ ساتھ نظریاتی عوامل و تحریکات شامل ہوتے ہیں۔''

ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز ۱۸۲۲ء میں ہوا۔ اسی سال پنڈت ہری دت اور لالہ

سدا سکھ نے مشترکہ طور پر کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار ''جام جہاں نما'' نکالا تھا۔ ہندوستان میں اردو صحافت کی ترویج و اشاعت میں دانشوروں، عالموں، اساتذہ اور سماجی کارکنوں کا اہم رول رہا ہے۔ مولوی سید ممتاز علی کے رسالے ''تہذیب نسواں'' نے خواتین کی بہترین ترجمانی کی ہے وہیں ممتاز علی کی زیر پرستی بچوں کے رسالہ ''پھول'' نے گلشن ادب میں غنچے کھلائے۔ تقسیم ہند نے اردو صحافت پر بہت ہی برا اثر ڈالا۔ اس پر بحران اور انتشار کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اردو زبان اور اس کی ترویج و اشاعت اس سے متاثر ہوئی۔ ایسے حالات میں اردو سماج نے بہت ہمت سے کام لیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عظیم رہنما، قائد، عالم، ادیب اور صحافی نے ایسے نازک موڑ پر علمی اور ادبی دنیا کو زندہ رکھنے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور انہیں پروان چڑھایا۔ اردو صحافت بھی بدلتے وقت کے ساتھ ملک کی ترقی میں دوسری زبانوں کا ساتھ دیتی رہی۔

اب عنوان کے مطابق بہار میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقا پر اپنا اظہار خیال پیش خدمت ہے:۔

صوبۂ بہار کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ یہ صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ بہت سے صوفی سنتوں کی سرزمین رہی ہے۔ دور جدید میں مغلوں کے زوال کے بعد صوبہ بہار، بنگال کے زیر نگیں ہوگیا۔ ۱۷۶۴ء میں بہار پر انگریز کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن ان لوگوں نے بہار کو بنگال سے الگ نہیں کیا۔ اس زمانے میں اڑیسہ بھی بہار میں شامل تھا۔ ۱۹۱۱ء میں صوبہ بہار کے لوگوں کی سخت جدوجہد اور مطالبہ کے بعد بہار، اڑیسہ کو بنگال سے الگ کرنے کا اعلان ہوا اور اعلان کے مطابق ایک اپریل ۱۹۱۲ء سے بہاڑ، اڑیسہ، بنگال سے الگ ہوگیا، لیکن یونیورسٹی اور کورٹ کا معاملہ بنگال کے ساتھ ہی جڑا رہا۔ بہار کے لوگوں کی لڑائیاں جاری رہی۔ نتیجتاً ۱۹۳۵ء میں بنگال کا ایک بار پھر بٹوارہ ہوا اور بہار، اڑیسہ کو دو ریاستوں کا درجہ دے دیا گیا۔

صوبۂ بہار میں صحافت کا آغاز اردو صحافت سے ہوتا ہے۔ صوبہ بہار کے شہر آرہ کو اس اعتبار سے تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ بہار کا پہلا اخبار ''نورالانوار'' اردو زبان میں یہیں سے شائع

ہوا۔ اس کے مدیر سید خورشید احمد تھے۔ ۱۸۵۳ء تک بہار میں سہسرام کے علاوہ کہیں اور پریس قائم نہیں تھا۔ اس لئے ایسا قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ اخبار سہسرام کے شاہ کبیرالدین احمد کے پریس میں شائع ہوتا رہا ہوگا۔ سید محمد اشرف نقوی کی تصنیف ''سوانح عمری اخبارات'' حصہ اول میں صفحہ ۲۷۵ پر اس اخبار کا ذکر ملتا ہے۔

Journalism in Bihar کے دیباچہ میں مسٹر این کمار لکھتے ہیں:۔

"Thus as a matter of historical procedence Urdu Press was established in Bihar prior to English and Hindi and the first news paper of Bihar was an Urdu weekly, Urdu Akhbar, which was published in 1810 from Calcutta. But another weekly "Noor-ul-Anwar" published in 1853 from Arrah (Bihar)."

(Journalism in Bihar by N. Kumar, Bihar District Gazetiers, 1971, Page-V)

اس طرح بہار میں اردو صحافت کا آغاز ہوا اور اس کا سفر طئے ہوتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کی غدر سے قبل تک نورالانوار کے علاوہ ''پٹنہ ہرکارہ'' (۲۱/اپریل ۱۸۵۵ء میں پٹنہ سے)، ''اخبار بہار'' (یکم ستمبر ۱۸۵۶ء میں پٹنہ سے) اور ویکلی رپورٹ'' (یکم مئی ۱۸۵۶ء میں گیا) سے شائع ہوتے رہے۔

بہار میں ''نورالانوار'' نے صحافت کی بنیاد ڈالی، جو اس وقت کے حالات کے تحت اردو کو اول مقام حاصل ہوا۔ اردو کے بعد بہار میں انگریزی اخبار ''بہار ہیرالڈ'' ۱۸۷۲ء میں پٹنہ سے شائع ہوا۔ اس کے دو سال بعد ایک ہندی اخبار ''بہار بندھو'' پٹنہ سے جاری ہوا۔ اردو اخبار نورالانوار کا کوئی شمارہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔ لیکن ''ہرکارہ'' اور ''اخبار بہار'' کے مختلف شمارے خدا بخش خاں

لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔

انگریزی، ہندی صحافت کے آغاز کے بعد بہار کی مقامی زبانوں میں بھی اخبارات نکلنے شروع ہوئے اور اس طرح پورے صوبۂ بہار میں صحافت پھلنے پھولنے لگی اور لوگوں کے مسائل، ملک کے حالات اور صوبہ کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی، ادبی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے جڑ گئی اور ارتقائی منزلیں آہستہ آہستہ بتدریج طے ہونے لگیں۔

ملک کی آزادی یا تقسیم ہند تک بہار کے اردو اخبارات میں ہفتہ وار اخبار ''عظیم الاخبار'' ۱۸۶۷ء میں آرہ سے، سہ ماہی ''نیرالفوائد'' ۱۸۶۸ء میں مظفرپور سے، پندرہ روزہ ''اخبارالاخیار'' پٹنہ سے، پندرہ روزہ ''چشمۂ معلم'' ۱۸۷۱ء میں گیا سے، ''گلدستۂ نظائر'' مظفرپور سے، ''شعاع مہر'' ۱۸۷۲ء میں مونگیر سے، ہفتہ وار ''نسیم سارن'' ۱۸۷۸ء میں گیا سے، ''نورالاسلام'' ۱۸۸۱ء میں پٹنہ سے، ہفتہ وار ''شرف الاخبار'' ۱۸۸۲ء میں مظفرپور سے، ''نوائے عشق'' ۱۸۸۶ء میں پٹنہ سے، ''عالم آرہ'' ۱۸۸۷ء میں پٹنہ سے، ہفتہ وار ''انیس'' ۱۸۹۵ء میں گیا سے نکلتے رہے۔

ان تمام اخبارات و رسائل میں ''اخبارالاخیار''، ''اردو انڈین کرائیکل''، ''اردو ہیرالڈ''، ''پیغام''، ''اتحاد''، ''روشنی''، ''صدائے عام'' وغیرہ کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کی تحریروں نے انگریز حکمرانوں کی راتوں کی نیندیں حرام کر دیں اور اتنے منظم طریقے سے صحافتی خدمات انجام دیئے کہ آج ان کے ذکر کے بغیر اردو صحافت کی تاریخ نامکمل نظر آتی ہے۔ صوبہ بہار میں سیاسی و سماجی سطح پر جس طرح سے آزادیٔ ہند کی لڑائی لڑی گئی اس کی تفصیلات مختلف کتابوں اور رسالوں میں موجود ہیں۔ بہار کے کئی اردو اخبارات کے صفحات اس امر کے شواہد ہیں کہ اپنے محدود وسائل کے باوجود انہوں نے جنگ آزادی میں نہ صرف نمایاں رول ادا کئے بلکہ انگریزوں کے سخت قوانین اور پابندیوں کے وہ شکار بھی ہوتے رہے۔ جنگ آزاد میں عوام کی رہنمائی اور ترجمانی میں پیش پیش رہے بلکہ بہار کے لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کے شعلے بھرتے رہے اور انگریزوں کے ظلم و زیادتی کی کہانی بیان کر کے ان کے خلاف نفرت اور بغاوت کی آگ کو ہوا دیتے رہے۔

بہار کی اردو صحافت روز اول سے ہی لیتھو کی کتابت وطباعت کے سہارے چلتی رہی۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۰ء کے آس پاس تک چلتا رہا۔ لیتھو کی کتابت واشاعت کے ماہرین نے اس فن کو اپنے خون وجگر سے سینچا۔ دھیرے دھیرے اس فن کے ماہرین گذرتے گئے اور نئی ٹکنالوجی جگہ پاتی گئی اور اس طرح لیتھو کا فن ختم ہوتا گیا۔ ۱۹۹۵ء سے بہار کی اردو صحافت میں طباعت کے لحاظ سے نمایاں تبدیلی آئی اور یو۔این۔آئی اردو نیوز ایجنسی، فیکس، اردو ٹیلی پرنٹر، اردو سافٹ ویئر (کمپیوٹر کمپوزنگ) اور آفسیٹ وغیرہ ایک ساتھ سامنے آئے اور طباعت کا معیار بہتر ہوا۔ آزادی سے قبل تک گرچہ بہار سے اردو کے اخبارات بہت کم تعداد میں نکل رہے تھے لیکن وہ اردو صحافت کا سنہرا دور تھا۔ تقسیم ہند نے ملک اور بہار کی اردو صحافت کو بہت حد تک متاثر کیا۔ اس کا معیار گرتا چلا گیا۔ وسائل کی کمی، تنگ دستی، تنگ نظری اور بے توجہی کی شکار، بہار کی اردو صحافت کو آزادئ ہند کے بعد سلطان، سہیل عظیم آبادی، قیوم خضر، شمس الہدیٰ استھانوی، غلام سرور، محمود مرغوب، معین شاہد، کلام حیدری، شین مظفر پوری اور شاہد رام نگری جیسے باشعور اور باصلاحیت صحافیوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں تھام کر آگے بڑھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔

اس طرح بہار میں اردو صحافت کا سلسلہ عروج وزوال کے درمیان چلتا رہا۔

☆☆☆

سلمان عبدالصمد

متھلا کے پانچ رسائل-ایک جائزہ

(1980 سے پہلے)

شمالی بہار کا موجودہ خطہ متھلا اپنے علمی وادبی کمالات کی بنیاد پر ہندوستانی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ایک طرف جہاں برادران وطن کے لیے یہ خطہ مخصوص مذہبی نقطہ نظر سے باعث کشش ہے، وہیں اسلامی قدیم مآخذات اور درسی کتب کے لحاظ سے بھی قابل التفات۔ اسی طرح یہاں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کی پرکشش تاریخ بھی ملتی ہے اور ان کی نشانیاں آج بھی دربھنگہ میں موجود ہیں۔

رہی بات یہاں کی صحافت کی تو جس طرح پٹنہ اور گیا سے بہار کی اردو صحافت کی سنہری تاریخ جڑی ہوئی ہے، اسی طرح متھلا کی سرزمین سے بھی۔ تحقیق کے مطابق 1902 میں یہاں سے پہلا ادبی جریدہ ''مسیحا'' نکلا۔ اسی طرح متعدد قابل ذکر رسائل وجرائد'' ہمالہ، نئی کرن، پروانہ، البدر، کردار، توازن'' وغیرہ یہاں سے شائع ہوئے۔ فہرست سازی کی جائے تو یہاں سے نکلنے والے تقریباً پانچ درجن سے زائد رسائل کا پتا چلتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بیشتر رسائل کی زندگی انتہائی کم رہی ہے اور ان کی سانس کی ڈور چند شماروں کے بعد ٹوٹتی چلی گئی۔ فی الوقت وہاں سے چند معیاری ادبی، سیاسی اور اسلامی رسالوں کی اشاعت ہو رہی ہے۔ مثلاً، جہان اردو، تمثیل نو، دربھنگہ ٹائمس، کسوٹی جدید، الہدیٰ، ندائے محمود، شفا وغیرہ۔ اگر متھلا سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا ہے کہ نہ صرف آج یہاں کے صحافی اردو صحافت کو مضبوطی فراہم کر رہے ہیں، بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کو تنومند اور قابل اعتبار بنانے میں کسی نہ کسی سطح پر یہاں کے صحافیوں کا بھی کردار رہا ہے۔ متھلا کے صحافتی منظرنامے اور دیگر تاریخی حقائق سے قطع یہاں پر فقط پانچ رسائل کا تفصیلی تذکرہ کر رہے ہیں۔

نئی کرن -50-1949

در بھنگہ کی صحافتی افق پر ''نئی کرن کی روشنی'' کب پڑی اور کب تک پڑتی رہی یا پھر اس کی روشنی کو گُم کرنے کے لیے دو شمارہ کے دورانیہ میں حالات و مسائل کا منصوعی اندھیرا کب اور کیسے پھیلا دیا گیا، ان سب کے متعلق معلومات نہیں ہیں۔ پیش نظر ''نئی کرن'' کے تین شماروں سے یہ تو علم ہوتا ہے کہ اس کا معیار عمدہ تھا۔ ''نئی کرن'' کے سورج کو گہن لگا نہیں لگا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس پر پولیس کا عتاب نازل ہوا۔ مدیروں کو قانونی داؤ پیچ کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ رسالوں کے اشاعتی دورانیہ میں بادھا ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم یہ علم نہیں ہوتا ہے کہ کس مدیر کی گرفتاری کب اور کیوں ہوئی؟ ''شہاب اور امام کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ نئی کرن کے گلے میں پھانسی کی رسی لٹکائی جا سکتی ہے لیکن اس آفتاب کی کرنوں کو کون اسیر کر سکتا ہے''۔ (شمارہ 2) سے پتا چلتا ہے کہ بہر حال ''نئی کرن'' کے پہلے شمارے کے مدیر ام امام اور شہاب کی گرفتاری نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا ''نئی کرن'' کے دورِ دوم میں امام اور شہاب نے ادارت کی تھی؟ جبھی تو ''نئی کرن'' کے ایڈیٹروں کی گرفتاری ہوئی اورام امام اور شہاب گرفتاری سے محفوظ رہے، لیکن عزم و حوصلہ کا ثبوت دیتے ہوئے گرفتار ہونے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ان تمام الجھاوے کی موجودگی میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ''نئی کرن'' دو ادوار میں شائع ہوا یا فقط ایک میں ہی؟ یا پھر لاشعوری طور پر حالات کے خوف سے لکھ دیا گیا کہ گرفتاری ہوئی، تا کہ رسالہ کا معیار اور بھی دلکش ہو جائے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ''نئی کرن'' میں جلد اور شمارہ یا پھر سنہ اشاعت کا ذکر نہ کرنے میں کن عوامل کی کارفرمائی ہے؟ تینوں شمارے کے صفحات الٹتے چلے جائیں، ان کی تاریخ اشاعت وغیرہ کا کوئی علم نہیں ہو سکے گا۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود یکجا تینوں شمارے پر لائبریری کارکن کے ہاتھ سے معلومات کچھ یوں درج ہے: ''جلد 1، شمارہ 2 1962۔ جلد 2، شمارہ 4-3، 1963 اور 3-1، 1949-50'' ان اعداد و شمار کا مطلب دو طرح سے نکلتا ہے۔ ایک اعتبار سے کہ اس کی پہلی اشاعت 1962 میں ہوئی، جب کہ دوسرے رخ سے 50-1949 میں مشترکہ اولین تین شماروں

کا پتا چلتا ہے۔ حالانکہ پیش نظر تینوں شماروں سے قطعاً اس کی وضاحت نہیں ہوتی ہے کہ نئی کرن کے مشترکہ شمارے بھی منظر آئے۔ تینوں پر نمبر ایک، دو اور تین لکھا ہوا۔ ڈاکٹر امام اعظم کے مطابق 1949 میں تین ہی شمارے شائع ہوئے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اشاعت کے دورانیہ میں آنے والی رکاوٹ کی وجہ کیا تھی؟ ''دس ماہ کے التوا کے بعد نئی کرن آپ کے سامنے ہے۔ یہ وقفہ صرف دس مہینوں کا نہیں بلکہ پورے دو سال کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نئی کرن کا پہلا نمبر آپ کے ہاتھوں میں اس وقت پہنچا، جب سال رواں وقت کے بطن سے جنم لے رہا تھا لیکن اس کے مضامین کی ترتیب و تدوین اس سے بہت پہلے -- جب لاشوں کی تقسیم ہو رہی تھی اور انسانی خونوں سے آزادی کا چراغ روشن کیا جا رہا تھا -- تکمیل پا چکی تھی۔ (شمارہ نمبر 2)'' اداریہ سے ماخوذ اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1948 میں اس کی اشاعت ہوئی ہوگی، کیوں کہ جب پہلا شمارہ آیا تو وقت کے بطن سے 1949 کا جنم ہی ہوا تھا اور جب یہ سال ختم ہونے کو آیا تو دوسرا شمارہ منظر عام پر آیا، جس میں معنوی اعتبار سے دو سال کا وقفہ بتایا جا رہا تھا، یعنی 48-1949 دو سال کا وقفہ ہے۔ پھر یہ جملہ بھی کہ جب لاشوں کی تقسیم ہو رہی تھی اور آزادی کا جشن تھا تو اس کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس سے مطلب نکلتا ہے کہ 1947 کے آخری ایام سے ہی اس کی اشاعت کے لیے پر تولا جانے لگا تھا۔

پہلے شمارہ میں اداریہ کے بعد تیس صفحات پر مشتمل گوشہ میں عبدالعلیم آسی، محمد یونس احمر، ام امام، اختر پیامی، دہر ناصری، ارشد کاکوی، نسیمہ سوز، کامران اختر، منظر شہاب کی نظمیں اور محسن مظفر پوری، منظور احمد نظر اور ام امام کی غزلیں ہیں۔ گوشہ مضامین میں محمد مسلم کی مختصر سوانح خود ان کی زبانی اور کسی قرۃ العین کی شاعرانہ خصوصیات پر افسر ماہ پوری کا مضمون ہے، جب کہ افسانوی تحریروں میں ش. مظفر پوری (نقش ناتمام)، شرف الدین احمد (چورنگی)، حسن امام درد (انتظار عشق)، ضیا عظیم آبادی (گوری رے تو رے..) کے افسانے ہیں گوشہ حرف آخر میں ابراہیم جلیس کے پہلے ناول ''چور بازار'' پر م، ح در بھنگا کا مفصل تجزیاتی تبصرہ اور کرشن چندر کے ڈرامہ ''سرائے کے باہر'' پر بننے والی فلم کا جائزہ ہے، جو ام امام نے تفصیلی لکھا ہے۔

نئی کرن کے شمارہ نمبر 2 میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم اور اختر ہوشیار پوری، حسن طاہر اور باقر مہدی کی غزلیں ہیں۔ پرتھوی ناتھ شرما اور کوثر چاند پوری کے افسانے ہیں۔ مکتوب میں ہاجرہ مسرور، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی، عادل رشید، ش. مظفر پوری، پرکاش پنڈت، شوکت صدیقی، حبیب تنویر، صہبا لکھنوی، کشمیری لال ذاکر، صفیہ نقوی کے خطوط ہیں۔ جب کہ مشمولات میں فریڈرک اینگلر، کارل مارکس، مائیکافکسی، پکاسو، ایلیا اہرن برگ، سین او کیسی کے اقتباسات کی اشاعت ذکر ہے، لیکن آخر میں شائع ادارتی نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ عین وقت پر ان اقتباسات کے ساتھ ساتھ صفیہ نقوی کی کہانی وغیرہ کی شمولیت نہیں ہوسکی۔ تیسرے شمارے میں فراق گورکھپوری، جمیل مظہری، اثر لکھنوی، عبدالحمید عدم، تاجور سامری کی غزلیں اور ظہیر کاشمیری، وامق جونپوری، فارغ بخاری، بلراج کومل، غلام ربانی تاباں اورام امام کی نظمیں ہیں۔ افسانوی تحریروں میں کنہیالال کپور (اپنی یاد میں)، مانک بنرجی (ایک رات)، گنپت شرما (زندگی یا موت)، فکر تونسوی (تو تم مجرم تھے) شامل ہیں۔ گوشہ وعدہ فردا میں خواجہ احمد عباس، اپندر ناتھ اشک اور ہنس راج رہبر کے خطوط ہیں۔ نگاہ طائرانہ میں جگن ناتھ آزاد ''بیکراں''، نریش کمار شاد ''دستک'' اور تیغ الہ آبادی تینوں کے مجموعہ کلام کا انتہائی مختصر تعارف ہے۔ ''نئی کرن'' کے تینوں شمارے مختلف سائز کے ہیں۔ پہلا، ڈیمائی سائز 1x16 کا ہے۔ جب کہ دوسرا میگزین سائز اور تیسرا 1x8 سائز میں ہے۔

اداریہ اور مشمولات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''نئی کرن'' کو انتہائی عمدگی سے نکالنے کا جذبہ اس کے مدیران کے قلب و ذہن میں موجزن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چو طرفہ تعاون اس رسالہ کو حاصل ہوا۔ اردو کے نامور ادبا و شعرا اپنے کلام و تخلیق سے نوازتے اور نیک مشورے بھی دیتے تھے۔ خطوط کے گوشہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ اچھا لکھنے والوں سے رابطہ کیا جاتا تھا۔ غیر مطبوعہ مواد طلب کیے جاتے تھے۔ کبھی تو طلب کرتے ہی فوراً سب کچھ مل جاتا تھا یا پھر اچھا لکھنے والے معذرت کر دیتے تھے۔ ہاجرہ مسرور لکھتی ہیں:

''گرامے نامے ملے۔ ہم تینوں ممنون ہیں۔ ندیم بھائی اور خدیجہ بہن ان دنوں بیمار ہیں اور میں ''نقوش'' کی ترتیب کے سلسلے میں بہت مصروف

اور پریشان ہوں۔ ذرا فرصت ہولے اور یہ بہن بھائی بھی تندرست ہولیں تو ہم سب ''نئی کرن'' کے لیے لکھیں گے۔ اس لیے کہ ہمیں آپ کے مقاصد سے صرف اتفاق ہی نہیں بلکہ ان مقاصد کو پورا کرنا ہمارا فرض بھی ہے اور یہ مقاصد آج ساری عوامی دنیا کے لیے مشترک ہیں''۔

(نئی کرن، شمارہ 2، ص 35)

کرشن چندر لکھتے ہیں:

''آپ کے خطوط مجھے مل گیے تھے اور رسالہ ''نئی کرن'' بھی۔ لیکن پچھلے دنوں میں بے حد مصروف رہا ہوں۔ پہلے انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس کی تیاریوں میں لگا رہا۔ پھر امن کانفرنس ہوئی۔ اس [سے] فارغ ہوا تو میری اہلیہ بیمار ہوگئیں۔ یہ سطریں بھی محض اس خیال سے لکھ رہا ہوں کہ کہیں آپ میری خاموشی کا غلط مفہوم نہ نکال لیں۔ مفصل خط میں آپ کو آئندہ فرصت ملتے ہی لکھوں گا''۔

(نئی کرن، شمارہ 2، ص 35)

صحیح معنوں میں ''نئی کرن'' نے دربھنگہ کی صحافت کو سمت و رفتار دینے کی کوشش کی اور ملک و بیرون ملک کے ادبا کو اس سے جوڑنے کا بھی کام کیا۔ اس طریقہ کار میں دیگر مدیروں کے لیے سبق کا پہلو یہ ہے کہ جمعِ مواد کے لیے کی جانے والی تمام کوششیں یک دم بار آور نہیں ہوتیں، بلکہ رفتہ رفتہ رسالہ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اچھا پڑھنے لکھنے والے اس سے جڑتے رہتے ہیں۔ ''نئی کرن'' کو دربھنگہ کی صحافت میں خشت اول کی حیثیت گرچہ حاصل نہیں، تاہم اولین بہترین رسالے کے ضمن میں اس کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ جب طباعت و اشاعت کا مرحلہ انتہائی دشوار گزار ہوتا تھا، اس وقت بھی یہاں سے اچھے رسالے منظر عام پر آئے۔ پتا نہیں کیوں کہ یہاں سے آب و تاب سے نکلنے والے رسائل بھی بہت جلد دم توڑ جاتے ہیں، ''نئی کرن'' بھی اس معاملہ میں بیشتر رسالوں سے مستثنیٰ نہیں۔

جہاں تک نئی کرن کے اداریہ کا تعلق ہے تو دربھنگہ سے شائع ہونے والے بیشتر رسالوں سے

اس کا اداریہ عمدہ ہوتا تھا۔ ادبی مسائل و مباحث سے لبریز ہوتا تھا۔ اس رسالہ جیسا اداریہ فقط ''کردار'' اور ''توازن'' میں ہی نظر آیا۔ ''نئی کرن'' کا پہلا اداریہ منظر شہاب نے لکھا تھا، جو ''نقش فریادی'' کے عنوان سے دو صفحے پر مشتمل تھا۔ یہاں سے شائع ہونے والے دیگر رسائل کے اداریوں میں عموماً مسائل کا رونا ہوتا تھا، لیکن ''نئی کرن'' اس سے پاک ہے۔ منظر شہاب کے اداریہ سے:

> ''ادب کی مثال گراموفون جیسی ہے۔ گراموفون وہی بولتا ہے جو ریکارڈ کے اندر پیوست کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی دوسرے نغمے کی خواہش ہو تو ریکارڈ کی تبدیلی لازمی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم ادب میں پاکیزگی یا بہ قول شخصے ''شائستگی'' کے آرزومند ہیں تو ہمیں پہلے اپنا سماج بدلنا پڑے گا، لیکن جب تک ملک میں غلامی، غربت، فلاکت، بھوک، برہنگی، یہ تمام چیزیں موجود رہیں گی، اس وقت ادب کا منہ بھی کالا رہے گا، جب یہ سب مجبوریاں دور ہو جائیں تو ادب کے چہرے کی سیاہی بھی مٹ جائے گی''۔
>
> (نئی کرن، شمارہ 1، ص 5)

ادبی سماجیات کے تناظر میں یہ جملے معقول ہیں۔ کیوں کہ بلاشبہ ادبی فن پارہ اپنے معاشرہ کا عکاس ہوتا ہے اور عصری تقاضوں کا آئینہ دار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس عہد کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس میں وہ ادب تخلیقی مراحل سے گزرتا ہے۔ عہد ماضی کے حالات و کردار، رسم و رواج، سیاسی نشیب و فراز، ارباب سیاست کے عادات و اطوار، مذہبی لیڈران کی ذہنیت، عمومی نشست و برخاست، غرض کہ تمام تر عوامی مذاق سے بخوبی واقفیت ہو جاتی ہے۔ ادب کا مطالعہ اس سے بھی آگاہ کر دیتا ہے کہ ادب کی سرپرستی کیسے ہاتھوں میں ہوئی، کن افکار و خیالات اور کن تحریکات کے زیر اثر ادبا اسے فن کا جامہ پہناتے رہے ہیں۔ یعنی منظر شہاب نے ادبی سماجیات کے تناظر میں جو کچھ کہا ہے، وہ کسی حد تک دل کو لگتا ہے، تاہم یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات ادیبوں کو تخیل کی بنیاد پر ایسا کچھ بھی پیش کرنا ضروری ہے، جس میں موجودہ سماج کی خرابیاں دو چند ہو جائیں اور اچھائی کی طرف اس کا میلان ہونے لگے۔ اس لیے صحافیوں اور ادیبوں کو چھٹکارا نہیں ملے گا کہ جو

معاشرہ میں ہو رہا ہے، اسے ہی دکھا دینا ہمارا فریضہ ہے۔ جو ہو رہا ہے، اسے دکھانے کی ضرورت ہی کیا، وہ تو خود ہی دِکھ رہا ہے۔ انھیں یہ بھی دکھانا ہے، جو ہو سکتا ہے۔ جو ہونا چاہئے۔ جو لوگوں کے حق میں مفید ہو۔

دوسرے اور تیسرے شمارہ کا اداریہ مظہر امام نے لکھا ہے۔ دوسرا شمارہ، جو کوئی دس ماہ کے وقفہ کے بعد منظر عام پر آیا تھا، کے اداریہ کا رنگ ذرا مختلف ہے۔ اس میں ادبی مباحث کا رنگ کچھ گہرا ہے۔ امام نے ایک نظریاتی مضمون کے نقطہ نظر سے عمدہ اداریہ لکھا ہے اور گاہ گاہِ مغربی اور مشرقی نظریہ سازوں کے جملوں کا بھی اس میں استعمال میں کیا۔ تقریباً تین صفحہ کے اداریہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند نظریات اسے عزیز تھا اور اس کا فروغ ہی اس کا مطمح نظر تھا۔ تیسرے شمارے کے اداریہ کا انداز بالکل ہی مختلف ہے۔ کیوں کہ علی عباس حسینی، جگن ناتھ آزاد، سرشار صدیقی، کشمیری لال ذاکر، ش مظفر پوری، حسن امام درد، نریش کمار، اختر ہوشیاری پوری، دیوندر اسّر، خلیل الرحمٰن اعظمی، انجم اعظمی، پرتھوی ناتھ شرما کے خطوط کو اداریہ میں من و عن نقل کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مظہر امام نے رسالہ کے معیار و منہاج اور تحسین کے تناظر میں تجزیہ کیا ہے۔ ان خطوط میں نہ صرف ''نئی کرن'' کی تحسین موجود ہے، بلکہ ترقی پسند نظریات کے متعلق شوشے گوشے بھی ابھرنے لگتے ہیں۔ پہلے شمارہ کے اداریہ سے ترقی پسندیت سے قربت کا خاصا احساس تو نہیں ہوتا، البتہ دوسرے اور تیسرے شمارے کے اداریہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ ترقی پسندی کا ہمنوا ہے۔ لب لباب یہ کہ ''نئی کرن'' کی شعاعیں زیادہ دنوں تک تو برقرار نہیں رہیں، تاہم جتنے دنوں تک رہیں شعاعوں میں خاصی تپش تھی۔ ہر گوشہ کی روشنی قابل دیدنی تھی۔

صبح زندگی- 1949

دربھنگہ کے ادبی افق پر گاہ گاہِ متعدد رسالے نمودار ہوئے۔ ان رسالوں میں ادبی کشش تھی۔ نامور ادیبوں کا انھیں تعاون حاصل رہا۔ ابتدائی شماروں سے ہی ان کے حصے میں پذیرائی بھی آئی لیکن یہاں سے شائع ہونے والے اکثر رسالوں کی سانس کی ڈور جلد ہی جلد ٹوٹتی چلی گئی۔ پیش نظر ماہنامہ ''صبح زندگی'' کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ اس نے ادب نوازوں سے وفا نہ کی۔ اس کے

پانچویں شمارے میں شائع ہونے والے اشتہار کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھٹے شمارے میں روح پھونکنے کا موقع ہی نہ آیا:

''جریدہ اب تک رجسٹرڈ نہیں ہوسکا ہے۔ معلوم ہوا کہ محکمہ کے دریافت کرنے پر اکثر خریداروں نے جواب نہیں دیا، اس لیے گزارش ہے کہ فوراً جواب دیں، ورنہ سخت نقصان ہوگا''۔

اس اشتہار اور صبح زندگی کے چوتھے شمارہ میں اس رسالہ کے خلاف رسالہ 'الہدیٰ' کی پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے متعلق وضاحت سے پتا چلتا ہے کہ دربھنگہ کی صحافت میں ثابت قدمی کا عنصر نہیں رہا ہے۔ ابھی صبح زندگی میں صبح کی روشنی بھی نہیں پھوٹی تھی کہ اسے اکھاڑ پھینکنے کی مہم چلنے لگی۔ اس کے خلاف علم بلند کر دیا گیا۔ راقم نے 'الہدیٰ' میں شائع ہونے والے اس تحقیر آمیز نزاعی خط کو دیکھنے کی کوشش کی، تاہم یہ ہاتھ نہیں آسکا۔ البتہ صبح زندگی میں شائع ہونے وضاحتی نوٹ سے 'الہدیٰ' کا معاندانہ رویہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ دربھنگہ کی صحافت کے مضبوط نہ ہو پانے کی متعدد وجوہات میں یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک رسالہ دوسرے کے خلاف محاذ آرائی قابل تحسین سمجھتا تھا/ ہے۔

ماہنامہ 'صبح زندگی' مارچ 1949 میں طلوع اور ماہ جولائی میں غروب ہوگیا۔ اس کے 'شاید' کل پانچ شمارے منظر عام پر آئے۔ خدا بخش اورینٹل لائبریری میں شمارہ نمبر چار کے علاوہ بقیہ ناقص شمارے موجود ہیں۔ کسی سے اداراتی صفحہ غائب ہے تو کسی میں درمیان سے چند صفحات۔ اس رسالہ پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ایس ایم سلطان، محمد طیب، کوثر دربھنگوی، سید ریاض حسن کا نام درج ہے۔ رسالہ کے اجراء کے تناظر میں پہلے شمارے کے اداریہ میں مدیر لکھتے ہیں: ''ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے چند زندہ اور مستعد دلوں میں دھندلا سا ایک خیال پیدا ہوا کہ دربھنگہ جیسی جگہ ہمیشہ علم و فن کا مرکز رہا ہے اور جہاں سے انتہائی مشکلات کے دور میں متعدد رسالے اور اخبار نکلتے تھے اور آج جب کہ بہت سی سہولیتیں اور بہترے جوہر قابل موجود ہیں، یہ بہت بڑی ناشکری ہوگی کہ صرف ایک نئی کرن پر اکتفا کیا جائے، بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کی تابانیوں میں اضافے کے لیے یہاں سے زیادہ سے زیادہ رسالے اور اخبار نکالے جائیں۔ چنانچہ خاص

خاص لوگوں کو دعوت دی گئی اور ایک جلسہ منظر شہاب صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا اور اسی میں طے پایا کہ ایک اور رسالے کی اشاعت ضروری ہے''۔

رسالے کے مشمولات یا ترتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی بھی کالم کا التزام نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مرتب انداز میں کہیں مضمون تو کہیں افسانہ، کہیں غزل تو کہیں نظم۔ ترتیب کے اس طریقہ سے احساس ہوتا ہے کہ جس طرح سے تحریریں موصول ہوتی ہوں گی، اسی طرح مشمولات میں جگہ ملتی رہی ہوں گی، یعنی ترتیب میں صنف اور کالم کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا۔ پہلے شمارے کی فہرست میں اداریہ کے معاً بعد عبدالعلیم آسی کی غزل ہے۔ اس کے بعد علی الترتیب آزاد نظم کے خلاف شبلی نعمانی میر غیاث چکوی کا مضمون اور محمد محسن مظفر پوری کی غزل، پریم ساگر کے نام ایک خط: منظر شہاب، پیمان وفا (نظم): ام امام، درندے (افسانہ): ریاض حسن، پچھتاوا (ترجمہ انگریزی): محمد ظفر عالم صدیقی، افکار پریشان: ام احمد، وہی دو منحوس آنکھیں (مزاحیہ) ام صلاح الدین باری عظیم آبادی، عزم جوان (ایک ناتمام نظم): شبلی نعمانی میر غیاث چکوی، کمزوری افسانہ: ایف آر بھاگلپوری، جرعے: ادارہ، صبح کا منظر: او ایف بھاگلپوری، رباعیات (ترجمہ از رباعیات خیام)، نئی کرن کے بعد اور تاثرات فکری: محمد طہٰ الٰہی فکری، دیش کا پریم (افسانہ): کوثر دربھنگوی ہے۔

جیسا کہ کہا گیا کہ فہرست سازی میں کسی گوشہ کا کوئی اہتمام کیا گیا ہے اور نہ ہی صنف ادب کا اعتبار، پہلے شمارہ کے مشمولات سے ہی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے اور آخری شمارے تک بھی مدیروں نے فہرست سازی کا کوئی خاص طریقہ نہیں اپنایا۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالہ میں اسلامیات، ادبیات، تعلیمات وغیرہ مختلف موضوعات پر مضامین شامل کیے گیے۔ دیگر ادبی رسالوں کے مانند نہ اس میں خطوط کا گوشہ ہے اور نہ ہی تبصرہ کا۔ خطوط کا گوشہ نہ ہونے کی وجہ سے رسالے متعلق قارئین کے آرا سے بھی واقفیت نہیں ہو پاتی ہے۔ پانچویں شمارے میں شائع ہونے والے اعلان سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالہ 'صبح زندگی' عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ محکمہ کی طرف سے رسالے کی بابت دریافت کیے جانے پر لوگوں نے سکوت

اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا، جس کا احساس شاید ایڈیٹر کو بھی تھا۔

صبح زندگی کے شماروں پر نظر ڈالنے سے یہ بھی التباس پیدا ہوتا ہے کہ شبلی نعمانی کے نام سے شائع ہونے والی تحریریں علامہ شبلی نعمانی کی ہیں یا پھر کوئی اور شبلی نعمانی تھے۔ کیوں کہ کہیں کہیں شبلی نعمانی لکھا ہوا ہے، تو کہیں شبلی نعمانی میر غیاث چکوی کا بھی لاحقہ ہے۔ علامہ شبلی نعمانی متضاد اوصاف کے مالک تھے۔ مختلف اصناف ادب پر انھوں نے طبع آزمائی کی۔ 'صبح زندگی' میں شائع ہونے والے دونوں شبلی متضاد اوصاف کے مالک نظر آتے ہیں۔ التباس کا رنگ اس وقت اور بھی گہرا ہو جاتا ہے، جب فہرست میں میر غیاث چکوی کا اضافہ ہوتا ہے اور مضمون کے ساتھ فقط شبلی نعمانی، کبھی کبھی تو اس کے برعکس صورت بھی ہوتی ہے۔ ایڈیٹنگ کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس التباس سے بچنے کے لیے شبلی نعمانی کے ساتھ التزاماً 'علامہ' کا سابقہ استعمال ہوتا۔ البتہ ''چند لمحے اقبال کے ساتھ'' والے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علم کے علامہ شبلی نعمانی کا ہی ہے، جس میں انھوں نے علامہ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ یہ یک موضوعی مضمون نہیں ہے، جس کا اعتراف شبلی نے بھی ایک مختصر نوٹ میں کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ صبح زندگی کو ادبی رسالہ کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی، کیوں کہ اس میں مختلف موضوعات پر مضامین شامل اشاعت ہوتے تھے۔ جیسا کہ ایڈیٹر کے اعلان سے خود یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ رجسٹرڈ بھی نہیں ہو پایا تھا، اس لیے قرین قیاس ہے کہ چھٹا شمارہ شائع نہیں ہوا ہوگا اور اس کے چار شماروں کے علاوہ کسی مزید شمارے کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ جہاں تک اس کے اداریوں کا تعلق ہے تو ان میں علمی تلازمے اور مکالمے کا رنگ نظر نہیں آتا ہے۔ بس اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اور تعاون کی درخواست۔ 'رفتار نو' کا اداریہ بھی کوئی خاص نہیں ہوتا تھا، تاہم اس کے مدیران عمدہ لکھنے والوں سے تحریروں کی حصولیابی میں سرگرداں نظر آتے ہیں، جس کا احساس اس کے مشمولات سے بھی ہوتا ہے، تاہم صبح زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہے، جس سے معلوم ہو سکے کہ دوسرے شمارے کو پہلے شمارہ سے ممتاز کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہو۔

افق - 1953

دربھنگہ کے ادبی افق پر فروری 1953 میں ایک ادبی رسالہ ماہنامہ ''افق'' نمودار ہوا۔ اس کا ایک ہی شمارہ راقم کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، جس پر شمارہ اور جلد نمبر ایک درج ہے۔ اس کے بعد کوئی شمارہ شائع ہوا یا نہیں، اس کا کسی کو کوئی علم نہیں ہے۔ اداریہ میں ہے:

> ''ہم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ پہلا شمارہ پریس کی بدنظمی اور چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے فروری کا شمارہ ہوگیا ہے۔ آپ کے حسب توقع پیش نہیں کیا جاسکا ہے۔ عام طور پر پہلے شمارہ میں خامیاں رہ جاتی ہیں، جو ہمدروں کے مخلصانہ مشوروں اور رفیقانہ تعاون کے بعد دور ہو جاتی ہیں۔''
>
> (ماہنامہ افق، فروری 1953، ص 4)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا ہی شمارہ ہے، جسے جنوری سے نکالنے کی کوشش کی گئی تھی مگر کامیابی نہیں ملی، اس لیے اس کی اشاعت فروری میں ممکن ہو پائی۔ اداریہ کے چند جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ بھی اس کی اشاعت ہوئی ہوگی۔ ''بچوں کو لکھنے کا شوق بڑھانے کے لیے، ہم کہانی، مضامین کا مقابلہ شروع کر رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ کہانی کا مقابلہ ہوگا۔ سب سے اچھے لکھنے والے کو انعام میں کتابیں دی جائیں گی۔ کہانیاں 20 فروری تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے'' یہ جملے اس کی مزید اشاعت کی کہانی سنا رہے ہیں مگر وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ پیش نظر اکلوتا شمارہ کے علاوہ کسی اور کا کچھ علم نہیں۔ میگزین سائز کے اس رسالہ کے سرورق پر ''کرنیں'' لکھا ہوا ہے، جس کے تحت جہاں اس شمارہ میں شامل ادبا و شعرا کے اسماء درج ہے، وہیں سولہ مزید نام بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں موجود 32 ناموں سے 16 دوسرے شمارے میں شامل ہونے والے ادبا وشعراء کے نام ہوں۔

مشمولات میں اداریہ کے بعد مضمون نما ''انقلاب'' نامی عبدالمالک کی تحریر ہے۔ بعد ازاں زکی انور 'مجبوری'، شفیع جاوید 'آرٹ اور تمباکو'، طارق جمیلی 'دھوپ چھاؤ' اور حسن نعیم 'دادا' کی افسانوی تحریریں شامل اشاعت ہیں۔ شمیم شیریں نے ''پچھلی رات'' کے عنوان سے مکالمہ کے انداز میں 'افسانہ' پیش کیا ہے۔ اس میں ڈرامائیت سے زیادہ افسانویت ہے۔ اس کا اختتام انتہائی دلکش ہے:

نجمہ: ''لیکن باجی آوازیں تو بڑی ڈراؤنی ڈراؤنی سی آرہی تھیں؟''

رضیہ: آوازیں۔ ارے وہ تیرے رشید بھائی کوئی شعر گنگنا رہے ہوں گے۔

نجمہ: شعر اگر یوں ہی گنگنایا جاتا ہے.....

رضیہ: تو مجھے جگا لیا ہوتا۔

نجمہ: تم کو پکارا لیکن تم نہ بولیں۔ ڈرتے ڈرتے تمھارے پلنگ کو ہاتھ سے ٹٹولا، وہ بالکل خالی تھا۔

رضیہ: میرا پلنگ خالی تھا؟ ارے پگلی تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔

ان افسانوی تحریروں کے علاوہ راہی معصوم رضا، ناظر الحسینی، محمود عالم، انیس امام، پرویز شاہدی، شاہد جمیل حاجی پوری، صلاح الدین ظہیری، حمید قادری ذوق، وصی حیدر جاوید، رمز عظیم آبادی کی نظمیں اور غزلیں ہیں۔

تیس صفحات پر مشتمل اس رسالہ کا کوئی خاص رنگ ابھر کر سامنے نہیں آتا ہے۔ مشمولات میں کوئی اہتمام ہے اور نہ نظری مباحث و مسائل سے کوئی سروکار۔ البتہ اداریہ میں جن عزائم کا اظہار کیا گیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مزید شماروں کی اشاعت ہوتی تو اس کے معیار میں بہتری آتی۔ کیوں کہ اداریہ میں جہاں فلمی تجزیہ اور کتابوں پر تبصرہ کے تئیں جو اظہار خیال کیا گیا ہے، اگر اس کے مطابق رسالہ نکلتا تو اس کا معیار بہتر ہوتا۔ اداریہ سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شائع ہونے والے بیشتر ترقی پسند نظریات کے مبلغ رسالوں کے زمرہ میں یہ شامل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی سادگی سے ایڈیٹر نے اپنے نظریات کی وضاحت کر دی'' .... یہ سمجھنا بھی گمراہ کن ہوگا کہ افق کسی خاص نظریہ کا تبلیغی آرگن ہوگا''۔ ظاہر ہے اس زمانے میں ترقی پسند نظریات کے حامی بڑی شد و مد کے ساتھ رسائل و جرائد نکال رہے تھے اور نہ چاہ کر بھی شعرا و ادبا اس کے نظریات سے متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ ترقی پسندی سے محفوظ رکھنے کے اعلان کے باوجود بھی اس کے نظریات سے ''افق'' کو محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔ نظمیہ گوشہ میں اس کے نظریات کی گونج و دھمک شدت کے ساتھ موجود ہے:

نہ تاریکی سے گھبراؤ مرے ساتھی کہ ہم اک دن

ابھرتے نقرئی سورج کی بھی تنویر دیکھیں گے
سیاہی کی لکیریں کھینچ دو جتنی بھی تم چاہو
مٹا کر نقش سارے، ہم نئی تحریر دیکھیں گے
(صلاح الدین ظہیری)

لب لباب یہ کہ افق کے معیار و منہاج کے متعلق مذکورہ جملوں کے علاوہ زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ معیار طے کرنے کے لیے قابل ذکر مواد کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ کاش، اس کے مزید شمارے شائع ہوتے تو علم و ادب کے فروغ میں یہ معاون ہوتے یا پھر یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ دربھنگہ کے رسائل کی خشت اول میں پائیداری نہیں آئی، اس لیے آج بھی رسالوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، مگر اِدھر نکلنے، اُدھر ڈوبے، والا معاملہ ہے۔ آخر میں اس رسالہ میں شائع ہونے والے اشتہار سے ایک نمونہ، کیوں کہ اس کے متعدد اشتہار میں دلکشی نظر آئی:

''اونچی دکان، پھیکا پکوان
نہیں، نہیں!!
چھوٹی دوکان، بڑی شان
پارچون کی چیزیں اگر بازار میں نہ ملے تو آخر
کہاں جایئے؟
ایک بار یہاں بھی ضرور آیئے
تسلیم بٹن والا، نزد جامع مسجد، لہریا سرائے، دربھنگہ''

سہ ماہی رفتار نو-1960

سہ ماہی رفتارِ نو، دربھنگہ کی ادبی صحافت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ کم وقت کے لیے ہی سہی، اس رسالے نے جہاں ایک طرف بہار کی ادبی صحافت میں ایک مقام بنایا، وہیں اچھا لکھنے والوں کو اچھا فلیٹ فارم بھی دیا۔ 'رفتارِ نو' کے پیش نظر پانچ شماروں کے مد نظر یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس

رسالہ نے اپنی رفتار کو مزید تیز کرنے اور معیاری مواد کی فراہمی کے لیے حتی الامکان کوشش کی۔ پہلے شمارے سے لے کر آخری شمارے تک مدیران کی ادب نوازی اور اچھے ادب کی تلاش وجستجو قابل قدر نظر آتی ہے۔

رفتار نو کا پہلا شمارہ 1960 میں منظر عام پر آیا۔ اس کی اشاعت سے قبل مدیر منظر امام اور مجاز نوری نے ملک و بیرون ملک کے متعدد ادیبوں سے رابطہ کیا کہ وہ ہمیں قلمی تعاون دیں، لیکن ان کی طرف سے بھر پور تعاون نہ ملنے کی وجہ سے پہلا شمارہ بہتر طریقے سے منظر عام پر نہیں آسکا۔ اس کا اندازہ پہلے شمارہ میں شامل خطوط اور اداریہ سے بھی ہوتا ہے، کیوں کہ متعدد نامور ادیبوں اور قلمکاروں نے ایڈیٹر کی جانب سے موصول ہونے والے خط کا جواب معذرت نامے کے ساتھ دیا۔ کرشن چندر نے کچھ یوں لکھا:

’’آپ کا خط ملا۔ گذشتہ تقاضوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ آپ کی باری قبل نہیں آسکتی ہے۔ سال میں چھ سات افسانے بڑی مشکل سے لکھ سکتا ہوں ہوں۔ (اس پر بھی لوگ میری زود نویسی کا گلہ کرتے ہیں۔ ہے نا مزے کی بات)

آپ اپنا رسالہ مجھے ضرور بھجوایئے گا۔ مجھے آپ ایسے نوجوانوں سے توقع ہے، کیوں کہ اردو ادب کا مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مخلص

کرشن چندر، ممبئی

(سہ ماہی، رفتار نو دربھنگہ، جلد 1، شمارہ 1)

اس شمارے میں شامل خطوط سے یہ پتا چلا کہ مدیران نے پہلے شمارے کو بھی بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی، تاہم انھیں مطلوبہ مواد ہاتھ نہیں آسکا۔ یہی وجہ ہے کہ ش۔ مظفر پوری نے اس شمارے کے تئیں ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے بعد بھی تبصرہ لکھنے کا وعدہ کیا۔ رسالے کے غیر معیاری ہونے کے سبب اگر وہ تبصرہ نہ لکھتے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا، تاہم انھوں نے مدیروں سے دلجوئی کرتے ہوئے ایک ناصحانہ پیغام دیا۔ آج المیہ یہ ہے کہ اچھی چیزوں کو بھی غیر معیاری کہہ کر

نظر انداز کیے جانے کا سلسلہ / سیاست عروج پر ہے، ایسے میں کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اہل علم افراد بھی کچھ کر گزرنے والوں کے حوصلہ کا احترام کریں گے۔ ان خطوط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس وقت غیر مطبوعہ مواد سے ہی معاونت کا عام رجحان تھا، یہی وجہ تھی کہ مدیر کے خطوط میں ادیبوں نے معذرت نامہ بھیجنا پسند، نہ کہ مطبوعہ تحریریں، تیز رفتار دنیا میں جینے والے ادیبوں کے لیے اس میں بھی ایک سبق ہے۔

80 صفحات پر مشتمل پہلے شمارہ میں علامہ اقبال پر جاوید اقبال کا فقط ایک ہی مضمون ہے، جو ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں نہ صرف طباعت واشاعت کا مرحلہ دشوار گزار تھا، بلکہ مواد کی فراہمی بھی ایک مسئلہ تھا۔ ایک مضمون کے علاوہ 7 غزلیں، 3 نظمیں، تین افسانے اور گیارہ خطوط مشمولات میں ہیں۔ رنگین ٹائٹل پیج کے دوسرے صفحے پر پوپولر ٹیلرنگ لال باغ اور عالم شوا سٹورس کٹکی بازار دربھنگہ کے دلکش اشتہارات موجود ہیں۔ دوسرے شمارے میں بھی کرامت علی کرامت پر علامہ جمیل مظہری کا ایک ہی مضمون ہے۔ جگر مرادآبادی سمیت چار غزلیں، بشمول مظہر امام تین نظمیں، معروف افسانہ نگار زکی انور سمیت تین افسانے اور سہیل عظیم آبادی، کلام حیدری اور ش۔ مظفر پوری سمیت دس خطوط شامل ہیں۔ ساتھ ہی شرکائے رسالہ کا مختصر تعارف نامہ بھی ہے اور یہ شمارہ 96 صفحات پر مشتمل ہے۔

تیسرے شمارے میں اختر اورینوی اور علی اکبر نقوی کے مضامین، 7 غزلیں، 5 نظمیں، 4 افسانے، ایک خاکہ، ساگر سرحدی کے ڈرامہ کا باب، مظہر امام کے تبصرے اور خطوط شامل ہیں۔ چوتھے شمارے میں اختر اورینوی کے مضمون ’’فن میں اسلوب کا مسئلہ‘‘ کی دوسری قسط اور عبدالمغنی کا مضمون ’’عالم تنہائی‘‘ شامل ہیں۔ 6 غزلیں، خلیل الرحمٰن اعظمی سمیت 7 نظمیں، ل۔ اکبر آبادی سمیت تین کہانیاں، راجندر سنگھ بیدی کا ڈرامہ ’خواجہ سرا‘ کے چار مناظر، مظہر امام کے تبصرے اور نو خطوط شائع کیے گئے ہیں۔ دو قسطوں میں شائع ہونے والا اختر اورینوی کا یہ مضمون توجہ طلب ہے، جس میں انھوں نے فن اور اسلوب کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔

پانچواں شمارہ جو دوسرے سال کا پہلا شمارہ ہے میں غالب کی شاعری پر نثار احمد فاروقی، پنج تنتر

پر ڈاکٹر بابو دیوشرن اگروال، جگر کی شاعری پر عبدالمغنی، غلط العام اور غلط العوم کا فرق پر د ہر ناصری، بیسویں صدی بیالیسویں صدی کے نقطۂ نظر سے، پر نظیر صدیقی، منظر شہاب پر مظفر اقبال کے مضامین، فرق گورکھپوری اور شکیل بدایونی سمیت 9 غزلیں، شہریار اور پرویز شاہدی سمیت 13 نظمیں، سہیل عظیم آبادی، ش مظفر پوری، آمنہ ابوالحسن اور ہربنس دوست کے افسانے شامل ہیں اور چند کتابوں پر مظہر امام کے تبصرے بھی ہیں۔

رفتار نو آب و تاب کے ساتھ نکلا تھا لیکن یہ بھی دربھنگہ سے نکلنے والے دیگر رسالوں کی طرح چند شماروں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ منظر امام ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''صحافت سے میری دلچسپی اسکول کے زمانے سے ہے۔ سہ ماہی رفتار نو کا اجراء (1960) میں نے انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں کیا، اس کے بعد بی اے آنرز کرنے پٹنہ کالج آ گیا۔ اقبال ہوسٹل میں رہ کر میں نے رفتار نو کے پانچ شمارے نکالے، جنھیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو کی آزاد غزل اس رسالے کی زینت بنی۔''
>
> (تمثیل نو دربھنگہ، جلد 15، شمارہ 27)

منظر امام نے گرچہ رسالہ کا اجرا دربھنگہ سے کیا تھا، تاہم تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں پٹنہ میں قیام کرنا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے شمارے کے علاوہ بقیہ شماروں میں نوٹ کے ساتھ ایڈیٹر سے خط و کتابت کا پتا پٹنہ ہی درج ہوتا تھا۔

پانچوں شمارے میں تدریجی سطح پر عمدگی نظر آتی ہے۔ جس سے مدیران کے جہد مسلسل اور رسالے کے تئیں سنجیدگی کا پتا چلتا ہے۔ اعداد و شمار کے آئینہ میں بونے نظر آنے والے مضامین اپنی جگہ وقیع اور معلومات افزا ہیں۔ ان میں مکالمہ اور تلازمہ کی رمق نظر آتی ہے۔ چار شماروں میں اداریے 'ذکر جاناں' کے نام سے لکھے گیے۔ اکلوتا شمارہ نمبر چار اداریہ سے محروم ہے۔ خطوط کا گوشہ ''رفیقوں نے کہا'' کے نام سے موسوم ہے۔ اداریہ عموماً ایک صفحہ پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے چند سطری اداریہ میں کسی موضوع پر مدلل و مفصل گفتگو ہو سکتی ہے اور نہ ہی رسالے کے مشمولات کا عمومی

تعارف۔ اداریوں میں عموماً معاونت کی ہی درخواست کی گئی۔ اس لیے اداریہ اور پورے رسالے میں کہیں بھی ایڈیٹر کی نگارشات کا رنگ صاف نہیں نظر آتا ہے، البتہ جب وہ رسالے کے شرکاء قلمکاروں کے تعارف پر مشتمل 'ہمسفر' نامی کالم لکھتے ہیں تو ان کے قلم کی سلاست ابھر کر سامنے آتی ہے اور چند لفظوں میں ان کا قلم ان کے انداز بیاں کا پتا دے جاتا ہے۔ رفتار نو میں شامل مظہر امام کے تبصرے خوب ہیں۔ انھوں نے بے لاگ تبصرہ کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی تجزیاتی صلاحیتوں کا بھی مظاہرہ کیا ہے، جس سے ان کی تنقیدی بصیرتوں اور تفہیمی نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں تک خطوط کا تعلق ہے تو ان میں نہ صرف ایڈیٹر کی منہ بھرائی نظر آتی ہے، بلکہ رسالے کے حسن و قبح پر اشاروں کے ساتھ ہمت افزائی کے رنگ بھی خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ان اشاروں کی بنیاد پر مدیر اپنی مدیرانہ صلاحیتوں کو مہمیز کرتے ہیں اور قارئین اور ادب کے مخلصین کا پورا نظریہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اپنے محدود سفر میں رفتار نو نے دربھنگہ اور بہار کی اردو ادبی صحافت کو سمت و رفتار دینے میں کسی نہ کسی حد تک اپنا کردار ادا کیا ہے۔ (رفتار نو، دورِ دوم پر کبھی اور گفتگو ہوگی۔)

توازن - 1973

فی الواقع ''توازن'' نے اپنے ٹیگ لائن ''ادب کی متوازن قدروں کا نمائندہ'' کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے نظریات کے کھنڈروں اور ملبوں سے نکال کر کارآمد ادب پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ تواتر کے ساتھ متوازن ادب پیش کرنا اس کی قسمت میں نہیں تھا، تاہم بھرپور ایک ہی شمارہ کی بنیاد پر دربھنگہ سے شائع ہونے والے دیگر رسائل و جرائد کو اس نے مات دی۔

قمر اعظم ہاشمی کی نگرانی اور (مرتب) نجیب اختر کی ادارت میں توازن کا اکلوتا شمارہ 1973 میں منظر عام پر آیا، جس پر سرپرست کی حیثیت سے الحاج امیر حسن، مینجنگ ڈائرکٹر ساسا موسی شوگر فیکٹری (سارن) اور مجلس مشاورت میں مرتضی رضوی، شمیم سیفی، لطف الرحمٰن اور شبیر احمد کا نام درج ہے۔ قیمت فی شمارہ آٹھ سو پیسے مرقوم ہے اور خط و کتابت کے لیے صدر دفتر توازن بی کے روڈ لہریا سرائے دربھنگہ کے علاوہ پٹنہ اور مظفر پور آفس کا بھی پتہ درج ہے۔

'صبح زندگی' اور 'رفتار نو' وغیرہ کے اداریہ سے جو ذہنی کوفت ہوئی، اس کا تدارک توازن کے

اداریے سے ہوجاتا ہے۔ فقط دو صفحات پر مشتمل 'توازن کی راہ' نامی اداریہ میں ایک طرف جہاں ادبی مسائل و مباحث کے تئیں دلچسپی نظر آتی ہے وہیں عمدہ اور متوازن ادب پیش کرنے کا اعتماد بھی جھلکتا ہے۔ اداریہ لکھنے والے نجیب اختر لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ نقطہ نظر کے اختلاف، اصولوں اور نظریوں کے تصادمات اور فکر و خیال کے قضاوات، زندہ اور ترقی پذیر ادب و فن کے لیے ضروری ہیں۔ جہاں اس طرح کے خیالات نہ ہوں گے، وہاں ایک نظریہ کی حکمرانی ہوگی۔ ایک مکتبہ فکر کی بالادستی ہوگی۔ ایک اصول کا تسلط ہوگا اور اصول و نظریہ کا آمرانہ مزاج جمود و تعطل سے زیادہ قریب ہوگا''۔

(توازن، دربھنگہ 1973، ماخوذ اداریہ، ص7)

دس ابواب میں منقسم مشمولات بھرپور ہیں، جس سے نگراں اور مرتب کی تنظیمی صلاحیتوں اور ادب نوازیوں کا احساس ہوتا ہے۔ پہلے باب ''مسائل اور مطالعے'' کے ضمن میں محمد حسن، سید محمد حسنین عبدالمغنی، ابن فرید، شعیب راہی، نجم الہدیٰ، احمر لاری، عبدالواسع، احمد سجاد، طلحہ رضوی برق، خواجہ امن اور حاتم ماہر رامپوری کے معلومات افزا مضامین شامل اشاعت ہیں۔ (پروفیسر) محمد حسن نے ادب میں نظریاتی مباحث کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظریہ سازی کے بغیر کوئی ادبی شاہکار پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ عبدالمغنی نے فکر و فن کی سالمیت اور ابن فرید نے فکر و فن میں نزاع کے مسئلہ پر ادب میں نظریہ سازی کے پس منظر میں متوازن نظریہ پیش کیا ہے۔ ان تینوں مضمون میں نظریاتی سطح پر ایک لطیف رشتہ موجود ہے۔ عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''فکر و فن کے باہمی رشتے پر بہت غور و فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فکر کا تعلق اصلاً ادیب سے ہے اور فن کا تعلق حقیقتاً اس کے قاری سے''۔

(توازن، ص20)

نظریۂ ادبی سماجیات کی بنیاد پر عبدالمغنی کے اس نتیجہ سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ فکری تنوع اور تخیلاتی عمل میں محض ادیب ایک اکائی نہیں رہتا، بلکہ سماجی سروکار اور قارئین کا ذہنی مذاق بھی کسی

نہ کسی سطح پر فکری رویوں کو متاثر کرتا ہے، اس لیے یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ فکری تشکیلات میں قاری اور سماج کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ فن، ہیئت و مواد کی یکجائی کا نام ہے اور ان میں تغیر و تبدل فقط ادیب کے رجحان کے مدنظر نہیں ہوتا ہے۔ عموماً مواد و موضوعات کا انتخاب قارئین کے ذہنی مذاق کو نظر میں رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے، تاہم ہیئت کی تبدیلی میں قاری پیش نظر نہیں ہوتا۔ مثلاً: نثری نظم، میرا خیال ہے کہ نثری نظم کے برعکس دیگر نظموں میں قارئین کی لذت یابی کا سامان زیادہ ہے، کیوں کہ غنائیت اور سجع کی کیفیت سے جو ذہنی تسکین پابند نظم میں ہے، وہ نثری نظموں میں نہیں ہے۔ ہیئت کی تبدیلی فن کا لازمہ ہے، نہ کہ فکر کا۔ اس لیے سیدھے لفظوں میں یہ کہہ دینا کہ فن کا تعلق حقیقتاً قاری سے ہی ہوتا ہے، مناسب نہیں۔

بہرکیف! دوسرے باب میں 'نقطہ نظر' کے تحت ''میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ'' کے عنوان سے اختر قادری کا مضمون ہے اور ''ثنا خوانی انسان کی''، خلیل جبران کے کسی ادب پارے کا اردو ترجمہ صلاح الدین برق نے کیا ہے۔ تیسرے باب میں منظر کاظمی کے ڈرامے ''جب رات کا جادو ٹوٹا'' کا حصہ شائع ہوا ہے۔ 'غزلیں' کے ضمن میں جاں نثار اختر، اجتبیٰ رضوی (کی فارسی غزل)، رضا کریم رضا، غلام ربانی تاباں، شاکر خلیق، نعیم کوثر، وفا ملک پوری سمیت 27 غزلیں شامل اشاعت ہیں۔ جب کہ 'غزل کا نیا لب و لہجہ' کے تحت مزید 28 غزلیں ہیں، جن میں مظہر امام، مظفر حنفی، لطف الرحمٰن، سلطان اختر، علیم اللہ حالی، ظہیر غازی پوری، شمیم فاروقی وغیرہ کی شمولیت ہوئی ہے۔

چھٹے باب میں 8 افسانے اور گوشۂ 'اکائیاں' میں بشیر بدر کی ایک اکائی ''گیارہ تجربوں کا شعری زبان'' ہے۔ باب نظم میں محمد محسن، ندا فاضلی، شفیع مشہدی، ظہیر صدیقی، صلاح الدین پرویز، ساجدہ زیدی وغیرہ کی 27 نظمیں ہیں۔ تبصرہ کے ضمن میں 7 مختلف کتابوں پر ظاہر حسین شمشاد اور قمر اعظم ہاشمی کے تبصرے موجود ہیں۔ آخری باب ''نامے پیانے'' میں لطف الرحمٰن، سہیل عظیم آبادی، مظفر اقبال، قاضی عبدالستار، حامدی کاشمیری اور جاں نثار اختر کے 22 خطوط شام ہیں۔ پہلے شمارے میں خطوط کی اشاعت کا مطلب یہ ہے کہ رسالہ کی اشاعت سے قبل ادیبوں سے رابطہ ضرور کیا گیا ہوگا، یا مسودہ اہل علم کے پاس بھیجا گیا ہو، یا پھر ارباب قلم سے قلمی تعاون کی درخواست کی گئی ہو۔ قاضی

عبدالستار لکھتے ہیں:

''خدا کرے آپ ''توازن'' پیدا کر سکیں اور اسے زندہ رکھ سکیں۔ فی الحال
میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن جیسے ہی کچھ لکھ سکا انشاءاللہ ضرور بھیجوں گا۔''

(ص224، خط 18)

انتخاب موضوعات سے لے کر اشاعت تک اس رسالے میں تنظیمی امور کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ چونکہ جمع مواد سے قبل ہی 25 سے زائد عناوین کا انتخاب کر کے لکھنے والوں سے رجوع کیا گیا تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ ایسا رسالہ ہر اعتبار سے متوازن ہی ہوگا۔ 232 صفحات پر مشتمل توازن کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام گوشوں کو بھرپور بنانے کی شعوری کوشش میں رسالے سے جڑے افراد کو خاطر خواہ کامیابی ملی۔ رسالہ پر رجسٹریشن نمبر درج نہیں ہے اور نہ ہی ادارہ یہ کے کسی جملے سے مسائل و وسائل کے تئیں کوئی شکوہ اور رونے دھونے کا شائبہ ہے، اس کے باوجود بھی اس رسالہ کا فقط ایک ہی شمارہ شائع ہونا ادب نوازوں کے لیے حق میں مفید نہیں ہے۔ یہ رسالہ حلقہ توازن دربھنگہ کے تحت شائع ہوا تھا۔ اس پر ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی وغیرہ کچھ بھی درج نہیں ہے، جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ حلقہ کے احباب مسلسل رسالہ نہ نکال کر فقط گاہ بہ گاہ کتابی سلسلہ نکالنے کے خواہشمند ہوں گے، اس لیے ایک ہی شمارہ شائع کر کے خاموش ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ دربھنگہ سے شائع ہونے والے قابل ذکر رسالوں کو توازن نے اپنے ایک ہی شمارہ سے مات دے دی۔ رفتار نو ہو کہ صبح زندگی، توازن کے سامنے بہت ہلکے لگتے ہیں۔ ادارتی صفحہ سے لے کر آخر تک توازن ان رسالوں سے بہتر نظر آتا ہے۔ جو مدیرانہ صلاحتیں اس رسالہ میں جھلکتی ہیں، ان سے دربھنگہ سے نکلنے والے بہت سے رسالے محروم ہیں۔ توازن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت کا فیصلہ نہ جذباتی تھا اور نہ ہی کسی رسالے کو زیر کرنا اس کا مطمح نظر تھا۔ اس لیے ایسے صاف شبیہ اور اعلیٰ ادب کے علمبردار رسالے کا فقط ایک شمارہ منظر عام پر آنا افسوس کی بات ہے۔ باذوق افراد کی ہمت افزائی اور ادبی و مالی تعاون دیتے ہوئے توازن کا سلسلہ اگر دراز کیا جاتا تو فروغ ادب کے تئیں مفید ہوتا۔ اس جیسے رسالہ کا نہ صرف اُس زمانے میں تسلسل کے ساتھ شائع ہونا بہتر تھا، بلکہ آج بھی ایسے رسالوں

کی ضرورت ہے، جو خاطر خواہ مواد جمع کر کے ادب نوازوں کے لیے رہنمابت ہو سکے۔

متھلانچل کے چند اخبارات و رسائل کے تذکرے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس علاقے کا صحافت کے میدان میں اہم کردار رہا ہے۔ پٹنہ اور گیا سے جس طرح بہار کی قدیم اردو صحافت کی روایت وابستہ ہے، بالکل اسی طرح متھلانچل یا دربھنگہ سے سنہری صحافت کی تاریخ جڑی ہے۔ اس مقالے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیسویں صدی کے ابتدائی ایام سے ہی دربھنگہ سے رسائل جاری ہونے لگے اور متھلانچل سے نکلنے والے پرچوں کی تعداد پچاس سے بھی زائد ہے۔ ان پر سرسری نظر ڈالنے سے حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ بیشتر، چند شماروں کے بعد ہی بند ہو گیے اور جو مسلسل نکلتے بھی رہے، ان کے متعلق صحیح معلومات دستیاب نہیں۔ بہار کی نثر کے متعلق کوئی کتاب یا پھر بہار میں صحافت سے جڑا کوئی تحقیقی کام ہو، میں مشکل سے یہاں کے دو تین رسائل کا ذکر مل پاتا ہے۔ ایسے میں کہنا پڑتا ہے اس علمی سرزمین پر علم کی قدردانی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ علمی مظاہرے اور قومی وملی حمیت کے جذبے سے سرشاری کے بعد رسالے تو نکلے ضرور، تاہم قدرداں نہ ملے۔ چنانچہ ان کی سانسوں کی ڈور جلد جلد ٹوٹتی چلی گئی اور سب قصہ پارینہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں خدمات فراموشی اور تساہلی کا یہ عالم کہ اس فرد کے متعلق بھی کچھ دستیاب نہیں، جس نے مولانا آزاد کی صحافت کو سہارا دیا۔ اس خطہ کا یہ بھی المیہ ہے کہ کسی ایک نے تحقیق کے بعد کسی گوشے میں کوئی چراغ روشن کر دیا۔ بس اسی چراغ سے نہ صرف چراغ جلانے کی کوشش کی جاتی ہے، بلکہ اصل چراغ سے تیل نکال کر اپنے نام کا چراغ جلا دینا ہی عقلمندی کی بات سمجھ لی گئی۔ بقول شاعر ؎

برسوں چلے، چلتے رہے، سفر در سفر
منزل ملی نہیں، نشانِ منزل کے سبب

ظاہر ہے قدیم رسائل تک رسائی کے لیے انتہائی تگ و دو ضروری ہے، تب جا کر چند شماروں کا دیکھ پانا ممکن ہوگا۔ راقم کی کوشش رہی کہ یہاں سے شائع ہونے والے اگر تمام رسائل مل جائیں تو ان کے معیار و منہاج سے آگاہی ہو جائے گی اور یہاں کا صحیح صحافتی منظر نامہ بھی سامنے آجائے گا۔ لیکن تلاش و بسیار کے باوجود بھی بہت سے رسائل و جرائد کا کچھ پتا نہیں چل پا رہا ہے۔ دربھنگہ کے

اہل علم کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ مورخین نے ان کی خدمات کو نظر انداز کیا۔ انھیں علمی وادبی مین اسٹریم سے جوڑنے کے لیے انصاف پسند کوششیں نہیں کی گئی۔ چنانچہ یہاں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ مورخین بھی انسانی سماج سے جڑے ہوتے ہیں۔ انھیں بھی تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اہالیان دربھنگہ مورخین کی مدد نہ کریں تو وہ کیسے تحقیق کی گاڑی آگے بڑھا سکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اہالیان دربھنگہ نے بھی محققین کی مدد میں ضرور تساہلی دکھائی ہوگی، اس لیے انھیں مین اسٹریم سے جوڑا نہیں جاسکا ہے۔ اس ضمن میں راقم اپنی سرگزشت بیان کرے تو بڑی خونچکاں داستان بن کر سامنے آئے گی۔ رسائل وجرائد کی تلاش کے لیے ملک بھر کے متعدد اہل علم سے رابطہ کیا گیا، چند نے حتی المقدور رہنمائی اور مدد کی۔ ساتھ ہی انھوں نے مواد کی فراہمی کے لیے دربھنگہ کے ’متعدد اہل علم‘ سے تبادلہ خیال کا مشورہ دیا، جب یہاں کے صاحب نظر وبصر سے گفت وشنید ہوئی اور مواد کی فراہمی کا مسئلہ رکھا گیا تو بیشتر نے قلت وقت کا رونا رویا۔ مواد کی عدم دستیابی کا شکوہ کیا۔ یہاں تک کہ متعدد کا لہجہ انتہائی ترش بھی تھا۔ اسی سفر میں کتابوں کو مقید بنانے والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ظاہر ہے جب کتمان علم کا بازار اس قدر گرم ہو تو محققین کر بھی کیا سکتے ہیں۔
شاید اسی ذہنیت نے تاریخی حوالوں سے یہاں کے اہل علم کو ادب کے مین اسٹریم سے جڑنے نہیں دیا۔ گویا اپنی کرتوت کی وجہ سے ہی انھیں اپنی خدمات کا صلہ نہیں مل پا رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ علم وادب کے راہی کے لیے اہالیان دربھنگہ پلکیں بچھا کر رکھیں، تاکہ انھیں تاریخ کے کسی بھی موڑ پر محققین سے شکوہ کا موقع نہ ملے۔

ڈاکٹر آصف
شعبہ اردو، گوتم بدھ یونیورسٹی، گریٹر نوئیڈا

جدید ادب کے روشن مستقبل کا استعارہ: دربھنگہ ٹائمز

زمانہ قدیم سے ہی بہار کی دھرتی علوم وفنون کے موتی بکھیرتی رہی ہے۔ اور ایک عالم اس مٹی کے دانشوری اور نابغۂ کا ممنون احسان رہا ہے۔ نالندہ اور وکرم شلا جیسی جامعات سے فارغ التحصیل طلباء نے دنیا کو فلسفہ، مذہبیات اور فنون لطیفہ کا درس دیا، جب کہ اس وقت مہذب دنیا جامعات کے نام سے نابلد تھی ایسے عہد میں نالندہ یونیورسٹی میں دس ہزار طلبہ واساتذہ اقامت پذیر تھے اور درس وتدریس کی قندیل کو روشن کئے ہوئے تھے۔ جن میں میگاس تھنیز، چانکیہ، فاہیان، ہیون سانگ قابل ذکر ہیں۔ جن کے افکار ونظریات کحل جواہر کے مثل چشم بینا کے لئے دیدہ بینا بنے، تو دوسری طرف مہاتما بدھ اور جین نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے اس خطہ ارض کو مرکزی حیثیت عطا کی۔ ارتھ ساشتر کا مؤلف چانکیہ اپنی سیاسی، سماجی اور اقتصادی بصیرت کے معاملے میں دنیا کے لئے بشارت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کی خارجہ پالیسی پر سیاسی مبصرین اور اسکالرس آج بھی رشک کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہیں۔ بہار کا شمالی خطہ متھلانچل جس کا قدیم مذہبی گرنتھوں میں ذکر آیا ہے۔ مخزن علم وادب کا قدیم گہوارہ رہا ہے۔ اسی دھرتی کی کوکھ سے جنک دلاری سیتا کا جنم ہوا، ان کے جنم سے ہی بھارت ورش میں ادب وفنون لطیفہ کا ابتدائی سوتے پھوٹے، جسے بعد میں بالمیکی نے رامائن کے روپ میں رزمیہ بیانہ کی شکل دی۔ جس سے آگے چل کر ایک یوٹو پیائی رام راجیہ کا حقیقی تصور ابھر کر دنیا کے سامنے آیا، جس کی جوت سے عالم انسانیت ظلم وجور اور استحصال سے ماوراء فرحاں وشاداں زندگی گذار سکے۔ رامائن کے اشلوکوں کے متن سے آج بھی امن واشتی صدا گونجتی ہے۔ جس سے عقیدت مند رشد وہدایت کا سبق لیتے ہیں۔ دربھنگہ بھی متھلانچل کے میدانی علاقے کی ذرخیز وپرنم مٹی ہے جس کی آب وہوا میں زبان وادب کی کونپلیں پھوٹیں، موسیقی ومصوری کے ساتھ ساتھ شاعری میں ودیاپتی جیسا عالم گیر شہرت یافتہ مغنی شاعر اپنے تخلیقی وجدان اور تخئیل کی

اڑان سے دنیا کو مسحور کیا۔ اردو ادب بھی ان محبت بھرے نغموں اور تخیلات سے اچھوتا نہیں رہا۔ منشی بہاری لال فطرت، منشی ایودھیا پرشاد بہار اور سعادت علی خاں پیغمبر پوری جن کا "دیوان سعادت" ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔(۱) دربھنگہ کی مردم خیز مٹی نے کئی ادبی مشاہیر کو جنم دیا۔ جن میں محسن دربھنگوی، مظہر امام، منظر امام، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، منظر کاظمی، ڈاکٹر جاوید رحمانی افسانہ نگاری میں ثوبان فاروقی، عشرت صدیقی، مجیر احمد آزاد، قیام نیر، سہیل جامعی اور فیاض احمد وجیہہ قابل ذکر ہیں۔ دربھنگہ کی ادبی و تخلیقی لیجنڈ کا ذکر کرتے ہوئے حقانی القاسمی رقم طراز ہیں۔" کتنا زرخیز ہے یہ علاقہ، اتنی تخلیقی زرخیزی تو بہت کم زمینوں کا مقدر ہوتی ہے۔ یہاں تخلیق، تنقید کے اتنے مہر تاباں اور ماہ منور ہیں کہ رشک آتا ہے کہ خالق مطلق کے سارے انصاف وعنایات شاید اسی سرزمین پر ہوئے۔"(۲)

دربھنگہ کی ادبی صحافت کو موضوع بحث لانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مشاہیر نثر نگاروں پر ایک نظر ڈالی جائے۔ کہ دربھنگہ کا اولین مطبوعہ نثر پارہ کون ہے، ڈاکٹر منصور خوشتر کی تحقیقی کتاب نثر نگاران دربھنگہ اس کا معتبر اور مستند حوالہ ہے۔ جس میں انھوں نے دربھنگہ کے نثار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں۔" اجودھیا پرشاد کی 'ریاض تزہت' دربھنگہ کی سب سے پہلی باضابطہ مطبوعہ نثر ہے۔ اس کے بعد بہاری لال فطرت کے 'آئینہ تزہت' کو اولین نثر کا درجہ ملا۔ فتاویٰ علم گیری کے مدونوں میں ملا ابوالحسن، عہد عالم گیری کے شیخ احمد بن شیخ ابوسعید معروف بہ ملا جیون کی تفسیر احمدی اور نورالانوار، مولانا ہدایت اللہ کی تصنیف 'شرح مسلم' اور 'حاشیہ رسالہ میر زاہد، منیر الدین حسین برق کی 'منیر الفرائض' 'منیر الفتاوی' اور 'فوائد رضویہ' مولوی عبد الاحد کی 'المعراج' حافظ ظہور احمد کی 'التصحیہ' فرمان علی طیب کی' تفسیر قرآن پاک" 'دینیات' 'کتاب الصرف' 'کتاب النحو' اور 'الولی' مولانا عبدالعزیز محدث رحیم آبادی کی 'سواء الطریق' اور 'حسن البیان' شاہ سمرقندی کی 'صبغۃ الواصلین' مصباح العارفین' بحرالتوحید' اور 'تبصرۃ الاعمیٰ فی التفرقۃ بین الضاد والظاء' مولانا بہرام شاہ آہ کے حاشیہ 'حمد اللہ' عبدالرحمٰن وصال کی 'سیرت رسول' مرشد حسن کامل کی 'مخزن التفہیم' اصول کامل' اور 'رحمت کامل' وغیرہ کا سلسلہ متھلانچل کی سرزمین سے جا

ملتا ہے۔"(۳) ان تصنیفات کی روشنی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دربھنگہ کی خاک پاک میں کتنے گنج ہائے گراں مایہ دفن ہیں جن کی علمی بصیرت اور رشد و ہدایت کی مشعل سے نہ جانے کتنے بند دل نور حق سے جگمگا اٹھے۔

دربھنگہ کی علمی، تہذیبی اور نثری روایت کے احیاء کے اجمالی جائزے کے بعد وہاں کی ادبی صحافت ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ دربھنگہ سے شائع ہونے والا اولین ادبی جریدہ "مسیحا" حکیم ابوالحسنات ناصر دہلوی کی ادارت میں ۱۹۰۲ء منظر عام پر آیا۔(۴) اس کے بعد بہت سے ادبی رسائل و جرائد شائع ہوئے جن کے فہرست شماری کسی اور موقع پر کی جائی گی۔ یہاں تو بس دربھنگہ سے شائع ہونے والے مؤقر اردو زبان و ادب کے رسالوں کا خاکہ پیش کرنا مقصود ہے تاکہ وہاں کی موجودہ ادبی صورت حال کا اندازہ کیا جا سکے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی ادبی رسالہ "جہان اردو" پچھلے پندرہ سالوں سے ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس رسالے کی ادبی حیثیت اس وجہ سے مسلم ہے کہ اس نے مشاہیر ادب کے تنقیدی و تخلیقی نقوش کو اجاگر کرنے کے لئے خصوصی شمارے نکالے۔ جن میں پریم چند، علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور پروفیسر وہاب اشرفی نمبر اپنی علمی ضخامت اور معیار کی وجہ سے مطالعہ کی چیز ہے۔ اسی طرح بہار کی مٹی سے نمو پانے والے ادبی فن کاروں کی تخلیقی صلاحیت پرکھ کر انھیں سہی سمت میں گامزن کرنا اس رسالے کے مقصد کو واضح کرتا ہے۔ رسالے کی پیشانی پر لکھی سرخی اس کی معتبریت کا اعلان کرتی ہے۔" اردو کے گم شدہ قاری کا متلاشی اور تعمیری ادب کا ترجمان"(۵) عصر حاضر کے ادبی رویے اور رجحان کے پارکھی ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہ نامہ رسالہ " تمثیل نو" کی مقبولیت و شہرت روز افزوں ادبی حلقوں میں بڑھتی جارہی ہے اس کی خاص وجہ اس کا یک موضوعاتی ہونا ہے۔ جو اردو ادب کے ہم عصر مسائل سے اپنے قاری کو روبرو کراتا ہے۔ اس رسالے کے چند یک موضوعاتی شمارے یہ ہیں۔ اردو ادب کے رجحان ساز: فاروقی، نارنگ اور مظہر امام، کیا ترقی پسندی زوال پذیر ہے، سات سمندر پار کا ہم عصر ادب، ہندستانی فلمیں اور اردو، اردو کا ہم عصر ادب ۱۹۸۵ء کے بعد، ان موضوعات کو دیکھنے کے بعد مدیر کے سوچ سمندر کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا

ہے۔جس کی پیشانی پر یہ سلوگن لکھا ہوا ہے "جدید تر شعری وادبی رجحانات کا ترجمان" (۲)

ہندستان کے ادبی افق پر معیاری اور معتبر ادب کی ترویج و اشاعت کا امین اور "ادب کی صحت مند روایات اور جدید رجحانات کا ترجمان" سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز روز اول سے ہی عاشقان ادب کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مواد کی ترتیب و تنظیم میں فاضل مدیر نے رسالے کے میعار سے سمجھوتہ نہیں کیا،اس مجلّے میں مستند لکھاریوں کے

ساتھ نوآموز تخلیق کاروں اور متن کی سہی پرکھ رکھنے والے ادبی دیوانوں کو ان صحیح مقام ملا جو اردو کے ادبی گلوب پر تازہ مدینے کی جستجو میں پانجو لاں نکل پڑے تھے۔دربھنگہ ٹائمز کے مدیر باتدبیر ڈاکٹر منصور خوشتر نوزائدہ قلم کے سپاہیوں کو ادبی سمت عطا کی جن کی تخلیقی بصیرت اور تنقیدی ذہانت نے ادبی افق پر اپنا نام و مقام پیدا کیا۔سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز نے عالمی قارئین کے حلقے میں یہ شناخت قلیل مدت میں قائم کر لی ہے کہ یہ ادبی مجلّہ ہم عصر ادبی رجحان کا نبض شناسی کرتا ہے۔جو معنیاتی اور موضوعاتی اعتبار سے اپنے اندر تفہیم و تعبیر کے کئی ابعاد لئے ہوئے ہے۔عہد حاضر کے ادبی میلانات اور رجحانات کے گمبھیر مسائل کو اجاگر کرنا اور تخلیقی و تنقیدی مذاکرے اور مباحثے کی نت نئے وسیلے اختیار کرنا، سخت جانی اور جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔موجودہ ادبی منظر نامے میں تخلیق و تنقید کی پرکھ اور انتخاب و ترتیب تلوار کی دھار پر چلنے جیسا ہے۔اس مشکل عمل کے کرب سے ڈاکٹر منصور بارہا گزرے ہیں۔اس غم واندوہ احساس کو اپنے قاری سے بھی شئیر کیا ہے۔

زبانیں اظہار وابلاغ کی ترسیل کے ساتھ تہذیبی شعور و آگہی کے سروکار کا بڑا میڈیم رہیں ہیں۔اس عالمی منڈی میں وہیں زبان سروایو کر سکتی ہیں جو معیشت کی اصطلاحات کو وضع کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو۔اردو زبان کے مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کلاسیکی روایت اور ثقافتی ورثے پر قائم رہتے ہوئے عالمی مزاج میں رچ بس گئی اور ہر طرح کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر کشادہ قلبی کا ثبوت دیا۔کبھی تنگ دامنی کا شکوہ زبان تک آنے نہیں دیا۔ہمارا ملک ہندستان ایک کثیر لسانی ملک ہے جہاں ایک زبان اپنی مدمقابل زبان سے خطرہ محسوس کرتی ہے۔جس کی وجہ سے یہاں لسانی فرقہ واریت اور لسانی سامراجیت کا خطرہ بنا رہتا ہے۔لیکن اردو

زبان وادب نے اپنے خوبصورت اور معطر لب و لہجے سے قند دہن اور زہر ہلاہل میں ڈوبے ہوئے لفظوں کے تیر کو اپنی مٹھاس سے شیریں دہن میں تبدیل کر دیا ہے۔لیکن اردو کا مسئلہ اس سے علیحدہ ہے کیونکہ اپنے کو اہل زبان کہنے والے ہی اس کی قواعد،صرف ونحو اور رسم الخط پر سوالیہ نشان کھڑا کرتے ہوئے اس کو تبدیل کرنے کی مانگ کرتے رہے ہیں۔وہ اس بات سے نابلد ہیں کہ اردو کہ اصل روح اس کی رسم الخط ہے اگر اس کو رومن اور دیوناگری میں تبدیل کیا گیا تو محض جسم رہ جائے گا ۔ڈاکٹر منصور خوشتر اپنے اداریہ میں اکیڈمک پرسن سے کلام کرتے ہوئے موجودہ اردو ادب کی ناگفتہ بہ حالت کا بیان کیا ہے۔اور یہ سوال کھڑا کیا ہے کہ کیا ایک اسکالر کو اپنے ثقافتی سرمائے اور لسانی شعور پر صرف اور صرف تحقیقی مقالہ لکھنا چاہیے؟ اور اس کے کھرے اور کھوٹے پر فیصلہ صادر کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔اب صورت حال بدل چکی ہے ہمارے اسکالر کو اپنے نام نہاد دانشورانہ دبدھے سے باہر آنا ہوگا اور مصلحت کے گرد کھینچے حصار کو توڑنا کر اپنے ثقافتی اور لسانی ورثے کو محفوظ کرنا ہوگا۔کیونکہ یہاں مسئلہ محض اردو زبان میں دوسری زبان کے الفاظ کی آمیزش اور شمولیت کا نہیں ہے۔بلکہ اس کا تعلق اردو زبان کے صدیوں کے تہذیبی و تمدنی شعور سے ہے۔اپنے اس درد کو ڈاکٹر منصور اداریے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

" دربھنگہ ٹائمس'' کو ترتیب دیتے ہوئے مجھے اس کا احساس کم و بیش رہتا ہی ہے۔اندر ہی اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود قلمی نگارشات کی ترتیب و تہذیب کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں کہ یہی ایک ہمارا ثقافتی سرمایہ ہے اور اسی شے کی ترتیب و تہذیب سے انسانی تاریخ کا ایک باب ومنور ہوتا ہے۔جدید دور میں فن کاروں کے اندر پہلے جیسا لسانی شعور نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ تخلیقات کے اندر اُردو پن غائب ہوتا جارہا ہے۔اُردو محاوروں کا بے محل استعمال عام سی بات بنتی جارہی ہے۔اُردو کی لسانی ساخت میں غیر ضروری طور پر ہندی کی آمیزش ہوتی جارہی ہے۔غزل میں ردیف اور قافیہ کا شعور،کلاسیکی شعور اور رچاؤ عنقا ہوتے چلے جارہے ہیں۔غزل گوشعراء ردیف اور قافئے کے انتخاب میں اتنے غیر محتاط ہوگئے ہیں۔غزلوں میں تیزی کے ساتھ نامانوس ہندی الفاظ کی کثرت ہونے لگی ہے۔صاف محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے زمانے میں غزلیہ شاعری پوری طرح

مفلوج ہوجائے گی۔غزل کہنے والوں کواس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔"

" نئے قلم کاروں کی کتابیں جلد بازی میں تیار کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔بعض احباب نے تنقید میں عجیب سا اسلوب اپنا رکھا ہے۔انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تنقید لکھ رہے ہیں۔لیکن وہ یہ نہیں محسوس کر پارہے ہیں کہ تنقید مطالعہ کے ساتھ ادبی بصیرت بھی چاہتی ہے۔پھر تنقید کا انداز بیان پروقار ہوتا ہے۔ چلتا پھرتا بازاری انداز یا دشنام طرازی والا اسلوب تنقید کو نقصان پہنچاتا ہے۔"(۷)

دربھنگہ ٹائمز کا دوسرا شمارہ اپنی بوقلمونی اور مختلف النوع فکری مشمولات کے سبب قارئین کی توجہ مرتکز کیے ہوئے تھا۔جس میں منٹو کا مضمون " ہندوستانی فلم سازی پر ایک نظر "منٹو کا بے رحم اور بے باک قلم ہندستان کے فلم سازوں کی ذہنیت پر نشتر زنی کرتا نظر آتا ہے۔عروس البلاد بمبئی انھیں اس قدر راس آیا کہ یہیں جذب ہو کر رہ گئے۔اور اسی شہر نگاراں بمبئی میں رہ کر معمولی منشی سے فلمی ادیب بن کر ابھرے،اچھے اور برے مکالموں کے ساتھ ساتھ فلمی کہانیاں بھی لکھیں۔یہی وجہ ہے کہ منٹو کو فلم انڈسٹری کی تکنیک،ہدایت کاری اور فلمی کہانیوں کے بارے میں پورا علم تھا۔یہ مضمون اسی تجرنے اور مشاہدے کا ماحصل ہے۔منٹو فلم کی تکنیک کے باریک رموز سے واقف تھے۔اور فلم کے سلسلے میں ان کے مطالعے اور مشاہدے کے لوگ قائل بھی تھے۔لیکن فلم انڈسٹری کے ارباب و اختیار فلموں سے صرف دولت پیدا کرنا چاہتے تھے اور اسے اللہ دین کا چراغ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔فن نام کی شئے سے وہ لاتعلق تھے۔عصمت چغتائی کا مضمون " جنس اور ادب" ان کی بے باک شخصیت اور جدید ذہن کا تخلیقی وظیفہ ہے۔عصمت کے یہاں جنس پردے میں رہنے والی گھٹے ہو ماحول کی پروردا بیبیوں کی عکاسی ہے۔ بقول فیض احمد فیض عصمت کے بیانیہ میں" جنسیاتی کشش"(۸) پائی جاتی ہے۔ممتاز شریں کا مضمون "طویل مختصر افسانہ: ایک الگ ادبی صنف" میں انھوں فن افسانہ کی ہیئیت،مواد اور تکنیک پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔مضمون کا مطالعہ افسانے کے ضمن میں ایک اضافہ ہے۔اور افسانے کے فنی رموز کے کئی جہات کو وا کرتا ہے۔افسانوی شعریات میں اس مضمون کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اپنے مضمون میں منٹو کے فکری اور فنی جہات کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرائی اور منٹو کے شاہ کار افسانے کالی

شلوار، جانکی، شاردا، بو اور ٹھنڈا گوشت پر نئے مباحث و مذاکرے کا آغاز کیا ہے۔جو منٹو فہمی کے باب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔احمد اشفاق کے مجموعے کلام " دسترس" پر حقانی القاسمی کا تبصراتی تأثر مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔احمد اشفاق کی شاعری صوتی آلودگی میں اپنا ایک الگ شعری آواز وآہنگ لئے ہوئے ہے۔ پرفیسر کوثر مظہری کا مضمون " قرأت اور مکالمہ " کافی معلوماتی اور اہمیت کا حامل ہے جو متن کی تکثیریت اور لفظ کے معنیاتی تنوع کے باب میں ایک اضافہ ہے۔ناصر عباس نیر اردو کے ان نظریہ ساز نقادوں میں سے ہیں جو نہایت خاموشی سے تحقیقی وتنقیدی کام کئے جاتے ہیں۔ان کا شمار اردو کے اولین نقادوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی محنت ولگن سے نوآبادیاتی تناظر میں اردو ادب کی تفہیم وتعبیر کی۔اور اردو تنقید کو نئی زبان اور اصطلاحات سے متعارف کرایا۔ان کا مضمون" ساختیات کی اہم اصطلاحات"ادب کے ساختیاتی نظریات اور اصطلاحات پر سیر حاصل بحث ہے۔ان کے علاوہ رسالے میں سید زبیر شاہ،خورشید حیات،شمیم قاسمی،یاسمین رشیدی،دانیال طریر،نور الہدی،ڈاکٹر احسان عالم اور بدر الدجی کے مضامین شامل ہیں۔گوشہ منظومات میں زہرا نگاہ،عالم خورشید،مرزا اطہر ضیاء،ندیم ماہر،پرویز شہریار،ابن اعظم،احمد سہیل،ساجد حمید اور عزیز بلگامی قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر منصور کا اداریہ ہم عصر ادب کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی متون کی حسیت کو موضوع بحث لاتا ہے۔اس کے علاوہ موجودہ ادب میں رونما ہونے والے ادبی مسائل پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ اپنے اداریہ میں ادب اور معاشرے سے متعلق واجب اور سنجیدہ سوالات کھڑے کرتے ہیں کہ ادب اپنے عہد کا نباض اور گواہ ہوتا ہے،ارد گرد وقوع پذیر سانحات کا ادراک اور آگہی سے اپنے قاری کو مطلع کرتا ہے۔معاشرے کی سڑانڈ اور تعفن جس تلخ انداز میں ایک آرٹسٹ بیان کرسکتا ہے وہ کسی اور سے ممکن نہیں، ہمارا ادب ایک زمانے تک برصغیر کی تقسیم کے المیے سے ہی ابھر نہیں پا رہا تھا لیکن ادھر دو تین دہائیوں سے ادب میں عام زندگی کے تلخ حقائق کی عکاسی دیکھنے کو ملی ہے چچا سام اور ان کے حواریوں کے ذریعے انسانی اذہان میں خوف کی سائیکی کو پروان چڑھانے کا ایک رجحان عالمی سطح پر ڈپریشن کی طرف لے جارہا ہے ہماری نوجوان نسل خاص طور پر اس کا شکار ہو رہی

ہے۔اس ڈپریشن کی بنیادی وجہ مارکیٹ، میڈیا اور معیشت ہے جس کے زرق برق طلسمی اشتہار کے سحر میں آ کر ایسے مستقبل کا خواب دیکھنے لگتے ہیں جو اسکرین پر ہی ممکن ہے، اور حقیقت سے اس کا دور دور تک واسطہ نہیں ہوتا۔ دوسری طرف خوف کی سائیکی، عرانیت اور بیہودہ قسم کے مزاح کو الیکٹرانک میڈیا پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کا چلن عام ہو چلا ہے۔ جرنلزم میں یہ کہاوت عام ہے" جو بکتا ہے وہی دیکھتا ہے" صارفی ذہنیت والی دنیا میں صارف کی مانگ کے اعتبار سے اشیاء منڈی میں آتی ہیں۔ادب کے ایک سنجیدہ قاری کی یہ جھنجھلاہٹ واجب ہے جس کا اظہار فاضل مدیر نے اپنے اداریے میں کیا ہے، ملاحظہ کریں۔

"ادب کو اظہار کی آزادی کا وسیلہ سمجھنے والوں نے جس طوفان بدتمیزی کا مظاہرہ کر رکھا ہے کیا اس سے ادب کی طہارت اور عظمت کو خطرہ نہیں ہے؟ غلط قسم کے سائنسی و علمی تصورات کی بنیاد پر جو معاشرہ ظہور پذیر ہونا چاہئے وہ ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ ہمارا ملک بھی اشرافی تہذیب و تمدن کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ بہت سی تبدیلیاں ہمارے یہاں بھی رونما ہو چکی ہیں۔ان تبدیلیوں میں سے ایک بڑی تبدیلی حال ہی میں ظاہر ہوئی ہے۔اہنسا کے پجاری کے قاتل کا مندر بنانے کی شکل میں۔ سیاسی حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ ہم لوگ ایک ملک بھارت کے باشندگان ہیں۔ ہندوستان ہماری سائیکی کا حصہ ہے اور بھارت گیروے رنگ کا نمائندہ۔ ہمارے کچھ نام تاریخ کے اُفق پر ابھی تو جھلملا رہے ہیں۔ مستقبل میں ان کی تابانی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔اعلان کیا جا چکا ہے کہ اب تاریخ بدلنی ہے۔اگلا مرحلہ ہمارے ناموں کی تبدیلی کا ہوگا۔ان سب تبدیلیوں میں کیا ہماری خاموش رضامندی نہیں ہے؟ ہمیں تماشہ بہت مرغوب ہے۔"

" آج ہماری سماجی، تعلیمی، سیاسی، معاشرتی زندگی کئی طرح کے کج مج خیالات کی زائیدہ ہے۔ وہ تصورات جو ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں، اگر ان کو کھنگالنا شروع کیا جائے تو بہت سے باطل تصورات ہمارے جسم و جاں سے چمٹے نظر آئیں گے۔ مغرب نے اور بعض مغربی افکار نے عالمی سطح پر جن سائنسی اور مذہبی بلکہ سیاسی تصورات کو عام کیا ان پر تکیہ کر کے اخلاق و تمدن کی عمارتیں بلند کی گئیں۔انسان کا نظریہ ارتقاء ان باطل تصورات میں سب سے اوپر تھا۔ڈارون

کے پیش کردہ نظریہ کو بنیاد بنا کر مغرب نے انسانی ثقافت اور تہذیب کی بنیاد ڈال دی تھی۔ یہ ایک انسان کا خلق کردہ ایسا تصور تھا جس نے فطری نظام کی نفی کرتے ہوئے اس Mster Plan کی مکمل نفی کر دی جس کا سمجھنا اشد ضروری تھا۔ حیات اور کائنات کے مربوط رشتے کو ایک نیم پختہ سائنسی تجربہ کے حوالے سے سمجھنا کتنا خطرناک ہوتا ہے یہ بات آج ثابت بھی ہو چکی ہے۔ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے بعد فرائڈین تھیوری نے انسان کے تعلق سے من گھڑت نفسیاتی فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ چوں کہ فرائڈین تھیوری کا سارا دارومدار جنس (Sex) اور انسانی لاشعور تھا اس لئے ہر طرح کی بات انہی دو چیزوں کے اِردگرد رقص کرنے لگی۔ چنانچہ سائنسی اور اخلاقی علوم کا تانا بانا ڈارون اور فرائڈ کے فلسفہ ہائے انسان کے تعلق سے بنایا گیا اور آج جدید دور کی معاشرتی و سیاسی زندگی ان تصورات کی ترقی یافتہ شکل ہے جس میں نئے مسائل ثقافت، صارفین، تانیثیت وغیرہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہوا ہے۔علامہ اقبال نے اپنی نظم و نثر سے جہاں تک ممکن ہو سکا تھا اس مغربی سیلاب کے خطرناک نتائج سے ہمیں آگاہ کیا تھا لیکن اب یہ عالم ہے کہ ہم کسی بھی موضوع پر گرما گرم بحث کرتے وقت اس کی بنیاد اور اصل کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ ہم اُردو والے بھی حسی، عقلی اور اشرافی تہذیب و تمدن کا حصہ غیر محسوس طریقہ سے بنتے جا رہے ہیں، ہمارے اندر تفریق و تمیز کرنے کی صلاحیت ہی کا فقدان ہو گیا ہے کیوں کہ ہم نے اپنی اصل سے رشتہ توڑ کر نام نہاد عالمی ثقافت کا حصہ بننے میں فخر محسوس کیا ہے۔ ہمیں اپنی ایک مخصوص آئیڈنٹیٹی پر اصرار تو ہے لیکن ہماری علمی شخصیت غیاب میں چلی گئی ہے۔"(۹)

سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز کا افسانہ نمبر ادبی دنیا میں بڑے تزک و احتشام سے داخل ہوا۔ادب میں اظہار خیال کی آزادی کے ساتھ ادب کی عظمت و حمیت کا وسیلہ بھی بنا۔ناول اور داستانوں سے قطع نظر افسانے کی اپنی سائیکی و مزاج ہوتا ہے۔اس کو موضوعات اکہرے اور کل کے بجائے جز پر مشتمل ہوتے ہیں۔افسانے صنعتی اور مہاجنی سماج کی کوکھ سے جنم لیا اور جدید عہد کی دوڑتی بھاگتی زندگی کی علامت بن گیا۔آج کے نیوکلیر اور میٹروپولیٹن ایریا کے الام روزگار اور اس مسرتوں اور سنگینیوں سمیت ہمیں سونپ رہا ہے۔اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارا ادیب اپنے عہد

کی ڈھڑکنوں کو زبان و بیان کے پیکر میں سمو کر تخلیقی جبر سے گذرتا ہے۔ پریم چند نے دیہی سماج کے مسائل کو اہمیت دی۔ زمین داروں اور ساہوکاروں کے ظلم و جبر کو اپنا تخلیقی وسیلہ بنایا۔ منٹو نے زندہ معاشرے کے مردہ ضمیر کو اپنے افسانوں میں جھنجھوڑا۔ قرۃ العین حیدر نے تاریخ کے جبر کو اپنے فن میں استعارے کے طور پر برتا۔ انتظار حسین نے اپنے فکشن میں ہندی، سامی اور عجمی روایات کو سمویا تو انھیں ماضی پرست، رجعت پرست سے موسوم کیا گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا فکشن تشکیلی خصوصیات رکھتا ہے۔ جونو آبادیاتی فکشن کی شعریات کا بغاوتی استعارہ ہے۔ افسانہ نمبر کے اس خاص شمارے کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے پہلا حصہ افسانوں پر مشتمل ہے جن میں گھر واپسی شموئل احمد۔ ڈائن، پیغام آفاقی۔ رات کا منظر، مجیب ابرار۔ آخری معرکہ، نعیم بیگ۔ یہ افسانے علاقائی اور عالمی سطح پر پھیلی دہشت، خوف، نسلی عصبیت، اندھی قومیت اور مذہبی مجذوبیت کے شکار لوگوں کا المیہ بیانیہ ہے۔ اس انتہا پسندی کا حل مکالمہ ہے جس کی کوشش معروضی انداز میں ہونی چاہیے۔ ایسا ہی ایک افسانہ سلمیٰ جیلانی کا" عشق پیچاں "ہے جو پاکستان کی اندرون خانہ دہشتگردی، نسلی، لسانی اور علاقائی تعصّبات کے علاوہ مسلکی تشدد کی عکاسی بڑے عمدہ لب و لہجے میں کرتا ہے۔ اپنے افسانے" میری سہیلی" میں مجیر آزاد نے ہندستان کے مہذب معاشرے کی جہیز جیسی رسم ورواج کی سچائی سے پردہ اٹھایا ہے۔ اوراس طرح کی فرسودہ روایت کی سبب نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں عورت پن کا ادھورہ خواب لئے پرلوک سدھار جاتیں ہیں۔ مشتاق احمد نوری کا افسانہ" لمبی ریس کا گھوڑا" گلوبلائزیشن کے سبب سکڑتی سمٹتی اورانسانی مٹھی میں بند ہوتی دنیا کا لفظی استعارہ ہے۔ آج کا انسان خواہشات اوراشتہارات کے جنگل میں زندگی گذار رہا ہے اور کم وقت میں بہت اونچی اڑان بھرنا چاہتا ہے۔ صارفیت کی عالمی منڈی میں انسان کی حیثیت ایک کموڈٹی، ایک شئے کی ہے۔ جس کا سودا ہوتا ہے۔ جو بیچی اور خریدی جاتی ہے۔ یہ افسانہ انھیں مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کا افسانہ" گذرتی عمر کی کنواری لڑکی "ورکنگ کلاس کی ازدواجی زندگی کے بدنی شور کا داخلی المیہ ہے۔ جہاں دنیا کی نعمتوں کے الوان و اقسام موجود ہیں لیکن ذہنی وجسمانی تسکین واطمینان حاصل نہیں ہے۔ افسانہ نمبر کا دوسرا گوشہ اردو

افسانے پر اجتماعی مکالمے، مباحثے اور محاکمے پر مبنی ہے۔ دیپک بدکی نے کرشن چندر کی رومانی حقیقت نگاری میں عالم گیر مسائل ومصائب پوری سنگینیوں سمیت صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا کرشن چندر نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا اس کا اطلاق کسی ایک خطہ ارض سے نہیں ہوتا تھا بل کہ وہ عالمی حسیت میں ڈوب کر انسانی کرب کو بیان کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی حیثیت اردو ادب میں لیجینڈ کی ہے۔ عہد حاضر کے ممتاز فکشن نقادوں میں ابوبکر عباد، حقانی القاسمی اور خورشید حیات کو اعتباریت کی نظر دیکھا جاتا ہے۔ ان کی تنقید متن کے ساختیے اوراس کے وقوعی اور موضوعی منطقے سے بحث کرتی ہے۔ ان کے یہاں ادب کے پرکھ کا وسیلہ تنقید برائے تفہیم وتعبیر ہوتا ہے یہ قاری کو مرعوب کرنے کے لئے فن تنقید کو پیشے کے طور پر نہیں اپنایا بل کہ ایک مشن کی طرح عقیدت ومحبت سے جڑے رہے۔ ان کے تنقیدی مضامین تخلیقی ابعاد کو اپنے اندر سموے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو ساعتوں کو بوجھل نہیں کرتے بل کہ کانوں میں رس گھولتیں ہیں۔ اور قاری کو متن کی سمجھ و پرکھ میں آسانی ہوتی ہے۔ ان کی تخلیقی تنقید کو پڑھ کر ذہن مکدر نہیں ہوتا بل کہ ایک طرح کی فرحت ومسرت اور ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے۔ افسانے نمبر میں شامل ڈاکٹر ابوبکر عباد کا مضمون رشید جہاں کے فکر وفن اور زبان و بیان کے بہت سے پوشیدہ جہات کو طشت از بام کرتا ہے۔ اوراس بات کی بھی یقین دہانی کراتا ہے کہ کہانی کے حسن محل کی تعمیر میں رشید جہاں کی خدمات میل کے پتھر کی سی ہے۔ حقانی القاسمی نے نغمہ ضیاء الدین کے تخلیقی سوچ کے کینوس سے کلام کیا ہے کہ ان کے فکشن کی اساس شرق وغرب کے مابین قطبین کا تہذیبی وتمدنی بعد ہے۔ جو مہاجرین کی ذہنی سائیکی میں اضطراب کی وجہ ہے۔ خورشید حیات کی تنقید اپنے اندر تخلیقی شرینی ومٹھاس لئے ہوتی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین پڑھنے سے باطنی آنند کا خوش گوار احساس ہوتا ہے۔ ان کا مضمون" کہانی مشک سے پھوٹتی خوشبو "پروفیسر اسلم جمشید پوری کے تخلیقی وژن کا بھرپور محاکمہ ہے۔ اس کی قرأت سے قاری کو ادبی لذتیت کا خوش نما احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ظفر شہاب اعظمی نے مغرب کے تانیثی نظریات و مبادیات کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے ہم عصر مشرقی خواتین لکھاریوں کی جرأت اظہار کو داد وتحسین سے نوازا ہے کہ انھوں لکھے لفظوں میں مرد حاوی سوچ کو اپنی تخلیقات میں نشانہ بنایا۔ یاسمین رشیدی

نے عصر حاضر کے نسائی ڈسکورس پر بحث کی ہے جو آج اپنی پہچان و شناخت کی پر زور وکالت کرتی ہیں۔موجودہ دور کا تانیثی ادب ذکر اساس نظام کے ہر ظلم و جور و استحصال پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔جوان سال اسکالر شاہد الرحمٰن کا مضمون ان کے تحقیقی بصیرت کا عطیہ خاوندی ہے جس کے لئے انھوں نے ضیغم غزال کی تخلیقات کا وظیفہ پڑھا تھا۔ضیغم غزال کے یہاں تانیثی نظام حیات اور نسائی فکر کی آنچ بہت دھیمی ہے جو قاری کے اندر حباب کی مثل پھوٹتی رہتی ہے۔نئی نسل میں اردو لسانیات کے رموز سے شغف رکھنے والے شہنواز فیاض کا مضمون "اختر اورینوی کی افسانوی کائنات" کا موضوعی مطالعہ ہے۔جس میں انھوں نے اپنے موضوع کے معروف افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ان کی یہ کھوج غور وخوض کی دعوت دیتی ہے کہ بہار کی دیہی زندگی اور وہاں کے کسانوں مزدوروں کے مسائل کو پہلی مرتبہ اختر اورینوی نے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔اس کے علاوہ دیہاتوں سے رزق کی تلاش میں شہروں کی طرف ہجرت کرنے والے مزدوروں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

افسانہ نمبر کی مقبولیت اور شہرت کی ایک وجہ معروف فکشن رائٹر مشرف عالم ذوقی کا انٹرویو بھی ہے۔جو اپنی بے باکی، آزاد خیالی اور اردو فکشن میں نت نئے موضوعات اور اچھوتے خیالات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔یہ انٹرویو اردو کے نوآموز اور نوخیز لکھاریوں کے لئے مشعل راہ ہے۔جو تخلیق کی دنیا کی صحرانوردی کا عزم کر چکے ہیں۔لائق صد تحسین ہیں صدف اقبال جنھوں نے اپنی جرأت وہمت سے ذوقی کے اندرون سے موجودہ ادبی سمت و رفتار کے رطب و یابس کو باہر نکالا۔جو آج کی دنیا کے ہنگاموں اور تماشوں سے مکالمہ کرتے ہیں۔میں اس انٹرویو سے دو اقتباس آپ کی نظر کرنا چاہتا ہوں ملاحظہ کریں۔"مجھے اس بات کا احساس ہے کہ بغیر کسی بڑے نظریہ کے آپ ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔اتفاق کرنا ضروری نہیں۔اسی لئے ناول ہو یا کہانیاں، یہ نظریہ سے چھن کر آتی ہیں۔میں اس معاملے میں وکٹر ہیوگو اور تالستائی کے ساتھ ہوں جہاں ادب واقعات و حادثات کے جبر سے گھبرا کر انسانیت کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔اور اسی لئے بڑے بڑے حادثے کے دوران کسی بچے کی مسکراہٹ مجھے پسند آجاتی ہے۔مجھے گھبرایا ہوا نور محمد اچھا لگتا ہے۔مجھے زخمی

شیرنی جیسی ناہید میں اپنے عہد کی باغی عورتوں کی جھلک نظر آتی ہے۔مجھے اسامہ پاشا میں اپنا بچہ نظر آتا ہے۔مجھے غلام بخش میں لہولہو تقسیم کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔دوسرا اقتباس ملاحظہ کریں۔"جو فکشن کے نظام حیات میں اپنی طرف سے، نئے فلسفوں کا اضافہ کرنے کے لئے بے چین ہیں، اور اسی لئے ان کی کہانیاں فکشن کی کسی لکیر پر نہیں چلتیں۔اچھے فکشن کو کئی مصالحے چاہئیں، مثال کے لئے فنتاسی، موہوم حقیقت نگاری، جادوئی حقیقت نگاری، ابہام کی حسین پرت بھی ان کی کہانیوں میں شامل ہو۔دراصل اس مکمل عہد کو میں کنفیوژن کا عہد کہتا ہوں۔موت پر فتح پانے کی کوشش بھی اور اموات میں اضافہ بھی، مریخ پر کمند بھی اور امریکہ یورپ کی غربت بھی۔ایک بڑا ایلیٹ کلاس اور اکانومی سے لڑتا ایک کلاس۔مذہب بھی اور مذہب بیزاری بھی۔سائنس اور ٹکنالوجی بھی اور ان کی کامیابیاں انسانوں کو پسپا کرنے اور بونسائی بنانے کے لئے کافی۔ظاہر ہوا ایسے عہد میں فکشن کو آپ سپاٹ بیانیہ کے سہارے نہیں گزار سکتے۔موضوع آپ سے مکالمہ کرے گا تو کئے جہات، کئی شیڈ، کئی ڈائمنشن پیدا ہوں گے۔اور انہیں کہانی یا ناول میں پیش کرنے کے لئے جب تک آپ کا مطالعہ وسیع نہیں ہوگا۔جب تک آپ اپنے عہد کی سائنسی وفکری تمام حقیقتوں سے قریب نہیں ہوں گے، فکشن پر آپ کی مضبوط پکڑ یا دسترس نہیں ہوگی۔اور اسی کئے فکشن کو اب نئے مکالموں کی ضرورت ہے۔"(۱۰)

محولہ بالا اقتباس میں مشرف عالم ذوقی نے اپنے فنکارانہ جرأت کا مظاہرہ کیا، اور اس بات پر زور دیا کہ ہمارے عہد کا ادب کو اپنے فنی واسلوبیاتی رموز ونکات کے ساتھ وقت کے بدلتے نظام حیات کے فلسفوں سے بھی سیکھ لینا چاہیے۔سچ ہے کہ جب تک ہم اپنے عہد کے نت نئے سائنسی اختراعات کی حقیقتوں سے روبرو نہیں ہوں گے۔موضوع ہم سے کلام کرتا رہے گا۔مستعد رہنا ہوگا کہ جدید سائنس وٹکنالوجی مکمل طور پر کنفیوژ کرنے والی ہیں۔اس کی مثال ویسی ہے کہ "وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا" اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کی آج اردو فکشن کو نئے مذاکرے اور مباحثے کی ضرورت ہے۔

اردو ادب کے عصری منظر نامے پر دربھنگہ کی علمی وادبی خاک سے ابھرنے

والا نام ڈاکٹر منصور خوشتر ہے۔جنھوں نے بہت کم عرصے میں اپنے تخلیقی وژن اور ادارتی صلاحیت سے عشاق ادب کی محفلوں کے سرمور بن گئے۔آج اردو کو ایسے ہی فعال صحافی، دوراندیش مدیر اور متحرک نوجوان کی ضرورت ہے جو اردو کو جنون کی حد تک ٹوٹ کر چاہے۔جس کا جیتا جاگتا ثبوت موٴقر سہ ماہی ادبی رسالہ "دربھنگہ ٹائمز" ہے۔جس کے متعدد شمارے زیور طبع سے آراستہ ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔جس کی ادبی حلقوں میں پذیرائی بھی خوب ہوئی۔"ادب کے صحت مند روایات اور جدید رجحانات کا ترجمان" دربھنگہ ٹائمز کا ناول نمبر دستاویزی حیثیت کا حامل ہے کیونکہ جب کبھی ناول کے ہیئت، مواد اور لسانیات پر ڈسکورس ہوگا تو یہ رسالے حوالے کے طور پر پیش کیا جائے گا۔رسالے میں شامل مضامین اور مکالمہ ومباحثہ ناول کے بیانیے اور کلامیے قارئین کو نئے انداز سے پرکھنے اور غور وخوض کی دعوت دیتے ہیں۔اس سلسلے میں رسالے کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر اداریہ میں لکھتے ہیں " چونکہ فکشن /افسانہ کے مقابلے ناول میں مسائل و مباحث کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔اس میں معاشرہ کی زبان الگ ہوتی ہے۔فنی اور تکنیکی سروکار کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ یہ پہلو بھی پیش نظر تھا کہ اکیسویں صدی میں متواتر ناول شائع ہورہے ہیں۔لہذا ناول نگاری میں آنے والی تیزی پر مکالمے ضروری ہے، تاکہ ناول کے نام پر سامنے آنے والی رطب ویابس تمام تحریروں کو ناول کہنے یا نہ کہنے کا کوئی معیار قائم ہو سکے۔چنانچہ اس شمارہ کی ترتیب وتہذیب میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ مکالمے اور تلازمے کا باب کھلے، تاکہ اردو ناول کو معتبریت کی سند مل سکے۔(۷)

"اگر ہم ناول کے موضوعات پر ایک نظر ڈالیں تو محسوس ہوگا کہ ایڈیٹر موصوف نے کتنی جانفشانی اور لگن سے ناول نمبر کو ترتیب دیا ہے۔عصر حاضر کے مشاہیر لکھاریوں کے ساتھ ساتھ نئے ذہنوں کی تنقیدی سمجھ کو بھی منظر عام پر لانے کی جرأت کی ہے تاکہ اردو کا قاری نئی نسل کی ناقدانہ صلاحیت اور بصیرت کا اعتراف کرے۔جوان سال اسکالروں کے مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔"آئی کنفیس "ڈاکٹر فیاض احمد وجیہ" سید محمد اشرف کا ناول: نمبر دار کا نیلا "ڈاکٹر شاہد الرحمٰن اور سلمان فیصل کا مضمون" کہانی کوئی سناؤ متاشا" قابل ذکر ہیں۔اس خاص نمبر کی مقبولیت

معتبریت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں عہد حاضر کے معروف ومقبول فکشن رائٹر اور ناقدین کے انٹرویوز شامل کئے گئے ہیں۔اور اسی کے ساتھ موجودہ دور میں ناول کی سمت ورفتار کے تعین قدر کے لئے ان معلومات افزا مضامین کو اس خاص نمبر کی زینت بنایا گیا ہے۔جس کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔"اردو ناول کے ساتھ دو چار قدم" عبدالصمد "اردو ناول کی کم ہوتی دنیا" مشرف عالم ذوقی" اردو ناول کی تجدید اور غضنفر "پیغام آفاقی" ہم عصر اہم ناولوں کے تنقیدی شذرات" پروفیسر عاشق ہرگانوی "ناول برستے نہیں" جمال اویسی "پلیتہ" حقانی القاسمی "اردو ناول ارتقا سے ترقی پسند تحریک تک "ڈاکٹر ابوبکر عباد "اکیسویں صدی میں اردو ناول "ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی "ناول کا فن اور ناول کی تنقید کا المیہ "رحمان عباس "ایوانوس کے خوبیدہ چراغ پر ایک نظر" سلیم انصاری "پارسا بی بی کا بگھار "ڈاکٹر قمر جہاں "سرور جہاں کا ناول دوسری ہجرت "ڈاکٹر سید احمد قادری" قصہ اردو ناول کے ایک درویش کا "خورشید حیات "عباس خاں کی ناول نگاری "ڈاکٹر پرویز شہریار "بہار میں اردو ناول نگاری کا ابتدائی مرحلہ "ڈاکٹر قیام نیر" حسین الحق کے ناول فرات کا ساختیاتی مطالعہ "ڈاکٹر اقبال واجد "جرأت اظہار بنام زخم گواہ "ڈاکٹر مجیر آزاد" گمشدہ زمینوں کی لکھاوٹ "یاسمین رشیدی۔رسالے کے اس خاص نمبر میں التزام بھر یہ سعی کی گئی ہے کہ اردو فکشن کے سلسلے میں جو سوالات ادبی منظر نامے پر کسی بھی رکاوٹ یا سبب سے نہیں اجاگر ہو سکے تھے ان سوالوں کو مرکزی حیثیت دی گئی اور ان مکالمہ، محاکمہ اور مباحثہ ہوا اور نیک نیتی سے ان کو جوابات دیے گئے۔اس سلسلے ڈاکٹر منصور خوشتر اداریہ میں لکھتے ہیں م۔" چنانچہ چند ایسے سوالات پر توجہ دلانے کی کوشش ضرور کروں گا، جن پر ہمیں سنجیدگی سے غور وفکر کرنی چاہئے۔معاصر اردو ناول کے پس منظر میں کئی سوالات ومسائل سامنے آتے ہیں۔مثلاً، ناول کی تفہیم، ناول میں تاریخی حسیت وعناصر کی شمولیت، صحافت اور ادب کا انسلاکات، ناول پر سنجیدہ مکالمے، بڑھتی ضخامت اور گم ہوتے قارئین، زبان میں تخلیقیت کے نام پر سیاست، نقادوں اور قاریوں کے درمیان ناول کا معلق ہونا، فلسفہ اور ادب، یہ سب وہ موضوعات اور سوالات ہیں، جن پر سنجیدہ ہونا لازمی ہے۔کیوں کہ آج ایسے ناول بھی منظر عام پر آرہے ہیں، جن کی تفہیم میں نہ صرف عام بلکہ

بیدار مغز قاریوں کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس لیے یہ سوال فطری ہے کہ تفہیم و ترسیل کے معاملات سے عاری ناول، ناول کے مین فریم میں سما سکتے ہیں؟ کیا نا سمجھ میں آنے والے ناولوں کو ہی معتبریت کی سند عطا کردی جائے؟ اسی طرح ناول میں تاریخی سروکار کا معاملہ بھی اتنا آسان نہیں ہے، جتنا کہ سمجھ لیا گیا ہے۔ کیوں کہ ناول کے لیے صفحات در صفحات مواد، تاریخی ماخذ سے حاصل کیے جا رہے ہیں۔ناول پر گفتگو کرتے وقت آج دو باتیں بڑی شدت سے اٹھائی جاتی ہیں، تاہم ان پر بیدار مغزی اور توسع پسندانہ ذہنیت سے بات نہیں ہوتی۔ وہ ہیں، زبان میں تخلیقیت اور ناولوں میں فلسفہ کی شمولیت۔ بیشتر ایسا دیکھا گیا کہ زبان کی تخلیقیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تردید کا بازار گرم ہے۔ناولوں کی تمام تر اچھائیوں کو قبول کر لینے کے بعد بڑی آسانی سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ زبان تخلیقی نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ ردوکد کے لیے زبان کے تخلیقی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ، جس کے جی میں جب آئے، سنا دے؟ رہی بات فلسفہ کی تو یہ بہت پر پیچ مسئلہ اور مختلف فیہ معاملہ ہے۔ کیوں کہ کبھی فلسفہ کے نمک کے بغیر ناول حلق سے نہیں اترتا تو کبھی یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ آج ناول نگاری نارِ فلسفہ سے آگے بڑھ چکی ہے۔ فلسفیانہ مباحث کا التزام ضروری نہیں۔موجودہ عہد میں ادبی سیاست کا گرما گرم موضوع یہ بھی ہے کہ کسی کو کوئی پسند نہ آئے تو فوراً ناول پر صحافت ہونے کا فیصلہ صادر کردیا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت یا جدید معاشرے کی جو سچائیاں ہیں، ان کو پیش کرنے کے لیے فلسفہ کی کس میڈیم کی ضرورت ہے؟ یا پھر تخلیق کو صحافت کے رنگ سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ کیا آج ایسے مکالمے کی ضرورت نہیں جو صحافت اور تخلیق کے انسلاکات پر روشنی ڈالے؟ موجودہ ادبی منظر نامہ پر متعدد سوالات موجود ہیں، لیکن گروہ بندی کی ایسی روش کہ ہم سنجیدہ ہو ہی نہیں پاتے۔" (۱۱)

یہ وہ سوالات ہیں جن کو مدیر موصوف نے بڑی سنجیدگی سے ادب کے قارئین کے سامنے رکھا کیونکہ اکیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والے ناولوں پر معروضیت کے ساتھ اجتماعی مکالمہ ضروری تھا۔اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے عہد کا صحت مند قاری گم ہوتا جا رہا ہے جو بچا کھچا قاری ہے وہ ہمارے ناقد حضرات کے متنی منطقے میں معلق ہے۔ادب کی تفہیم کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی

ہیں کیونکہ ہمارے ناقدین ادب کی تعبیر کے بجائے متن کو ایسا گنجلک اور فلسفیانہ منطق کی پیچیدگی کے ساتھ توضیح کرتے ہیں کہ قاری بے چارے کی سانسیں اکھڑ اکھڑ جاتی ہیں۔ایسے میں دربھنگہ ٹائمز کا ناول نمبر قاری اور تخلیقی شاہکار کے مابین وسیلے کی کڑی کا کام کرے گا۔

شمالی بہار کے ادبی مرکز دربھنگہ سے ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں نکلنے والا سہ ماہی ادبی رسالہ دربھنگہ ٹائمز اپنے معیاری مشمولات اور حیرت انگیز بوقلمونی، تنوع اور رنگارنگی کے سبب قارئین کے توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔تخلیقی مکالمے، مباحثے اور مذاکرے کی نئی راہ ہموار کرنے اور ادبی شعور کی نئی جوت جگانے میں اس مجلّہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ رسالہ مدیر موصوف کے جنون ادب کا معتبر و مستند استعارہ ہے۔اردو کے بہت کم جریدے و رسائل ہیں جو اردو ادب کی بقا اور ترویج و اشاعت میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ دربھنگہ ٹائمز نے اتنے قلیل مدت میں عالمی ادب میں پذیرائی کی ایک عمدہ مثال قائم کی، اور صحت مند ادب کے علم کو بلند رکھا۔جس کی ظاہری و معنوی شناخت گلوبل سطح پر ہے۔دربھنگہ ٹائمز کے افسانہ اور ناول کے خاص نمبر منصۂ شہود پر آ کر شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔جس کے تحریروں کی بازگشت ادبی حلقوں میں دیرپا ثابت ہوگی۔

☆☆☆

حواشی

۱۔دربھنگہ میں اردو: ظہیر ناشاد دربھنگوی ایم اے، مہ جبیں کتاب گھر ۱۹۷۷

۲۔عہد اسلامیہ میں دربھنگہ: تاریخی بازیافت، ڈاکٹر عالم گیر شبنم، ابجد، سہ ماہی شمارہ نمبر ۶، مدیر تاجدار احمد، اسلام نگر، ارریہ، بہار

۳۔نثر نگاران دربھنگہ: ڈاکٹر منصور خوشتر، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی۔۲۰۱۵

۴۔متھلا میں اردو صحافت: سلمان عبدالصمد، ماہ نامہ اردو دنیا، دہلی، اپریل ۲۰۱۶

۵۔سہ ماہی جہان اردو: ایڈیٹر ڈاکٹر مشتاق، رحم گنج، دربھنگہ، بہار ۲۰۱۴

۶۔ماہ نامہ تمثیل نو: مدیر ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ ۲۰۱۱

۷۔اداریہ: دربھنگہ ٹائمز، ناول نمبر، مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر، دربھنگہ، بہار۔ مارچ ۲۰۱۶

۸۔عصمت چغتائی: فیض احمد فیض، اردو ماہ نامہ، ایڈیٹر، سیماب احمد خان، عصمت چغتائی نمبر، دہلی

۹۔اداریہ: دربھنگہ ٹائمز: ناول نمبر، مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر، دربھنگہ، بہار۔۲۰۱۶

۱۰۔اداریہ: دربھنگہ ٹائمز: ناول نمبر، مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر، دربھنگہ، بہار۔۲۰۱۶

۱۱۔مشرف عالم ذوقی سے ایک انٹرویو: صدف اقبال، دربھنگہ ٹائمز: افسانہ نمبر، مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر، دربھنگہ، بہار۔۲۰۱۵

☆☆☆☆

محمد عبدالرحمٰن ارشد

اردو اخبارات کو درپیش مسائل

(صوبہء بہار کے حوالے سے)

ہندستان میں اردو میڈیا کا ماضی شاندار رہا ہے۔ سرسید احمد خاں کا 'تہذیب الاخلاق' محمد علی جوہر کا 'ہمدرد' اور مولانا آزاد کے اخبارات 'الہلال' اور 'البلاغ' کی زریں اور بے باک صحافت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان اخبارات نے جو قومی اور ملی فریضہ انجام دیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ صوبہ بہار کے ابتدائی اخبار میں 'صدائے عام' اور مرحوم غلام سرور کا اخبار 'سنگم' بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو اخبارات کے اس شاندار ماضی کے باوجود ان کے موجودہ حالات ناگفتہ بہ ہو گیے ہیں۔ موجودہ وقت میں پورے ہندستان میں اردو کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ یہی صورتِ حال اردو اخبارات کی بھی ہے۔ صوبہ بہار ان مسائل سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن بہار میں اردو صحافت کے مسائل الگ طرح کے بھی ہیں۔ یوں تو اردو اور اردو والوں سے محبت کے دعوے بہت کئے جاتے ہیں، لیکن مرحلہ جب وعدہ وفا کا آتا ہے تو ارباب اقتدار طوطہ چشمی سے گریز نہیں کرتے۔ اردو اخبارات کی یاد سیاست دانوں کو صرف انتخاب کے موسم میں ہی آتی ہے۔

اردو اخبارات کو شروع سے ہی بہت سارے مسائل درپیش رہے ہیں۔ ان مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ اخبارات کی مالیات ہے۔ بغیر پیسے کے اخبار نکالا نہیں جا سکتا۔ مالیات کی فراہمی کا ایک اہم بلکہ واحد ذریعہ اشتہارات ہیں۔ ظاہر ہے ہر اخبار اشتہارات سے حاصل شدہ مالیات سے چلتا ہے۔ ان اشتہارات میں ایک بہت بڑا حصہ حکومتِ ہند اور ریاستی حکومت کے ذریعہ دیے گیے اشتہارات کا ہوتا ہے۔ حکومتِ ہند کا ادارہ ڈی اے وی پی اور بہار کی حکومت کا محکمہ پی آر ڈی ان امور کی دیکھ ریکھ کرتا ہے اور اخبارات کو اشہارات تقسیم نیز اشتہار کی شرح متعین کرتا ہے۔ لیکن دیکھا یہ

جاتا ہے کہ متعصّبانہ طور پر اردو اخبارات کو کم شرح پر کم سے کم اشتہارات دیے جاتے ہیں جس سے مالکان کے لیے اخبارات کو چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر چند اخبارات کو اچھی تعداد اور شرح پر اشتہارات ملتے بھی ہیں تو گویا اس طرح کہ یہ اردو اخبارات پر احسانِ عظیم ہوں۔ قابل ذکر بات ہے کہ پی ایس یوز بھی حکومتِ ہند کے متعلقہ محکمہ کی ہدایت کے باوجود اشتہارات کی تقسیم میں اردو اخبارات کے ساتھ تعصب روا رکھتی ہے۔ ہندستان کے عوام بالخصوص مسلمان عوام اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں کے مسائل کو اگر کسی اخبار نے اٹھایا ہے تو وہ صرف اردو اخبارات ہی ہیں۔ ایسی صورت میں اردو اخبارات چند غیر سیکولر سیاست دانوں کو بھاتے نہیں ہیں۔ الغرض اردو اخبار سیاسی سازش کا شکار ہے اور اس کی ترقی پورے طور پر نہیں ہو پا رہی ہے۔ پرائیوٹ سیکٹر بھی اشتہارات کا بہت بڑا ذریعہ ہوتے ہیں۔ لیکن معیار اور سرکولیشن میں خاطر خواہ اضافہ کیے بغیر پرائیوٹ سیکٹر کی توجہ اردو اخبارات کی طرف مبذول نہیں کرائی جا سکتی۔ قابل ذکر ہے کہ اردو اخبارات کو حکومتِ ہند کی جانب سے کچھ گرانٹس بھی ملتے ہیں، جسے مالکانِ اخبار کو اخبار کی ترقی میں لگانا چاہیے۔

فائلنگ اخبارات: دوسرا بڑا مسئلہ فائلنگ اخبارات کی شناخت کا ہے۔ بہار میں فی الحال کم و بیش 105 روزنامہ اخبارات آر این آئی سے رجسٹرڈ ہیں۔ اگر ان میں ہفتہ وار، دو ہفتگی، ماہنامہ اور سہ ماہی اخبارات اور رسالوں کو شمار کیا جائے تو یہ تعداد 250 سے زائد ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ان میں سے بہت سارے اخبارات فائلنگ پیپر ہیں۔ اس طرح کے اخبارات صرف ماسٹر ہیڈ تبدیل کر کے متعدد اخبارات طبع کرتے اور اشتہارات کے سارے پیسے بچا لیتے۔ اور تو اور ان اخبارات کو صحیح طور پر بازار میں بھی بھیجا نہیں جاتا۔ معاملہ یہ ہے کہ ایسے اخبارات کے مالکان متعلقہ ڈپارٹمنٹ کے افسران کو پچاس فیصد سے زائد کمیشن دے دے کر اشتہارات اُچک لیتے ہیں۔ ان اخبارات اور ان سے متعلق صحافیوں خاص کر ایڈیٹر کی شناخت کر کے ان پر کاروائی کی جانی چاہیے، کیونکہ ان میں بیشتر ایسے افراد ہوتے ہیں جو اردو کی الف ب سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں، لیکن سبھی

طرح کی صحافتی مراعات حاصل کرتے ہیں۔ اردو صحافی اگر ایک جٹ ہو جائیں تو ان جعلی اخبارات اور صحافیوں کی شناخت آسان ہو جائے گی۔

معیار کا مسئلہ: اکثر اردو سے متعلق دانشور طبقہ کے افراد کو کہتے سنا جاتا ہے کہ اردو اخبارات کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ لیکن کبھی معیار کے گرنے کی وجہ پر غور نہیں کیا جاتا۔ معیار کے گرنے کی وجہ ہے بنیادی سطح پر اردو کی معیاری تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ آج سے دو دہائی قبل تک لوگ جب اردو صحافت کو اپنا میدانِ عمل منتخب کرتے تھے تو وہ اردو کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کی معیاری تعلیم سے مزین اور مسلح ہوتے تھے۔ لیکن آج صورتِ حال میں تھوڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ آج اردو کی معیاری تعلیم تو ہے ہی نہیں ساتھ ہی ان کے پاس صحافت کی تربیت بھی نہیں ہے۔ صحافتی اصول سے نا آشنائی کے سبب ان صحافیوں کے ذریعہ لکھی ہوئی خبریں معیار اور استناد حاصل نہیں کر پاتی۔ فی زمانہ اردو اخبارات میں تربیت یافتہ افراد کا زبردست بحران ہے۔ تربیت سے میری مراد محض صحافتی کورس نہیں، بلکہ خبروں کے انتخاب، ترتیب، خبر نگاری، سرخی اور ذیلی سرخی لگانا، ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ اور دیگر تکنیکی چیزوں کی عملی تربیت ہے۔ ان چیزوں کو بہر حال سیکھنا تو پڑتا ہی ہے تا کہ کام بہتر طور پر انجام پا سکے۔ ساتھ ہی اردو اخبارات سے جڑے لوگوں کو انگریزی اور ہندی زبانوں کا بھی اچھا علم ہونا چاہیے تا کہ خبروں کے تراجم میں مسئلہ پیدا نہ ہوں۔ آج کل مدرسہ کے فارغین جو اردو اخبارات میں کام کر رہے ہیں انھیں اردو اور کمپیوٹر کا علم تو ہوتا ہے لیکن ان میں سے اکثر انگریزی اور ہندی سے نابلد ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے انھیں کام کے دوران دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس کے لیے حکومت کی جانب سے یا اخبار کی جانب سے بہار اردو اکیڈمی، بڑے مدارس اور دیگر اداروں میں انگریزی اور ہندی زبان کی تعلیم اور صحافتی تربیت دی جانے کی اشد ضرورت ہے۔ دوسری جانب اسکولی نظامِ تعلیم سے فارغ شدہ چند افراد کو اردو زبان سے متعلق بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قومی سطح کے ادارہ IIMC میں حکومتِ ہند انگریزی اور ہندی کے بعد اب اردو میں بھی صحافتی تربیت کے کورس شروع کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے جسے

مستحسن قدم قرار دیا جاسکتا ہے۔لیکن عام طور پر اس کے فوائد بڑے شہروں میں ہی حاصل ہو پاتے ہیں۔اخبارات میں خبروں کے حصول کے جو ذرائع ہیں یعنی اخباری نمائندے وہ اس طرح کی چیزوں کی برکتوں سے مستفید نہیں ہو پاتے ہیں۔جس سے حالات ویسے ہیں رہ جاتے ہیں۔

اردو صحافی کے مسائل: اردو صحافی کا مسئلہ بہار کی اردو صحافت کا مسئلہ ہے۔اردو صحافیوں کو بہت ساری مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔جس میں سب سے بڑا مسئلہ مالی ہے۔اکثر اخبارات میں رپورٹروں اور معاون ایڈیٹروں کو بہت کم تنخواہ دی جاتی ہے۔عام طور پر ایک معاون ایڈیٹر کو 7 سے 8 ہزار روپے ملتے ہیں۔وہیں ایک دو اخبار کو چھوڑ کر رپورٹر کو کہیں کوئی تنخواہ ہی نہیں ملتی۔صرف انھیں خبر کے حساب سے فیکس بل اور سفری بھتے دے دیے جاتے ہیں۔ایسے میں ان سے اچھے کام کی امید کیوں کر کی جاسکتی ہے۔ہاں اشتہارات دینے کی صورت میں کچھ فیصد کمیشن کے نام پر ضرور مل جاتے ہیں۔کیا اس قلیل آمدنی میں کوئی عزت کی زندگی گزار سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ دوسری جگہ میں اضافی کام کرتے ہیں۔البتہ روزنامہ راشٹریہ سہارا اور بہار کے نئے اخبار انقلاب میں صحافیوں کو تنخواہ قدرے بہتر مل رہی ہے۔مثلاً انقلاب میں ایک سب ایڈیٹر کی تنخواہ 12 ہزار روپے، نمائندہ کی تنخواہ 8 ہزار روپے اور جز وقتی اسٹنگر کی تنخواہ 3 ہزار روپے ہے۔لیکن کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس گرانی کے دور میں یہ تنخواہ بھی خوشحال زندگی کے لیے ناکافی ہے۔اسی وجہ کر بھی صلاحیت مند افراد اس جانب توجہ نہیں کرتے۔اور اس میدان سے صرف ویسے ہی افراد جڑتے ہیں جسے زبانِ اردو سے محبت ہو یا پھر ملی جذبے سے سرشار ہوں۔تربیت یافتہ پروفیشنل اردو اخبار کی جانب رخ نہیں کرتا۔اخبار کے مالکان کو چاہیے کہ اپنے قلب کو تھوڑا وسیع کریں اور اخبار سے جڑے لوگوں کی تنخواہ کو کم از کم معیاری سطح تک ضرور لائیں۔

صحافیوں کا دوسرا سب سے بڑا مسئلہ ہے ان پر کام کا بوجھ۔اردو اخبارات میں ضرورت سے بہت کم افراد ہوتے ہیں، جس سے کام کر رہے لوگوں پر اضافی بوجھ پڑتا ہے۔روزنامہ راشٹریہ اور انقلاب میں صحافیوں کی تعداد ٹھیک ہے، لیکن وہیں قومی تنظیم میں افراد ضرورت سے تھوڑا کم

ہیں۔دیگر چھوٹے اخبارات میں انسانی وسائل کی زبردست کمی ہے۔کام کی کثرت بھی معیار میں گراوٹ کی بہت بڑی وجہ ہے۔نیز صحافیوں کو ہفتہ کی چھٹی بھی نہیں ملتی جس سے ان میں کام کے تئیں دلچسپی بھی دھیرے دھیرے کم ہونے لگتی ہے اور وہ کام کو بوجھ خیال کرنے لگتے ہیں۔حد تو یہ ہے کہیں کہیں ماہ میں ایک دو دن کی غیر حاضری پر تنخواہ میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔ایسی صورت میں کام سے عدم دلچسپی فطری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے صحافیوں کی دلچسپی، تجربہ پسندی، تخلیقیت دھیرے دھیرے معدوم ہونے لگتی ہے۔

اردو عوام کا نظریہ: اردو عوام کو ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ اردو اخبارات معیاری نہیں ہوتے اور ان میں اطلاعات ناقص ہوتے ہیں۔بسا اوقات کچھ لوگ کہتے ہیں فلاں فلاں اخبارات میں املا کی غلطی تھی۔فلاں میں یہ خبر غلط تھی۔یہ خبر پرانی تھی وغیرہ۔یہ غلط فہمیاں ہیں۔معاملہ یہ ہے کہ انگریزی اور ہندی اخبارات میں دی گئی اطلاعات بھی ہمیشہ استناد کا درجہ نہیں رکھتی۔ہر صحافی کے خبر پیش کرنے کا مقصد، نظریہ انداز الگ الگ ہوتا ہے۔یہاں تک کہ ہر اخبار کی ترجیحات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ایسے میں اگر انگریزی اور ہندی اخبارات کا موازنہ اردو اخبارات سے کرتے ہیں اور اُن اخبارات کی ظاہری چمک سے اگر کوئی شخص متاثر ہوتا ہے تو یہ مسئلہ اردو اخبار کا نہیں بلکہ اُس کی ذہنیت کا ہوتا ہے۔ساتھ ہی مجھے یہ بھی کہنے میں کوئی گریز نہیں کہ زبان کی غلطیوں کی جس سہل اندازی سے اردو اخبار کے قارئین شکایت کرتے ہیں، انھیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ انگریزی اور ہندی اخبارات میں بھی یہ غلطیاں ہوتی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان غلطیوں تک ہماری رسائی متعلقہ زبان کی کم علمی کی وجہ کر نہیں ہو پاتی ہے۔لوگوں کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ اخبار کی ضخامت دیکھ کر بھی اخبارات خریدتے ہیں۔گو کہ زیادہ ضخیم اخبار کا معیار بہتر ہو یا نہ ہو۔مثلاً اگر ہندی اخبار 5 روپے میں اگر 32 پیج کا اخبار دے رہا ہے اور اردو اخبار صرف 18 پیج دے رہا ہے تو عوام ہندی اخبار خریدنا چاہیں گے۔اردو عوام کی بخالت کی وجہ کر اخبارات کی قیمت بھی بہت کم رکھنی پڑتی ہے، جس کی وجہ سے خسارہ ہوتا ہے۔اگر ہندی اور انگریزی اخبارات کی

طرح اردو کے اخبار کی قیمت بھی رکھ دی جائے تو اخبار کا سرکولیشن اور بھی کم ہو جائے گا۔

فی الحال تو صورتِ حال اتنی مایوس کن بھی نہیں ہے کیونکہ بہار میں قومی تنظیم، روز نامہ راشٹریہ سہارا اور انقلاب جیسے اخبارات پابندی اور اپنی پوری آب وتاب سے شایع ہورہے ہیں۔ ان اخبارات کے آن لائن ایڈیشن بھی ہیں جس سے بہار کے لوگوں کو بہار سے باہر بھی اپنے ریاست کی خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔لیکن اگر ہم اردو اخبارات کو دیگر زبان کے اخبارات کے ہم پلہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر سطح پر اپنے صحافتی انداز میں تبدیلی لانی ہوگی۔ساتھ ہی اپنی سوچ میں بھی تبدیلی لانی ہوگی۔اقلیتی مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر عوامی مسائل کو بھی پیش کرنا ہوگا۔اخبارات میں خبروں اور ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنس، خواتین، کیریئر اور عام معلومات سے متعلق فیچر صفحات شامل کیے جانے کی ضرورت ہے۔صحافت کے بنیادی اصول سچائی اور ایمانداری کو ہمیں اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا چاہیے، کیونکہ اردو صحافت ہمیشہ سے صداقت کی علم بردار رہی ہے۔اردو کے صحافیوں کی مالی اور دیگر دشواریوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔یہ کام اخبار کے مالکان ہی کر سکتے ہیں۔انھیں اس جانب توجہ دینی چاہیے۔انگریزی اور ہندی اخبارات جیسی کشش اور تنخواہ دیے بغیر اردو صحافت کی جانب نوجوان صحافیوں کو راغب نہیں کیا جاسکتا۔ساتھ ہی اشتہارات کے حصول کے لیے واضح لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے۔اردو اخبارات کو درپیش مسائل ایک نہایت طویل موضوع ہے۔یہ موضوع تحقیق طلب ہے اور اس پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہے۔ظاہر ہے اس کے لیے یہاں موقع نہیں ہے۔اس لیے مسائل کی جانب محض اشارات کیے گیے ہیں۔

(محمد عبدالرحمٰن ارشد، ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

☆☆☆

سمی اقبال

چندر بھاگا ہاسٹل جے این یو، نئی دہلی

کلام حیدری کی اداریہ نگاری

(''مزامیر'' کے خصوصی حوالے سے)

کلام حیدری کا نام اردو ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔کلام حیدری اپنے عہد کا ایک ایسا نام ہے جو اپنی حق گوئی، جرأت مندی، بے باکی اور صاف گوئی کے لئے پہچانا جاتا ہے۔بے جھجک سچ بولنا، سامنے والے کی حیثیت سے مرعوب ہوئے بغیر صداقت کو اجاگر کرنا انھیں ان کے ہمعصروں سے منفرد کرتا ہے، دوسری طرف یہی صاف گوئی اور حق پرستی انھیں سعادت حسن منٹو سے قریب تر کر دیتی ہے۔کلام حیدری نے بھی ذاتی زندگی کے ساتھ ادبی اور صحافتی میدان میں بھی اپنی سچائی کا پرچم کبھی جھکنے نہیں دیا۔خواہ کبھی ملک کے وزیر اعظم سے ہی انھیں سابقہ کیوں نہ پڑا ہو، انھوں نے ذاتی مفاد کے لئے کسی فریق کو خوش کرنے کا طریقہ کبھی بھی اختیار نہیں کیا۔ہمیشہ حقیقت پسندی پر قائم رہے، کسی کی خوشی اور ناخوشی کے لئے اپنی زبان کبھی نہیں کھولی، جب بھی اپنی زبان کو جنبش دی حق کی پیروی کی۔جس سے ان کی بے خوفی اور ایمانداری کا پتہ چلتا ہے، دراصل یہی وہ ایمانداری اور بے خوفی اور بے لوث خدمت کا جذبہ ہے جو انھیں ایک کامیاب صحافی کی صف میں شامل کرتی ہے۔کلام حیدری ایک کامیاب افسانہ نگار اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مبصر اور مترجم بھی تھے، اور ان کے تبصرے و اداریے کو دیکھ کر یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ناقد کی اہلیت بھی رکھتے تھے۔ان کے ادبی اداریوں سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔''نغمہ ونور'' ''مورچہ'' اور ماہنامہ ''آہنگ'' سے ان کی کامیاب صحافت کا بخوبی علم ہوتا ہے۔یہ کلام حیدری کی پائیداری اور استقامت ہی تھی کہ نامساعد حالات میں بھی انھوں نے ''آہنگ'' کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کے معیار واوزان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔جبکہ 'مزامیر' کے مطالعے سے یہ علم ہوتا

ہے کہ اس عہد میں یک بعد دیگرے کئی نامور رسالوں کی اشاعت بند ہو رہی تھی۔اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسیوں کے باوجود بھی ''آہنگ'' اسی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا۔وقت اور حالات کے تھپیڑے سے کلام حیدری نے اس رسالے کو تحفظ عطا کیا۔یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا، اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے تو اس کی ایک اہم وجہ ان کی سیرت کی وہ خوبیاں ہی تھیں جو ان کے دھن اور عزم و استقلال کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوئیں۔

کلام حیدری کی ذاتی زندگی سے متعلق سرسری طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موصوف کی جائے پیدائش تو ضلع مونگیر (بہار) ہے۔ابتدائی تعلیم انھوں نے قصبہ جلیسر، موضع ایٹہ (یو پی) میں اپنے نانا کی نگرانی میں پوری کی۔میٹرک کا امتحان پٹنہ سے پاس کیا اور گریجوایشن رانچی کالج سے مکمل کی۔ایم۔اے کے لئے ایک بار پھر پٹنہ تشریف لے گئے اور وہاں اردو میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ایم۔اے کے فوراً بعد پورنیہ کالج میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے۔بعد میں گیا کے ایک مشہور ڈاکٹر کی صاحبزادی سے شادی ہوگئی۔سسر نے انھیں صنعت کاری کی طرف راغب کیا تو استعفیٰ دے کر وہ نوکری سے علاحدہ ہو گئے۔اس دوران ادبی سرگرمیاں کم ہو گئیں مگر صنعت کاری، ان کے اندر کے فنکار کو مارنے میں ناکام رہی۔رفتہ رفتہ وہ ادبی سرگرمیوں میں جی کھول کر حصہ لینے لگے۔۱۹۶۶ میں گیا سے ہی ماہنامہ ''آہنگ'' جاری کیا۔اس رسالے کے توسط سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔رسالہ ''آہنگ'' کے اجرا کے متعلق کلام حیدری صاحب نے لکھا ہے:

آہنگ کوئی منصوبہ بند رسالہ نہیں ہے۔اس لئے کہ دہلی یا بمبئی کی جگمگاتی، چکا چوند کر دینے والی ان روشنیوں سے محروم ہے جو اندھیروں کو دور کرنے سے زیادہ خود اپنی روشنی کا مظاہرہ کرتی ہیں........

''آہنگ'' قصباتی اندھروں سے لڑنے اور لڑکھڑا کر پھر لَو کو تیز کرنے والا ایک دیا ہے، جسے ایک ادبی فقیر نے اس لئے جاری کر رکھا ہے کہ ادب کے شہنشاہوں کی مملکت میں فقیر نہ ہو

تو ادب تپسیا سے محروم رہ جائے گا۔''آہنگ'' ایک تپسوی کی تپسیا ہے، جس کے آگے خود تپسیا ہی ایک مقصد ہے، باقی سب دنیا ہے۔خدا ساری دنیا کو روشن رکھے۔ا

کلام حیدری کی ذاتی زندگی پر اسلامی احکامات کا رنگ کتنا گہرا تھا اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تو نہ تھے، اور نہ ہی ظاہری وضع قطع سے کٹر مسلم نظر آتے تھے۔یہ ضرور ہے کہ دل کے صاف تھے جو ایک سچے مسلمان کی خوبی ہے۔وہ ایک مخلص انسان تھے، رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اہل بیت خصوصاً حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ زہراؓ اور حضرت حسینؓ سے انھیں گہری عقیدت تھی۔اسے وہ اپنے ایمان کا ہی ایک جز تصور کرتے تھے۔شخصی اعتبار سے یہ بہت ہی فعال واقع ہوئے تھے۔خوش مزاجی ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔جب بھی محو گفتگو ہوتے اپنی خوبیٔ گفتار سے لوگوں کا دل موہ لیتے۔خوش دلی اور سنجیدگی سے لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے۔علمی مباحث میں بھی آداب گفتگو کو ملحوظ رکھتے تھے، رنج و غصے کا اظہار بھی بہت سلیقے سے کرتے تھے۔خدا نے انھیں بے مثال تقریری صلاحیت عطا کی تھی۔زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔کسی بھی موضوع پر مکمل گرفت تھی اس لئے بے حد تسلسل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ان کی باتیں منطقی دلائل سے عاری نہیں ہوتی تھیں، ان کی زبان و بیان میں فصاحت و بلاغت کا بھی بڑا زور ملتا ہے۔ان کی بے باکی اور بے خوفی کی ایک مثال یہاں پیش کرنا لازمی سمجھتی ہوں تا کہ ان کے اندر بیٹھے ہوئے مدیر کی شخصیت بے نقاب ہو سکے۔واقعہ یہ ہے کہ 'اردو گھر' کی افتتاح کے موقعے پر لوگوں نے ہندوستان کے وزیر اعظم مرار جی دیسائی کو مدعو کیا تھا۔مرار جی جلسے میں شریک ہوئے اور کسی قدر برہم ہوتے ہوئے فرمایا کہ جب 'اردو گھر' کی افتتاح کا معاملہ تھا تو انھیں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ جب وزیر اعظم کی تقریر اختتام پذیر ہوئی تو کلام حیدری صاحب نے اپنی بے لاگ تقریر پیش کی جس میں یوں فرمایا:

انھوں نے مرار جی دیسائی کو 'اردو گھر' کے افتتاح پر دعوت نہیں دی ہے بلکہ ہندوستان کے پرائم منسٹر کو بلایا ہے، جو سیکولر ہوتا ہے اور ہندوستان کے سیکولر کنسٹی ٹیوشن کا رکھوالا ہوتا ہے۔وہ ان تمام زبانوں کا محافظ ہوتا ہے جو ہندوستان کا تہذیبی سرمایہ ہیں۔ لہٰذا 'اردو گھر' کے افتتاح پر

وزیراعظم کو برہم نہیں ہونا چاہئے، ورنہ ہم اردو والوں کے ووٹ کی بھی قیمت ہے جو آئندہ الیکشن میں طے کرنے کو کافی ہے کہ ہندوستان کا وزیراعظم جو بھی ہوگا سیکولر ہوگا۔ ۲

کلام صاحب ملنسار اور مجلسی آدمی تھے۔ان کے دوست واحباب کا حلقہ وسیع تھا۔اردو ادب سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔کلام صاحب ان کے اعزاز میں جلسے، سیمینار، مشاعرے اور ادبی شاموں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔پہلی جنوری کا دن ''کلچرل اکیڈمی'' کی ادبی میٹنگ کے لئے مخصوص تھا۔حسن نعیم، غیاث احمد گدی، احمد یوسف اور بزرگوں میں سہیل عظیم آبادی جیسی عظیم شخصیات کا قیام اکثر ان کے دولت خانے ''رینہ ہاؤس'' میں ہوتا تھا۔ان کے قیام سے موصوف خاص قسم کی طمانیت محسوس کرتے تھے۔کلام صاحب ایک زندہ دل انسان تھے۔حاضر جوابی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔عنوان چشتی کے متعلق ایک واقعہ ہے جس سے ان کی حاضر جوابی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے گا۔ ہوا یوں کہ ۱۹۸۱ میں 'بہار اردو اکادمی' کے زیر اہتمام حسرت موہانی پر ایک سیمینار منعقد ہوا۔عنوان چشتی نے مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ان کے مضمون میں حسرتؔ کی جگہ بار بار مولانا حالیؔ کا ذکر آنے لگا۔جب پہلی بار حسرتؔ کی جگہ حالیؔ کا نام آیا تو کلام صاحب نے ٹوکا ''حالیؔ نہیں حسرتؔ''، عنوان صاحب کچھ نہ بولے پڑھنا جاری رکھا۔پھر نام آیا ''حالیؔ''، کلام صاحب نے پھر کہا ''حسرتؔ''، اس بار کچھ لوگ مسکرائے بھی۔ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا بھی، لیکن تیسری بار بھی عنوان صاحب نے حسرتؔ کی جگہ حالیؔ ہی پڑھا۔اس بار کلام صاحب نے کھڑے ہو کر کہا ''عنوان صاحب! آپ بار بار حسرتؔ کو حالیؔ کیوں کہہ رہے ہیں''، عنوان صاحب پل بھر کے لئے خاموش رہے پھر بے حد کرخت لہجے میں بولے '' آپ بیٹھیے Sit Down اور سن لیجئے کہ جہاں جہاں میں مولانا حالیؔ کہوں وہاں وہاں آپ سب لوگ حسرتؔ سمجھیں''۔کلام صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔نہایت خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ بہر حال عنوان صاحب نے مقالہ ختم کیا اور تبصرے کا دور شروع ہوا۔سب سے پہلے کلام صاحب اٹھے، انھوں نے نہایت متانت و سنجیدگی سے کہا '' ابھی آپ نے جناب عنوان چشتی سے ان کا مقالہ سنا۔انھوں نے چشتی کے 'چ' کو پیش کے ساتھ ادا کیا اور بار بار کسی نہ کسی عنوان سے چُشتی نے کہا چُشتی صاحب نے فرمایا

دہرانے لگے۔چشتی صاحب غصے میں کھڑے ہوئے اور فرمایا '' حضرت! پہلے آپ اپنا تلفظ تو درست کر لیں تب تقریر کریں گے۔ کلام صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے حضرات! میں جہاں جہاں ''چُشتی''، کہوں آپ ''چشتی''، سمجھئے گا۔

یہی جرأت مندی، بے خوفی، صاف گوئی، ایمان داری اور خوش سلیقگی ان کے اداریوں میں نظر آتی ہیں۔دراصل اخبارات و رسائل نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں گوناگوں خدمات پیش کی ہیں، ان میں بھی خصوصی طور پر اداریوں کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔ رسائل میں ادبی اداریے کو شروع سے ہی جگہ ملتی رہی ہے۔تمام رسائل نے اداریوں کے توسط سے مدیر کے خیالات، ادبی رجحانات و ادبی مسائل پر بے لاگ اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ایسے اداریوں میں صحت مند عصری ادبی بحثیں موجود ہیں جو نئی نسل کے لئے بھرپور مواد فراہم کرتی ہیں۔ان اداریوں میں یا تو کسی ادبی نکتہ کو موضوع بحث لایا جاتا ہے یا ادب کی دنیا میں واقع ہونے والے کسی حادثے پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔وہ رسائل جو سرکاری سطح کے ہیں ان کے اداریے میں عام طور سے سرکار یا حکومت کی ترقیاتی و فلاحی اسکیموں کی تشہیر کی جاتی ہے۔حکومت کے ہر اقدام کی بجا تعریف و توصیف ان کے لئے لازمی ہے۔اسی طرح ملک کے سیاسی نظام کی مدح سرائی بھی ان اداریوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ان دنوں 'اردو دنیا' ایسا ہی ایک سرکاری رسالہ ہے جس کے اداریے میں سرکار کی پالیسیوں کا اعتراف بھی ملتا ہے اور سرکار کے ہر قدم کو سراہا جاتا ہے۔ ماضی کی اسکیموں سے لے کر حالیہ اسکیموں کا بھی یہ معترف نظر آتا ہے۔کچھ ایسے رسالے بھی ملتے ہیں جن میں اداریے کا اہتمام نہیں ہوتا ہے۔لیکن اس کی جگہ کوئی نہ کوئی مستقل کالم ضرور موجود ہوتا ہے۔

مجلّات کی اداریہ نگاری نہایت ہی مشکل فریضہ ہے۔اس فریضہ کو بہتر طور پر وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو ایک عرصے سے رسائل کی دنیا سے منسلک رہا ہو۔جس کا مشاہدہ عمیق اور تجربہ وسیع ہو۔جو حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز کرنے کا اہل ہو۔اس ضمن میں مدیر (اردو بک ریویو) محمد عارف اقبال اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

اداریہ نگاری درحقیقت حالات کی نبض پر انگلی رکھنے کے مترادف ہے اور اداریہ نگار ایسا

نباض ہوتا ہے جو وقت کے دھارے کی سمت کو جانتا ہے۔ وہ شر اور خیر کے تمام اجزا سے اس طرح واقف ہوتا ہے جس طرح ایک عام انسان دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں تمیز کرتا ہے۔ اور اداریہ نگار شر کے اندر داخل خیر اور خیر میں شر کے اجزا کو بخوبی محسوس کرتا ہے۔۳

دراصل صحافت کا دوسرا نام ہی صداقت اور دیانت داری ہے۔ کوئی اداریہ نویس اس طرح کے اداریے تحریر نہیں کرسکتا جس میں کسی کی دل شکنی کی گئی ہو یا وہ اپنی ذاتی پرخاش کی مثالیں پیش کر کے اداریے کی روح کو فنا کرنے کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ کوئی بھی ہوش مند مدیر اداریہ نویسی کے اصولوں کو طاق پر رکھ کر ذاتی پسند اور ناپسند کی بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ غضنفر اقبال نے لکھا ہے:

اداریہ نگار ایک ذمہ دار شخص ہوتا ہے۔ اس کی تحریر میں اشتعال انگیزی کی بجائے نرمی ہو اور وہ لعن طعن سے اجتناب کرے۔ اداریوں میں کسی کی کردار کشی اور شخصیت کشی نہ کی جائے بلکہ اس کی خامیوں اور برائیوں کو احسن انداز میں ظاہر کیا جائے تاکہ ٹھیس نہ لگے آبگینوں کو۔ اداریہ نگار ایسی حرکت نہ کرے جس سے کہ اخبار کا وقار متاثر ہو۔ کسی بھی اخبار یا رسالے کو اعتبار کا درجہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب وہ قلم کو امانت سمجھے اور اس کا استعمال تعمیری سطح پر کرے۔۴

خالد محمود کے زیر نظر اقتباس سے اداریہ نویسی کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے:

اداریہ کا مقصد کسی خاص اور اہم موضوع پر اخبار کا نقطۂ نظر واضح کرنا، اپنے قارئین کو سمجھانا، اضافی معلومات فراہم کرنا اور انھیں اپنا ہم خیال بنانا ہوتا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے سنجیدہ متین اور مدلل گفتگو ہی حصول مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ہوتی ہے۔۵

خالد محمود صاحب کی اس رائے سے اداریہ نگاری کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔ دراصل مذکورہ سطور خاص طور سے اخباری اداریے کے لئے لکھا گیا ہے مگر یہی مقصد مجلّے کے اداریہ نویسی پر بھی صادق آتا ہے۔ گیا سے کلام حیدری کی نگرانی میں جاری ہونے والا ماہنامہ ''آہنگ'' میں ایک معیاری رسالے کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ باوجود اس کے یہ رسالہ ان سب میں نمایاں اس لئے بھی ہے کہ اس رسالے نے اردو ادب کے نئے شائقین اور نئے تخلیق کاروں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی ہے۔ کلام حیدری ان کی تخلیقات پر نظر ثانی کرتے اور جہاں اصلاح کی گنجائش ہوتی وہاں ایک

شفیق نگراں اور محسن کی طرح رہنمائی کرتے۔ وہ تخلیق کار جو آج اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرچکے ہیں ان پودوں کی آبیاری خود کلام حیدری کے چمن یعنی ''آہنگ'' میں ہوئی ہے۔ ابتدائی مرحلے میں ''آہنگ'' نے ہی ان نوزائیدہ فنکاروں کو سہارا دیا اور انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ اس لئے بہار کے وہ افسانہ نگار جنھیں افسانہ نگاری کی دنیا میں آج قومی حیثیت حاصل ہے وہ اس رسالے کے احسان کو فراموش نہیں کرسکتے۔

اس مضمون میں، میں نے کلام حیدری کی اداریہ نگاری کو 'مزامیر' کے خصوصی حوالے سے زیر بحث لایا ہے اس لئے کلام حیدری کی اداریہ نگاری پر بات شروع کرنے سے قبل ''مزامیر'' کے تعلق سے نوشابہ حق کی زبانی چند سطور پیش کرنا لازمی سمجھتی ہوں:

میں نے 'آہنگ' سے صرف ان ہی تحریروں کو 'مزامیر' کے عنوان سے خود کلام حیدری نے ادبی موضوعات پر لکھے، جمع کردیا ہے اور تاریخیں اس لئے دے دی ہیں کہ ہر تحریر کا عقبی منظر بھی قارئین کے سامنے رہے۔۶

''مزامیر'' میں جن مضامین کو مع تاریخ ترتیب دیا گیا ہے وہ خالص ادبی ہیں یا ادب کی دنیا کو متاثر کرنے والے ہیں۔ اس میں جو مضامین شامل ہیں وہ اگست ۱۹۷۰ سے لے کر ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ کی تحریر کردہ ہیں۔ آٹھ برسوں پر مشتمل کلام حیدری کی ادبی تحریروں کا یہ مجموعہ محض ۹۵ صفحات پر مبنی ہے۔ اس اختصار کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے نہایت ہی کفایت لفظی سے کام لیتے ہوئے ٹھوس باتوں پر ہی اپنی ذہانت صرف کی ہے۔ یہ ان کا تخلیقی معیار ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر کسی بحث کو طول نہیں دیتے اور نہ ہی لفاظی سے کام لیتے ہیں۔ صاف جملے میں ایجاز واختصار کے ساتھ اپنے خیالات کو بنا کسی سے مرعوب ہوئے اپنی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ''مزامیر'' میں شامل چھوٹی چھوٹی تحریروں سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کلام حیدری نے جو کچھ 'مزامیر' میں تحریر کیا ہے، اس میں ان چند باتوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے کہ سماج کے تئیں اخبارات اور رسائل کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ ان کی ایک بڑی ذمہ داری عوام کو نقصان پہنچانے والی اشیا کی نشاندہی کرنا ہے۔ ان تمام سرکاری اور غیر سرکاری پالیسیوں کو اجاگر کرنا جن سے عوام کو نقصان لاحق پہنچتا ہے یا نقصان

پہنچنے کا امکان ہوتا ہے۔عوام کے درمیان راہ پانے والی بری اور منفی روایات پر چوٹیں کسنا اور عوام میں رائج شدہ بری عادتوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہے۔عصری زندگی کی ان تمام خرابیوں کو مٹانے کی بھرپور کاوش کرنا ہے جو عصری ماحول میں افسردگی اور انتشار و اضطراب کا زہر گھولتے ہیں۔جہالت کے خاتمے سے لے کر مثبت قدروں کو عام کرنے تک اور ایک معیاری زندگی جینے کا سلیقہ سکھانے سے لے کر ایک ذمہ دار شہری بننے تک کا گر سکھانا ان کا فریضہ ہے۔ہر زمانے میں ان اخبارات ورسائل نے عوام میں بیداری لانے کا نیک اور مثبت کام انجام دیا ہے۔اور ایک مخصوص طبقے میں علمی وادبی ذوق کو پروان چڑھایا ہے۔کلام حیدری ایک صحافی کی حیثیت سے ان ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔انھوں نے بھی ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا اور اسے بخوبی نبھایا ہے۔''مزامیر'' کے حوالے سے اگر ہم اس جانب نگاہیں مرکوز کریں تو ہمیں یہ علم ہوگا کہ ادبی دنیا میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو کلام حیدری نے کبھی برداشت نہیں کیا اور نہ ہی اسے رواروی میں نظر انداز کیا ہے بلکہ بہت ہی سنجیدگی سے ان مسائل پر غور وخوض کرنے کے بعد ایک متوازن رائے پیش کی ہے جو ہر کسی کے لئے مفید ومنافع بخش ہے۔

کلام حیدری نے ''مزامیر'' کے ان چند صفحات میں اردو ادب سے لے کر عالمی ادب کے معیار واقدار پر بھی بہت ہی جامع اور بے لاگ گفتگو کی ہے۔اردو ادب کو کم اہمیت دینے اور مغربی ادب سے مرعوب ہونے والوں پر نہایت ہی ایجاز واختصار میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ان کے خیال میں پورا عالمی ادب بشمول اردو ادب تخلیقی اور تنقیدی رجحانات کی رنگا رنگی نظر آتی ہے۔لیکن باوجود اس نیرنگی کے ہماری تنقید ایک ہی محور کے گرد طواف کرتی رہی ہے۔فکشن کی تنقید کے سلسلے میں ناقدین اردو ادب کو اس جانب توجہ دینی چاہئے، بقول کلام حیدری:

اردو ہی نہیں انگریزی میں بھی فکشن پر جو تنقیدیں ہیں، وہ مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے کم ہیں، اور دراصل فکشن پر تنقید کا نہ تو کوئی طریقہ یا ضابطہ وجود میں آسکا ہے، اور نہ کوئی اصول مرتب ہوسکا ہے،.......۷

............جب مغربی ادب کے ایسے اعترافات موجود ہوں، تو ہم اردو والے، جو ہر

بات کے لئے مغرب کی پناہ تلاش کرتے ہیں، کہاں تک اس فرق کو سمجھنے کی تمیز رکھتے ہوں گے کہ افسانوی ادب کی تنقید کو کس حد تک اور کس طور پر شاعری کی تنقید اور معیار سے الگ کریں۔۸

''مزامیر'' کے ہی کسی صفحے میں کلام حیدری صاحب نے ایک نپی تلی بات یہ کہی ہے کہ ایشیائی ادب کو پورا عالمی ادب اور خصوصاً مغربی ادب قابل اعتنا نہیں سمجھتا، تو ہم کیوں غالب اور اقبال جیسے اردو کے عظیم اور بلند قامت شعرا کے لئے دنیائے ادب میں جگہ تلاش کرتے پھرتے ہیں۔دراصل کہیں نہ کہیں یہ ہم اردو والوں کی احساس کمتری ہے جو ہمیں باہر کی طرف جھانکنے پر مجبور کرتی ہے اس لئے اسے ترک کرنے میں ہی سب کی عافیت ہے۔

کلام حیدری نے جب اپنے گردو اطراف میں نئے لکھنے والوں کی عجلت پسندی اور جلد از جلد ترقی کے زینے طے کرنے کی خواہش کو محسوس کیا تو 'مزامیر' کے خانے میں چند سطور لکھ کر انھیں تنبیہ کی۔بنیادی طور پر وہ نمائشی سطح پر کی جانے والی ہر کوشش کے مخالف تھے۔اور ادبی دنیا میں نمائش پسندی کے بڑھتے اس رجحان کو وہ خاموشی سے برداشت کر کے ادبی جرم کے مرتکب نہیں ہوسکتے تھے۔اس لئے انھوں نے ہر نئے لکھنے والوں کو صبر وتحمل اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور ایک بزرگ ادیب کی حیثیت سے ادب کے نونہالوں کو عجلت پسندی ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہیں.....

ادب میں بھی آج اسی عجلت پسندی کا مظاہرہ ہورہا ہے۔قلم ہاتھ میں لیا اور کرشن چندر، جمیل مظہری، بیدی، اختر الایمان، فیض، رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، کلیم الدین احمد اور منٹو بن جانے کی عجلت میں مضحکہ خیز باتیں کر کے عجیب اور اہم بننے کی سعی کرنے لگے، ....اختراع، تخلیق، دریافت اور اقدار کی تخلیق سچے فنکار کے لئے ضروری ہے، لیکن عجلت ان سب کی دشمن ہے۔ ۹

ادب کی دنیا میں عجلت پسندی، نمائش پرستی اور مقبول ومعروف بننے کی چاہت ایک ایسا نکتہ ہے جسے کلام حیدری نے اس زمانے میں ہی محسوس کیا تھا اور اپنی تحریروں کے توسط سے ان ادیبوں کی اصلاح اور ادب کی دنیا میں ایک غلط اور نقصاندہ روایت کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے سے روکنے کی سعی شروع کر دی تھی۔یہ اور بات ہے کہ آج ہمارے دور میں بھی ایسے ادیبوں کی ایک

خاصہ تعداد موجود ہے جو ایک ہی جست میں ترقی کے تمام زینے طے کر لینا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ان لوگوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ خود نمائی اور خود ستائی جیسے غیر اخلاقی فعل سے بھی گریز نہیں کر پاتے۔ آج کے بڑے بڑے قابل اعتبار فنکار بھی اپنی فطری شہرت اور مقبولیت سے مطمئن نہیں ہیں اور عدم تسکین کے عالم میں وہ ایسی کارگزاریاں کر بیٹھتے ہیں جو کلام حیدری جیسے ایماندار صحافی کی روح کو تکلیف میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ کلام حیدری اس بات کے قائل تھے کہ ہمیں اپنا کام پوری سچائی اور ایمان داری سے کرنا چاہئے، اس کام کا صلہ پانے کے لئے جدو جہد کرنا فعل عبث ہے۔ کیوں کہ وقت سب سے بڑا پارکھ ہے اور ہمارے درمیان مرزا اسد اللہ غالب کی مثال موجود ہے۔ یہ ان کے کارناموں کا صلہ ہی ہے کہ صدیوں بعد بھی وہ ہماری گفتگو کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے، شہرت اور مقبولیت کے خرید و فروخت پر انگشت نمائی کی ہے اور ادیبوں کو مخلص اور صابر بنے رہنے کی ہدایت کی ہے۔

ہمارے ملک میں اردو زبان نے ایک دور ایسا بھی دیکھا ہے جب اس کی پہچان یعنی رسم الخط کو مٹانے کی کچھ لوگ وکالت کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں میں اردو کے ادبا و شعرا بھی شامل تھے۔ ایسے عالم و فاضل افراد بھی انتہا پسندی کے شکار ہو رہے تھے جب اردو کی پہچان خطرے میں تھی۔ اردو کے قلم کے سپاہیوں نے ہی اردو کی شناخت کو مسخ کرنے کا مشورہ دیا تو اس سے زیادہ بد قسمتی کی بات اردو کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی، لوگ ذاتی مفاد کے لئے قومی مفاد کو بے دریغ قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس ضمن میں بھی کلام حیدری نے اپنی انصاف پسندی کا ثبوت دیا اس امر میں ان کی رائے تمام متعصّبانہ ذہنیت سے پاک نظر آتی ہے۔

اردو کے بعض ادیب و شاعر اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط اختیار کر لینے کی وکالت زیادہ تندی کے ساتھ کرتے ہیں۔......رسم الخط کی اصلاح اور ترقی ہونی چاہئے دیوناگری اختیار کر لینے پر بحث ہونے کا کیا حاصل؟......اردو کو رسم الخط کے ساتھ زندہ رہنے، ترقی کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت کا جمہوری حق حاصل ہے۔.....اردو کا نام 'اردو' اس کے رسم الخط کے ساتھ ہے۔۱۰

کلام حیدری اردو اکیڈمیوں اور اردو کی انجمنوں سے بھی عاجزی اور انکساری کے ساتھ التجا کرتے

ہیں کہ اردو دانوں کی تیزی سے گھٹتی ہوئی تعداد کو بڑھانے کی کوشش پہلے ہونی چاہئے، کیوں کہ اردو زبان کی بقا اردو والوں کے لئے اصلی مسئلہ تھا۔ لیکن یہ انجمنیں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے نہیں بلکہ اردو ادب کی بقا کے لئے کوشاں تھیں۔ کلام حیدری نے اردو کے معاملے میں سرکاری وزرا کی غیر سنجیدگی کو بھی سر عام کرنے کی جرأت دکھائی ہے اور بڑی دیدہ دلیری سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہار کی وزارت تعلیم اردو کے معاملے میں نہ ہی فراخ دل ہے اور نہ ہی کدورت سے پاک ہے۔

کلام حیدری کے افسانے بنیادی طور پر ترقی پسندانہ رجحانات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں، لیکن انھیں ادب تخلیق کرنے کے علاوہ دوسرے ترقی پسندوں کی طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کا عرس منانا گوارہ نہ تھا۔ ترقی پسندوں کی ہنگامہ آرائیوں اور نعرہ بازیوں سے وہ برہم تھے، اور ادب میں کوری جذباتیت کے وہ قائل نہ تھے، اسی لئے انھوں نے کھلی زبان میں اس کی مذمت کی ہے۔ انھوں نے افسانوں میں محض عصری مسائل اور حقیقت بیانی کو ہی ترقی پسندی کی معراج نہیں تسلیم کیا جیسا کہ دوسرے ترقی پسند مصنفین کیا کرتے تھے۔ انھیں ہمیشہ اس بات سے بھی غرض رہی ہے کہ ایک افسانہ بحیثیت افسانہ کس حد تک کامیاب ہے۔ ''مزامیر'' میں انھوں نے بڑی جامعیت کے ساتھ اپنی بات اور اپنے خیالات کو واضح کیا ہے:

''خالص ادب'' کی بات بھی اتنی ہی گمراہ کن ہے، جتنی ''مقصدی ادب'' کی بات۔ اور دونوں میں سے کوئی بھی سچ نہیں۔ ادب اگر سچ نہیں، تو کچھ نہیں ہے۔۱۱

انھوں نے ادب میں راہ پانے والی نظریاتی غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ معروف ادیب و دانشور گوپال متل یا تو کسی غلط فہمی کے شکار تھے، یا کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی چاہ میں تھے، یا پھر اپنی وفاداری میں استواری کی نمائش کے لئے رشید جہاں اور سجاد ظہیر پر ہتک آمیز جملے تحریر کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا، کیوں کہ کمیونسٹ ہونا ان کے لئے نا قابل معافی تھا۔ کلام حیدری نے ان بڑی شخصیتوں کی نظریاتی اختلاف کو بھی ''مزامیر'' میں شامل کرتے ہوئے بڑی قابل اعتبار بات کہی ہے کہ اس طرح کی نامعقول اور ذلت آمیز جملے کسنے سے

ان بڑی شخصیتوں کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

زمانے کی کربنا کی نے ادب میں جدیدیت جیسے رجحان کو جنم دیا۔ سماج کا ہر فرد جس بے یقینی میں زندگی جی رہا تھا، اس بے یقینی نے انسانی ذہن کو اضطراب اور مایوسیوں کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ آزادی کے بعد جدید افسانہ نگاروں کے یہاں یہی اضطراب، بے چینی، مایوسی اور تنہائی کی کربنا کی ملتی ہے جو فطری ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے آدمی کے ساتھ ماحول کے رشتے پر زیادہ زور دیا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے جدید ادیب ''میں'' کا ''میں'' کے رشتے پر سارا زور دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں ہی عدم توازن کا شکار ہیں۔ کلام حیدری نے اس امر میں ترقی پسندوں اور جدیدیوں سے الگ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو سبھی کے لئے قابل قبول ہوسکتا ہے:

آدمی جیتا ہے، کیسے جیتا ہے، رشتوں میں پرویا ہوا آدمی جیتا ہے۔ ان رشتوں کو موٹے طریقے پر تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، آدمی اور آدمی کا رشتہ۔۔۔ آدمی اور خارجی دنیا کا رشتہ۔۔۔ اور پھر ''میں'' کا ''میں'' سے رشتہ۔۔۔ اور یہ تمام رشتے ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں۔۱۲

کلام حیدری نے ہمیشہ سوشلزم کی حمایت کی ہے۔ وہ ملک کو ترقی یافتہ دیکھنے کے خواہاں رہے ہیں اور اسی لئے وہ دستور میں ترمیم و اضافے کے زبردست حامی رہے ہیں۔ ان کی یہ خواہش رہی ہے کہ ہمارے دستور میں جہاں گاہ گاہ مختلف قسم کی تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں وہیں ایک تبدیلی اور ہونی چاہئے جس سے ملک و سماج میں مساوات کے لئے زمین تیار ہوسکے۔ وہ خود رقم طراز ہیں:

........میں تجویز کرتا ہوں کہ ادب تخلیق کر کے روزی کمانے کے حق کو دستور میں تسلیم کیا جائے۔ ادب تخلیق کرنے والے کو کلرکی، تجارت اور ادب سے دور کرنے والے پیشے اختیار نہ کرنے پڑیں۔۱۳

کلام حیدری کی یہ انقلابی سوچ سماج میں ایک مثبت تبدیلی لانے کی تمام تر قوت رکھتی ہے۔ لیکن اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مجموعی طور پر برسر پیکار ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف تو یہ ایک ایسا عمل ہے جو اردو زبان و ادب کے معیار کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کو برقرار

رکھنے میں معاون ہوسکتا ہے، وہیں دوسری جانب ہمارے ملک سے بے روزگاری کی شرح کو کم کرنے میں بھی یہ مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

ممتاز شیریں کی موت کے بعد ان کی یاد میں آہنگ کے اپریل ۱۹۷۳ کے شمارے کو اردو ادب کی اس نمایاں شخصیت کے نام معنون کیا گیا تھا۔ ''آہنگ'' میں جدید شاعر ظہیر صدیقی کا خصوصی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے تا کہ ان کی شخصیت اور فن دونوں کی جانب ایسے نقادوں کو متوجہ کیا جائے جن کے لئے تنقید کوئی درسی کام نہیں، بلکہ تخلیقی کام ہے۔

اداریہ نگاری کے مقاصد اور 'مزامیر' کے حوالے سے کلام حیدری کی اداریہ نگاری پر روشنی ڈالنے کے بعد اداریہ کی زبان پر بھی سرسری گفتگو لازمی سمجھتی ہوں۔ اداریے کی زبان کو عام طور پر سادہ، سہل ہونی چاہئے جسے ہر خاص و عام کی ادراک و فہم بہ آسانی قبول کرسکیں۔ عبارت گنجلک نہ ہو، مقفی و مسجع تحریر لکھنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ لفاظی اور بے جا طوالت سے پرہیز کرنا چاہئے کیوں کہ اس سے اداریے کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ زبان و بان ایسی ہو جس سے اس کی عجلت پسندی اور، غیر ذمہ داری اور کم علمی نہیں بلکہ صبر و تحمل، متانت اور غیر جانب داری ظاہر ہوتی ہو۔ کلام حیدری کے اداریے کی زبان کے تعلق سے ان کے ادبی اداریوں کے مجموعے ''مزامیر'' کے پیش لفظ میں نوشابہ حق نے لکھا ہے:

کلام حیدری کی نثر کی ایک نمایاں اور ممتاز صفت اختصار اور اس کی کاٹ ہے، کہیں بھی موضوع کو گنجلک نہیں بناتے، بہت ہی آسان عبارت میں پیچیدہ سے پیچیدہ ادبی نکات کو یوں بیان کر جاتے ہیں، کہ لگتا ہے ہم جس کو پیچیدہ سمجھ رہے تھے، وہ اتنا آسان تھا............ان تحریروں کا ایک ایک لفظ نپا تلا ہوا، وسیع اور پھیلی ہوئی ادبی دنیا کا احاطہ ہی نہیں کرتا بلکہ ان تحریروں میں تنقید کی دنیا کا وہ حبس نہیں ہے، جو تخلیق کار کا دم گھونٹ دیتا ہے۔۱۴

''آہنگ'' کے اداریے میں کلام حیدری نے فکر انگیز اور بصیرت افروز باتیں بہت ہی مدلل انداز میں پیش کی ہیں۔ اداریہ نویسی کا حق ایک ایسا شخص ہی ادا کرسکتا ہے جو سماجی، سیاسی، تہذیبی اور تاریخی شعور کا مالک ہو۔ جس کا مطالعہ وسیع ہو جو قومی اور عالمی منظرنامے سے واقف ہو

، جو بیدار مغز ہونے کے ساتھ ساتھ بالغ نظر بھی ہو۔کلام حیدری ان تمام صفات سے مزین تھے۔انھوں نے اداریے میں اختصار کے ساتھ جامعیت کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

حواشی

۱۔کلام حیدری، مزامیر، دی کلچرل اکیڈمی، گیا،ص،۸۶۔۸۷، جون ۱۹۷۹

۲۔غنی حیدر، کلام حیدری، جو دیکھا جو سنا جو سمجھا، کلام حیدری نمبر، ماہنامہ سہیل، گیا،ص،۱۵۳

۳۔غضنفر اقبال، اردو بک ریویو کے اداریے اور تجربے، کاغذ پبلشرز، گلبرگہ،ص،۱۴، ۲۰۰۶

۴۔ایضاً،ص،۲۲۔۲۳

۵۔خالد محمود، اردو میں اداریہ نگاری: ایک جائزہ بحوالہ اردو صحافت ماضی اور حال (مرتبین۔خالد محمور، سرورالہدا)، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی،ص،۲۱۸، ۲۰۱۲

۶۔نوشابہ حق، از پیش لفظ۔مزامیر، دی کلچرل اکیڈمی، گیا،ص،۱۰، جون ۱۹۷۹

۷۔کلام حیدری، مزامیر، دی کلچرل اکیڈمی، گیا،ص،۹۰، جون ۱۹۷۹

۸۔ایضاً،ص،۸۹ ۹۔ایضاً،ص،۱۵۔۱۶

۱۰۔ ایضاً،ص،۲۰۔۲۲ ۱۱۔ایضاً،ص،۴۸

۱۲۔ایضاب،ص،۲۷ ۱۳۔ایضاً،ص،۶۷

۱۴۔ایضاً،ص،۱۰۔۱۱

صفی اختر

بہار میں اردو صحافت: منظر، پس منظر

ہمارے ملک کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے میں اردو زبان اور اردو والوں نے جو اہم ترین اور فعال کردار ادا کیا ہے، وہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے، جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔صحافت کا تعلق ادب اور سماج سے ہے، لہذا صحافت نے ہر دور اور ہر زمانے کے سماج کی بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے، اور ہمیشہ اس کا رشتہ انسانی زندگی اور اس کی تہذیب سے رہا ہے۔اس نے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں سے اثر بھی قبول کیا اور حالات کی ترجمانی بھی کی ہے۔اردو اور اردو صحافت کی تاریخ بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے اور اس نے بڑے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔

جب جدو جہد آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو پتہ چلے گا کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی نحوست کا سایہ بہار اور بنگال پر بہت پہلے پڑا، اور کمپنی کے فرزندوں کی بے پناہ لوٹ کھسوٹ اور ظلم بے نہایت کا شکار جس طرح لمبی مدت تک اس خطے کے باشندوں کو ہونا پڑا، ویسا اس ملک کے دوسرے حصے کے باشندوں کو نہیں ہونا پڑا۔عملی طور پر تو پلاسی کی لڑائی میں سراج الدولہ کو ہرا کر لارڈ کلائیو نے 1757، ہی میں مشرقی ہندوستان کے ان تینوں صوبوں بنگال، بہار اور اڑیسہ کو کمپنی کے تسلط میں کرلیا تھا۔

جہاں تک اردو صحافت کا تعلق ہے، یہ ہندوستان کی 16 بڑی زبانوں میں ایک زبان کی نمائندگی کرتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ اردو صحافت کی ابتدا بنگال سے ہوئی، سب سے پہلا اخبار کلکتہ سے 1823 میں شائع ہوا جس کا نام ''جام جہاں نما'' تھا، پھر عہد بہ عہد اردو صحافت اپنا سفر طے کرتی رہی۔1857 سے پہلے ہی بہار میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا سفر ہوا تھا، پٹنہ میں ان کا دو ہفتہ قیام رہا، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف میں بھی وہ گئے تھے، پٹنہ کے بعد باڑھ، سورج گڑھ، مونگیر اور بھاگلپور وغیرہ میں قیام کرتے ہوئے وہ راج محل (جھارکھنڈ) پہنچے، جو اس وقت کے بہار کا یہ آخری پڑاؤ تھا، بے شمار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور انگریزوں کے خلاف ان کی تحریک کے شانہ

نشانہ ہو گئے، اس زمانہ میں اہلِ علم حضرات میں دیگر اور ناموں کے علاوہ مولوی ولایت علی، عنایت علی اور مظہر علی جیسے باصلاحیت اور سرفروش اور مخلصین نے ان کی تحریک میں بہت دانشورانہ اور علمی تعاون کیا۔ پھر 1958 میں اردو کا پہلا روزنامہ اخبار ''اردو گائیڈ'' کلکتہ ہی سے شروع ہوا، پھر سر سید احمد خاں کے اخبار ''سائنٹفک سوسائٹی'' (1866) سے اردو میں تعمیری صحافت کا آغاز ہوا۔ اردو صحافت آج جہاں طوفانِ بلاخیز سے گزر رہی ہے، وہیں اس نے بادِ سموم کا بھی مقابلہ کیا ہے''۔

کبھی اخبارات مقصد کی ترجمانی کیا کرتے تھے، اور اخبار نویسوں کے لیے یہ کام ایک مشن کی حیثیت رکھتا تھا، اس زمانے میں اصل معیار یہ رہتا تھا کہ مقصد سے رشتۂ وفاداری ہو۔ ہندوستان کو جمہوریت اور گنے چنے افراد اور چند اخبارات جو دشمن کے تمام وار، اپنے سینے پر سہتے رہتے اور مسکرا کر آگے بڑھتے رہتے تھے، اس صف میں آگے آگے تھے اور ان کی قربانیاں سب سے زیادہ تھیں، اس زمانے کی اردو صحافت نے کیسے کیسے جواہر پارے پیدا کیے، فی الوقت اس کا احاطہ دشوار ہے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا، تو تقسیم ہند کا المیہ شروع ہوا تاہم اس سے قطع نظر یہ بات قابل ذکر ہے کہ آزادی کے بعد بہار سے جو سب سے اہم اخبار نکلا، وہ روزنامہ ''شائی'' تھا جو پٹنہ سے 1949 میں شائع ہونے لگا۔ اس سے پہلے 1948 میں تو دربھنگہ سے ایک ادبی رسالہ ''نئی کرن'' شروع ہو گیا تھا، بعد ازاں سہیل عظیم آبادی نے 1952 میں مشہور ادبی رسالہ ''تہذیب'' جاری کیا تھا۔ بہار کے مسلمانوں کو آج بھی اس کا احساس اور فخر ہے کہ اس وقت جب کمپنی کی حکومت کو اس عروج واقبال کے دور میں اپنی صحافیانہ صلاحیتوں سے چیلنج دینے کی ہمت کی تھی بلکہ یہ فخر و احساس بہار کے مسلمانوں کے مزاج کا خمیر بن چکا ہے جس کا اظہار مختلف تحریکات کے آغاز میں ہوتا رہا اور ہماری اجتماعی زندگی کے ہر گام پر نامحسوس طریقے سے آج بھی ہوتا رہتا ہے۔

صحافی حضرات تو قلم کی آبرو کے محافظ ہوتے ہیں، آزادیٔ افکار اور آزادیٔ ضمیر ایسی دولت ہے جس کی ہر قیمت پر حفاظت ہونی چاہئے، یہی صحافت کی اصل متاع اور پونجی ہے جسے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھنا ہوگا، اردو صحافت کے ضمن میں جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے اس کی شروعات بنگال سے ہوئی، بہار ہر لحاظ سے بنگال کے قریب ترین اور ہمسایہ ریاست تھی، بلکہ بہار کا سارا کاروبار، بنگال سے ہی چلتا تھا مگر صحافت میں ثانویت کا نام اسے حاصل نہیں ہو سکا، بلکہ یہاں صحافت کا آغاز تاخیر سے ہوا۔ بہار کا پہلا

اردو اخبار ''نور الانوار'' 1853 میں آرہ سے شائع ہوا جس کے مالک محمد ہاشم اور اس کے منتظم، سید خورشید احمد تھے۔

واضح رہے کہ بہار میں اردو صحافت کی تاریخ کم وبیش ڈیڑھ سو برسوں پر محیط ہے، ان برسوں میں ایک ہزار سے بھی زائد اخبارات و رسائل شائع ہوئے اور بند ہوئے ہوں گے، کیوں کہ اخبارات و رسائل کے لیے یہاں کی زمین کافی سنگلاخ رہی، بہار کے اخبارات میں اردو صحافت میں ترجیحی رول رہا ہے۔ جدوجہد آزادی کے لیے اردو اخبارات نے بھی بطور مشن اپنا واجبی حق ادا کیا، ان دنوں بہار میں اردو اخبارات پٹنہ کے علاوہ آرہ، مونگیر، سیوان، دربھنگہ، گیا اور مظفر پور سے شائع ہوتے تھے، اس زمانے کے معروف اخبارات میں ''عظیم الاخبار'' (1867) پٹنہ دوماہی، ''اخبار الاخیار'' مظفر پور (1867) سہ روزہ، ''انڈین کرانیکل'' پٹنہ (1882) اور اخبار ''الپنچ'' کا ذکر کیا جا سکتا ہے، مشہور زمانہ ماہنامہ ''ندیم'' گیا سے (1931) انجم مانپوری نے نکالا تھا جو 1945 تک نکلتا رہا۔ مگر بہار میں کسی بھی اخبار یا رسالہ نے طویل عمر نہیں پائی، آج بھی پٹنہ سے ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ اخبار و جرائد کی کمی نہیں ہے۔ بہار کے اخبارات میں ''صدائے عام''، ''سنگم''، ''پندار''، ''قومی تنظیم'' وغیرہ قدیم اخبارات ہیں۔ ''صدائے عام'' تو 1946 سے شائع ہو رہا ہے۔ بہار کے متعدد اخبارات، فسادات اور انتقال آبادی کی نذر ہو کر بند ہو گئے اور کتنی ہی صحافی حضرات پاکستان منتقل ہو گئے۔

اس وقت بہار میں اردو اخبارات جن میں روزنامے ہفت وار، سہ روزہ، ماہنامے، شش ماہی اور سالنامے بھی ہیں، کی مجموعی تعداد 70-75 کے آس پاس ہو گی۔ صرف دربھنگہ سے ہی ''تمثیل نو''، ''جہانِ اردو'' اور ''دربھنگہ ٹائمز'' جیسے موقر جرائد نکل رہے ہیں جنہیں ملک گیر سطح پر مقبولیت بھی مل رہی ہے۔

بہار سے یوں تو اخبارات ہمیشہ نکلتے رہے لیکن اردو صحافت کا معیار جنوبی ہند کے بعض اخبارات کے مقابلے کم ہے۔ یعنی ایک بھی اردو اخبار یہاں ایسا نہیں ہے جسے پورے ملک میں پڑھا جاتا ہو اور قومی سطح پر اس کا ذکر عام ہو، لیکن درجنوں کی تعداد میں پٹنہ ہی سے بیشتر اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں، علاوہ ازیں ادبی و ثقافتی جرائد کی تعداد علیحدہ ہے۔ بلاشبہ بعض اچھے جرائد بھی ہیں جن کے قارئین ملک بھر میں ہیں۔ حالانکہ قومی سطح پر بہار کے قابل ذکر صحافی اپنی اچھی

شناخت کے ساتھ جانے جاتے ہیں نیز ادبی تخلیقات میں بہر حال وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی بھی ہو رہی ہے اور روز بروز بہت اچھے اچھے نوجوان ادباء کے نام سامنے آ رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو اخبارات آج قطعی کسی مشن کے تحت نہیں نکل رہے ہیں بلکہ وہ تو کاروباری انداز سے اور سرکاری اشتہارات حاصل کر کے اپنی معیشت درست کرنے کی خاطر نکالے جا رہے ہیں۔

ملی، ثقافتی اور مذہبی اداروں سے عموماً جو جرائد نکل رہے ہیں وہ دراصل اپنے اداروں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ امارت شرعیہ پھلواری شریف سے ہفتہ وار ''نقیب'' بھی طویل عرصے سے نکل رہا ہے اور وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ قارئین کی ضرورت کو بھی پورا کر رہا ہے۔ بہار میں اردو صحافت سے وابستہ اتنے نام ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا نہیں جا سکتا تاہم بہار کے اندر چلنے والے اخبارات میں ایسے ذہین اور ذی استعداد صحافی کم ہیں، کیوں کہ جن اخبارات کے سرکولیشن معقول نہیں ہیں، وہ اپنے کارندوں کو مناسب شرح کفاف بھی نہیں دے پاتے، نتیجے کے طور پر ذی صلاحیت حضرات ریاست سے باہر چلے جاتے ہیں اور بڑی کمپنیوں کے جرائد میں وہ لوگ کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ بات قابل ذکر ہے کہ بہار میں صحافت بالخصوص اردو صحافت کا حال قطعی اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ بہار، جس نے جدوجہد آزادی کو بڑے جری، دلیر اور قد آور افراد دیے تھے آج وہی معاملہ بڑا ڈھیلا ڈھالا اور مضمحل سا ہے، اردو صحافت کو آج یہاں کوئی نیا موڑ دینے والا موجود نہیں، خدا کرے ہم ایک زندہ صحافت کے ترجمان اور نقیب کی حیثیت سے پیش قدمی کرنے کے لائق بن سکیں اور آج کے صارفی کلچر میں نیز مسابقت کے اس دور میں اردو صحافت کا مقام متعین کرنے کے اہل ہو سکیں۔

161/32, Jogabai, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-25
Mob.: 09312365502, E-mail:safi_akhtar@yahoo.com

نورالسلام ندوی

اردو صحافت کی تاریخ نویسی میں بہار کا حصہ

خالق فطرت نے انسان میں کھوج اور جستجو کا جذبہ اس کی تخلیق کے ساتھ ہی ودیعت کر دیا ہے۔ کھوج اور تلاش تاریخ انسانی کا قدیم ترین جذبہ ہے۔ انسانوں میں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے حالات دریافت کرنے کی تڑپ، نئی نئی چیزوں سے آشنائی حاصل کرنے کی لگن، دور دراز علاقوں بلکہ فطرت سے پڑے چیزوں کے جاننے کا شوق شاید آدم علیہ السلام سے ہی منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ کچھ نیا کرنے کے جذبے اور تحقیق ذہن ہی کی تسکین کے لئے آدم وحوا نے اس درخت کا پھل چکھ لیا تھا جس کی سزا میں انہیں جنت چھوڑنی پڑی۔

انسانوں کے تہذیبی وتمدنی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس جذبہ نے بھی ترقی کی منزلیں طے کیں۔ کچھ کہنا اور سننا، جاننا اور جنانا، ترسیل اور ابلاغ نے انسانوں کو ایسے ہی ذرائع تلاش کرنے پر مجبور کر دیا جس سے کائنات سمٹ سکتی ہے۔ دور دراز کی خبریں ان تک پہنچیں اور ان کی خبریں دور دراز والوں کو معلوم ہوں۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے صحافت وجود میں آئی۔ پتھر کے دور میں بھی کہیں نہ کہیں صحافت کے گم گشتہ نقوش ملتے ہیں، جسے آپ صحافت کا اولین نقش کہہ سکتے ہیں۔ دیواروں پر اعلانات لٹکانا، یا لکھنا، دیہاتوں میں ڈھولک کی آواز کے ساتھ کسی چیز کا اعلان یہ بھی صحافت کی ایک شکل تھی، جس کا مقصد خبروں کی ترسیل تھی۔ انسان تہذیبی سطح پر جوں جوں بلند ہوتا گیا ویسے ویسے ابلاغ کے ذرائع بھی ترقی کرتے گئے۔ انسانوں نے جب رہن سہن، طرز معاشرت اور تمدنی وتہذیبی لحاظ سے ترقی کی تو زبان وبیان نے بھی ترقی کی۔ گفتگو جب لفظوں سے آگے بڑھی تو اس نے ادب کا لباس زیب تن کیا۔ جب عام بول چال اور گفتگو میں ادبیت نے فروغ پایا تو صحافت یا ابلاغ نے بھی ادب کا ہنر سیکھا۔ رفتہ رفتہ صحافت نے نئی منزلیں تلاش کرنی شروع کی اور موجودہ عہد میں پہنچتے پہنچتے صحافت سب سے زیادہ طاقت ور میڈیم اور ادارے کی شکل

میں سامنے آئی ہے۔

اردو صحافت کی باضابطہ تاریخ 1822 سے شروع ہوتی ہے جب منشی سداسکھ کی ادارت میں کلکتہ کی سرزمین پر ''جام جہاں نما'' کا اجراء ہوا۔ اس اعتبار سے اردو صحافت کی تاریخ کم و بیش دو سو سال پر محیط ہے۔ اردو صحافت کی ایک درخشاں اور زریں تاریخ رہی ہے، اردو صحافت نے انسانی حقوق، جمہوری اقدار، سیکولر کردار، اتحاد، ویگانگت، قومی یکجہتی، مساوات و برابری اور عوام کے سیاسی وسماجی شور کو بیدار کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ وطن عزیز کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے اور جدوجہد آزادی میں بھی اردو صحافت کا انقلابی اور قائدانہ رول رہا ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی سے لے کر 1947 کی جنگ آزادی تک اردو صحافت اس کا ہراول دستہ بنا رہا۔ آزادی کے بعد بھی نئے ملک کی تعمیر و ترقی اور قومی مفادات کے معاملہ میں اردو صحافت نے اپنی بھرپور ذمہ داری نبھائی ہے، اور آج بھی اردو صحافت صلہ اور ستائش کی تمنا سے بے نیاز اپنی ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہے۔

اردو صحافت کی تاریخ اور روایت کی توسیع اور اسے آگے بڑھانے میں بہار کے اخبارات و رسائل اور جرائد کا بھی اہم حصہ ہے۔ بہار کافی قدیم سے ہی علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور کلچر و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ یہاں سے علم کے سوتے پھوٹتے تھے اور پھوٹ رہے ہیں۔ دنیا کی سب سے قدیم یونیورسیٹی نالندہ اور وکرم شیلا سے ادب کا پاٹھ دنیا کو اسی سرزمین نے پڑھایا۔ جس طرح بہار نے علم کے ہر میدان میں دنیا کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ اسی طرح اس نے صحافت میں بھی اپنے انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں۔ یہاں قدیم زمانے سے ہی مختلف زبانوں میں صحافت کی جاتی رہی ہے، قدیم اخبارات و رسائل اس کے اعلیٰ ادبی معیار کی شہادت آج بھی دیتے ہیں۔ سرزمین بہار سے ایسے ایسے معیاری اخبارات و رسائل منصۂ شہود پر آئے جس نے ادب و صحافت کو وقار و اعتبار بخشا، اردو زبان کے بال و پر کو سنوارا، اس کے دامن میں نئے نئے گل بوٹے لگائے اور زبان و ادب کو فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کیا۔

بہار میں اردو صحافت کا باضابطہ آغاز 1953 سے ہوتا ہے۔ یہ خوش آیند بات

ہے کہ ریاست بہار میں صحافت کا آغاز اردو صحافت سے ہوا۔ اس معاملہ میں شہر آرہ کو اولیت کا مقام حاصل ہے کہ اسی تاریخی سرزمین سے اردو کا پہلا اخبار ''نورالانوار'' شائع ہوا۔ یہ اخبار سید محمد ہاشم بلگرامی کی ملکیت اور سید خورشید احمد کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ''نورالانوار'' کے اجراء کے برسوں بعد انگریزی کا پہلا اخبار 187Bihar Herald کو جاری ہوا۔ اس کے دو سال کے بعد 1874 میں ہندی زبان کا پہلا اخبار ''بہار بندھو'' جاری ہوا۔ تاریخی اعتبار سے بہار میں اردو صحافت انگریزی صحافت سے انیس سال اور ہندی صحافت سے اکیس سال بڑی ہے۔ ''نورالانوار'' کی اشاعت کے بعد تقریباً دو سال تک اردو کا کوئی رسالہ جاری نہیں ہوا۔ 21 اپریل 1855 کو پٹنہ سے ''پٹنہ ہرکارا'' منظر عام پر آیا۔ اس کے اگلے سال مئی 1856 کو گیا سے ''ویکلی رپورٹ'' کا اجراء عمل میں آیا۔ اس کے صرف تین مہینہ کے بعد ستمبر 1856 کو پٹنہ سے ''اخبار بہار'' کا اجراء ہوا۔ 1853 سے 1857 کی جنگ آزادی تک بہار کی سرزمین سے چار اخبار منظر عام پر آئے، مگر افسوس کی بات ہے کہ محققین اور اردو صحافت کے تاریخ نویس بہار کی ابتدائی صحافت سے متعلق خاموش نظر آتے ہیں۔ اردو صحافت کی ابتدائی تاریخ پر کئی ماہرین کی وقیع کتابیں ہیں، جن میں ملک بھر کی ریاستوں اور شہروں سے شائع ہونے والی صحافت پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن بہار اور اس کی صحافتی خدمات کا تذکرہ کرنے سے پہلوتہی اختیار کیا ہے۔

1857 کی بغاوت نے زندگی کے تمام شعبہ کو متاثر کیا، سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور تعلیمی غرض ہر اعتبار سے مسلمانوں کو لرزہ براندام ہوئے۔ اس موقع پر صحافیوں نے بڑی مجاہدانہ اور دلیرانہ سرگرمی دکھلائی، دار و رسن کی آزمائشوں سے گذرے۔ بہار کی اردو صحافت جو اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی وہ بھی اس سے متاثر ہوئی اور اس سے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔

1857 کی جنگ جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا نے زندگی کے ہر شعبہ حیات کو متاثر کیا۔ صحافت اس زد سے کیسے بچ سکتی تھی، وہ شروع ہی سے انگریزوں کے نشانے پر رہی ہے، لیکن اس سے اردو صحافت کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ دار و رسن اور سخت آزمائشوں سے گذرنے کے بعد اس کا تیور اور سخت ہو گیا، اردو صحافت نے آزادی وطن کا پرچم اپنے ہاتھ میں لے لیا، وطن عزیز کو غلامی

کے طوق سے آزادی دلانے کے لئے اردو صحافیوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح بہار نے بھی اپنی بھرپور حصہ داری نبھائی۔ یہاں سے لاتعداد اردو اخبارات منظر عام آئے۔ان میں چند اہم نام یہ ہیں۔عظیم الاخبار 1859 پٹنہ، نیر الفوائد 1868 آرہ، اخبار الاخیار 1869 مظفر پور، نادار الاخبار 1873 مونگیر، نسیم سحر 1874 پٹنہ، ویکلی 1877 پٹنہ، مجمع الفوائد 1876 مونگیر، شیر بہار 1880، نوائے عشق 1885 پٹنہ، الہادی 1897 پٹنہ، تاج 1902 پٹنہ، الشمّس 1906، بہار گزٹ 1906 پٹنہ، معارف 1912 پٹنہ، سہ روزہ اتحاد 1912 بہار شریف۔ بہار کے مشہور صحافی اور بہار کی صحافتی خدمات پر نہایت وقیع اور جامع کتاب کے مصنف ڈاکٹر سید احمد قادری نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ بہار سے نکلنے والے اردو اخبارات ورسائل کی فہرست اپنی تصنیف ''اردو صحافت بہار میں'' میں جمع کیا ہے۔موصوف ان اخبارات ورسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

> ''ان تمام اخبارات ورسائل میں اخبار الاخیار، اردو انڈین کرانیکل، اردو ہیرالڈ وانڈین کرانیکل، الپنچ، بہار اخبار، المبشر، پیغام، اتحاد، پٹنہ اخبار، دیہات، روشن اور صدائے عام وغیرہ کے صفحات اس بات کے غماز ہیں کہ ان کی تحریروں نے انگریز حکمراں کی راتوں کی نیند حرام کردیں اور اتنے منظّم طریقے سے صحافتی خدمات انجام دئے کہ آج ان کے ذکر کے بغیر اردو صحافت کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے''۔

اوپر جن اخبارات ورسائل کا ذکر ہوا ہے اس سے واقعی اس بات کی انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ بہار کی اردو صحافت ملک کی دوسری ریاستوں کی صحافت سے پیچھے نہیں رہی ہے، بلکہ بعض حیثیت سے اس کا مقام اس سے بلند نظر آتا ہے۔ 1914 میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس وقت متعدد اخبارات اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ان میں زیادہ تر اخبارات حکومت مخالف تھے۔ چنانچہ 1910 میں حکومت نے پریس ایکٹ نافذ کرکے ان کے خلاف سخت کاروائی کی جس کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں اخبارات ورسائل کی ضمانتیں ضبط ہوئیں اور بند ہوئے، ان میں

بہار کے دو اہم اخبار ''مشیر'' اور ''اتحاد'' بھی شامل ہیں۔

اتحاد 1912 کو بہار شریف سے جاری ہوا، یہ نہایت معیاری اخبار تھا۔ ملک کے اردو اخباروں میں اپنا ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ سیاسیات حاضرہ پر تیکھے تبصرے شائع کرتے اور ملک کے نامی گرامی ادباء وشعراء کی تخلیقات بھی اس میں جگہ پاتیں۔

اس عہد میں اور بھی کئی معتبر اخبارات منصۂ شہود پر آئے۔ان میں پٹنہ اخبار 1913، دیہات، روشنی، الپنچ، المبشر، پیغام، صدائے عام۔ان میں دیہات اور روشنی حکومت وقت کا ہمنوا رہے۔صدائے عام بہار کی اردو صحافت میں ایک بہت بڑا نام ہے، یہ اخبار اگست 1942 کو پٹنہ سے جاری ہوا۔ ابتداً یہ اخبار مسلم لیگ کے نظریات کا حامی رہا۔آزادی وطن کے بعد کانگریس حکومت کا ترجمان بن گیا، بہار کی اردو صحافت میں صدائے عام کو معتبریت حاصل ہے۔حکومت کا حامی ہونے کے باوجود اس نے بہار کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کو خاصا متاثر کیا ہے، جنگ آزادی میں بھی اس کا اہم رول ہے۔

1853 سے لے کر 1947 کی جنگ آزادی تک بہار کی اردو صحافت کی ایک درخشاں تاریخ ہے، جس نے اپنے قلم سے لہو کا کام لیا، ایک طرف تو ان اخبارات نے عوام کی ذہن سازی کی، ان کے شعور کو بیدار کیا، قومی مفادات کی لڑائی لڑی، جدوجہد آزادی کے شمع کو فروزاں رکھا، تو وہیں دوسری طرف اردو زبان وادب کی آبیاری بھی کرتے رہے۔ بلاشبہ بہار کی اردو صحافت نے ملک کی اردو صحافت کی تاریخ نویسی میں گراں قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

آزادی کے بعد نئے ملک، نئی فضا، نئے حالات میں نئے مسائل درپیش تھے۔ملک تو آزاد ہو گیا لیکن یہ آزادی تقسیم وطن کا داغ بھی دے گیا۔ ملک بٹ گئے تو دل بھی دوحصوں میں تقسیم ہو گئے۔اردو زبان جو ہندوستان کی قومی زبان تھی، گنگا جمنی تہذیب کی علامت تھی، قومی یکجہتی، اخوت و بھائی چارگی اور امن آشتی کا علمبردار تھی، اس کی جگہ ہندی کو قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔اس سے اردو صحافت بری طرح متاثر ہوئی۔ دوسری طرف فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان حالات میں کم وبیش پورے ملک کا منظر نامہ بدل گیا۔اردو صحافت کا دھار کند ہو گیا، اس کے حوصلے

کمزور پڑ گئے ،لیکن چونکہ اس کی شاندار ماضی تھی، روشن تاریخ تھی اور اردو کی جڑیں گہری تھیں اس لئے رفتہ رفتہ اردو صحافت نے ایک بار پھر انگڑائی لینی شروع کی۔ 1947 کے بعد جو اخبارات منظر عام پر آئے ان میں سب سے پہلا اخبار دربھنگہ کی تہذیبی و علمی سرزمین پر مظہر امام اور منظر شہاب کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 1949 میں سہیل عظیم آبادی نے ''ساتھی'' کا اجراء کیا۔ اس کے علاوہ جن اخبارات نے اپنے وجود کا احساس دلایا ان میں ماہنامہ کرن، ماہنامہ پرچم، ہفتہ وار سیرت، ماہنامہ نئی راہ، ساحل، طالب کے نام اہم ہیں۔ اس زمانے میں بڑے بڑے ادباء، شعراء، افسانہ نگار اور قلم کار حضرات اس پیشہ سے وابستہ ہوئے، جس سے اردو صحافت کو ایک خاص وقار، اعتبار اور معیار حاصل ہوتا گیا۔ اس مختصر مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں بلکہ ان ادباء و شعراء کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈال سکوں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد اخبارات وجود میں آئے اور اردو صحافت نے پھر سے اپنا وجود منوانا شروع کر دیا۔ البتہ آزادی کے فوراً بعد نکلنے والا اخبارات کا لہجہ تھوڑا نرم پڑ گیا چونکہ ان کے اندر کا جوش و خروش سرد پڑ چکا تھا۔

لیکن بتدریج اردو صحافت خوف کے ماحول سے باہر نکلتی گئی، آزادی کے بعد جن اخباروں نے بہار کی اردو صحافت کی روایت کو آگے بڑھایا اور آزادی کے بعد نئے ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنی بھرپور ذمہ داری نبھائی ان میں صدائے عام، ساتھی، سنگم، عظیم آباد ایکسپریس، قومی آواز، ہمارا نعرہ، سارا بہار، ایثار، قربانی، قومی تنظیم، فاروقی تنظیم، پندار، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن لوگوں نے اردو صحافت کو آزادی کے بعد سینچنے اور پروان چڑھانے میں بنیادی رول ادا کیا، ان میں انجم مانپوری، سید نظیر حیدر، شین مظفر پوری، سلطان احمد، شمس الہدیٰ استھانوی، سہیل عظیم آبادی، سید عمر فرید، کلام حیدری، شاہد رام نگری، قیوم خضر، الحاج غلام سرور، سید محمد عبدالرافع، سارق اجے پوری، خالد رشید صبا، محمد مرغوب، رضوان احمد، جیسے صحافیوں کا نام آسمان صحافت کے درخشندہ ستاروں میں ہے۔

عہد حاضر میں بھی بہار صحافتی خدمات کے حوالہ سے کسی دوسری ریاست سے پیچھے نہیں ہے۔ فی الوقت بہار سے دو درجن سے زائد اخبارات نکل رہے ہیں ان میں 18 اخبارات ایسے ہیں جسے حکومت بہار سے سرکاری اشتہارات حاصل ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بات درست ہے کہ ان میں زیادہ تر اخبارات صرف سرکاری اشتہارات حاصل کرنے، مالی منفعت حاصل کرنے کے لئے

نکل رہے ہیں، ان کا سرکولیشن بہت کم ہے، اس کا معیار و وقار صحافت کے پیشہ کو مجروح کر رہا ہے۔ لیکن کئی ایسے اخبارات ہیں جو ملک کے معیاری اخبارات کے ہم پلہ ہیں۔ خبری مواد، ظاہری حسن، کتابت، طباعت، سرکولیشن ہر اعتبار سے وہ معیاری ہے، ان میں قومی تنظیم، راشٹریہ سہارا، روزنامہ انقلاب، فاروقی تنظیم، پندار کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حالیہ چند برسوں میں کچھ نئے اخبارات بھی لانچ ہوئے ہیں اور وہ بھی بہار کی معیاری صحافت میں اپنی جگہ بنانے میں مصروف عمل ہیں۔ دہلی کا معروف روزنامہ ''ہمارا سماج'' نے اس کا پٹنہ ایڈیشن بھی شروع کیا ہے، یہ اخبار بھی دہلی کے طرز پر نکل رہا ہے، رنگین اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ تجزیاتی خبروں اور کالموں پر مبنی ہوتا ہے۔ 9 مارچ 2013 کو روز ''تاثیر'' کا اجراء عمل میں آیا اس کے ایڈیٹر محمد گوہر ہیں، یہ اخبار بھی رنگین شائع ہوتا ہے اور 12 صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سال رواں یکم جنوری کو بہار سے جاری ہونے والا نیا اخبار ''الوطن ٹائمز'' ہے جو اقبال صبا کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ اخبار بھی رنگین ہے اور 12 صفحات پر مشتمل ہے۔ اپنے گیٹ اپ، سیٹ اپ اور ظاہر حسن کے اعتبار سے بڑا عمدہ اخبار ہے لیکن ان کے پاس تجزیہ کار صحافی رپورٹرس اور کارکن کی کمی ہے۔

فی الحال جن صحافیوں کے ہاتھ میں اردو صحافت کی باگ ڈور ہے اور جو مالی مشکلات اور نامساعد حالات کے باوجود آفتاب صحافت کو روشن رکھنے کی بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں ان میں ریاض عظیم آبادی، محمد اشرف فرید، اشرف استھانوی، احمد جاوید، راشد احمد، ریحان غنی، خورشید ہاشمی، خالد انور، سید محمد شہباز، عبدالواحد رحمانی، خورشید پرویز صدیقی، سراج انور، رضوان دربھنگوی، امتیاز کریم، معظم حیدری، سید احمد قادری، راشد احمد، امام الحسن قاسمی، انوار الہدیٰ، جاوید اختر، منصور خوشتر، عمران صغیر، محمد شعبان، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اب رہی بات کہ بہار کے اردو اخبارات کے معیار و مسائل اور امکانات کیا ہیں تو یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمیں صرف یہ دکھانا اور بتلانا مقصود ہے کہ بہار کی اردو صحافت نے ملک کی اردو صحافت کی تاریخ نویسی میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے، مذکورہ بالا جائزے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اردو صحافت کی تاریخ نویسی اور اس کی روایت کی توسیع و ترقی میں بہار کی اردو صحافت اور بہار کے اردو صحافیوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

کامران غنی، نائب مدیر دربھنگہ ٹائمز

بہار میں اردو صحافت: مسائل، حل اور امکانات

بہار میں اردو صحافت کی تاریخ اور اس کے آغاز وارتقا پر ڈاکٹر سید احمد قادری نے اپنی تحقیقی کتاب ''اردو صحافت بہار میں'' میں اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ نیز ڈاکٹر منصور خوشتر کی اس کتاب میں بھی مضمون نگاروں نے بہار میں اردو صحافت کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ لہٰذا طوالت سے بچتے ہوئے اردو صحافت کو درپیش مسائل اور امکانات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

عام طور پر ''صحافت'' لفظ ذہن میں آتے ہی جو تصور سب سے پہلے ابھرتا ہے وہ ''اخبار'' ہے۔ اس کی ایک منطقی وجہ بھی ہے۔ ٹکنالوجی کے اس ترقی یافتہ عہد میں بھی کہ جب انٹرنیٹ کے توسط سے چشم زدن میں خبریں دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جاتی ہیں، اخبارات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اخبار کی حیثیت دستاویزی ہوتی ہے۔ ویب سائیٹس پر شائع شدہ مواد میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو یا ٹیلی وژن سے نشر شدہ چیزوں کو ریکارڈ میں رکھنا مشکل ہے۔ معیار کے اعتبار سے بھی ترجیح اخبار کو ہی دی جاتی ہے۔ یہی وجہ کہ جس قدر خبروں اور معلومات کی ترسیل کی نت نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں اُسی قدر اخبارات کی اشاعت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ بہار میں اس وقت تقریباً دو درجن سے
زائد اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ درجن بھر اخبارات مارکٹ میں دستیاب بھی ہیں۔ ان میں قومی تنظیم، انقلاب، راشٹریہ سہارا، پندار، فاروقی تنظیم، سنگم، امین، ہمارا سماج، پیاری اردو، انقلاب جدید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یقیناً اتنے سارے اخبارات کی اشاعت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اردو اخبارات پڑھے بھی جاتے ہیں لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ صرف

بہار ہی نہیں بلکہ قومی سطح پر اردو اخبارات کا کوئی مشن یا نصب العین نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مشن یا نصب العین کے بغیر بھی اردو اخبارات ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیتی آبادی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ نیز زبان وادب کی سطح پر بھی اردو اخبارات کسی نہ کسی صورت میں اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔

بہار سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی صورت حال بظاہر اطمینان بخش نظر آتی ہے۔ کارپوریٹ میڈیا کے اخبارات (راشٹریہ سہارا اور انقلاب) کی اشاعت کے بعد سبقت کی دوڑ میں تیزی بھی آئی ہے۔ تاہم اردو اخبارات کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ اخبارات کے مالکان اور کارکن صحافیوں کے درمیان کی خلیج ہے۔ میرے خیال میں اس خلیج کے ذمہ دار مالکان اور صحافی دونوں ہیں۔ کارپوریٹ میڈیا کے اخبارات کو چھوڑ دیا جائے تو یہاں کے تمام اخبارات کے ایڈیٹر خود مالکان ہیں۔ چلئے یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر بحث کی جائے۔ مالکان کے ذریعہ کارکن صحافیوں کا استحصال ایسا سنگین مسئلہ ہے جو اردو اخبارات کی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ یہ ایک عام شکایت ہے کہ اردو اخبار سے وابستہ صحافیوں کو ان کی محنت کے حساب سے مناسب اجرت نہیں ملتی۔ ایسے میں نوجوان طبقہ اس شعبہ میں قدم رکھنے سے گریز کرتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ایک دوسری تلخ حقیقت یہ بھی ہے جس کا اعتراف کارکن صحافی نہیں کرتے کہ اخبارات سے وابستہ زیادہ تر صحافی ایسے ہیں جنھوں نے بحالتِ مجبوری اس شعبہ میں قدم رکھا۔ اخبار کے مالکان نے دھوپ کے عالم میں انھیں سائبان عطا کیا اور جب وہ کسی قابل ہو گئے تو مالکان کے خلاف ہی علم بغاوت بلند کرنے لگے۔ مالکان اور کارکن صحافیوں کی اس خلیج کو ختم کئے بغیر بہار میں اردو صحافت کی ترقی ناممکن ہے۔ آج اردو اخبارات کے پاس نہ تو پیسوں کی کمی ہے اور نہ وسائل کی۔ سن 2010ء میں آر ٹی آئی کے ذریعہ حاصل شدہ اعداد وشمار کے مطابق حکومت بہار کی جانب سے اپریل 2010 سے اگست 2010 کے دوران قومی تنظیم، راشٹریہ سہارا، فاروقی تنظیم، پندار
، انقلاب جدید اور سنگم کو مجموعی اعتبار سے 30846211 (تین کروڑ آٹھ لاکھ چھیاسی ہزار دوسو

گیارہ) روپئے کہ اشتہارات جاری کئے گئے۔ ہندی اور انگریزی اخبارات کو ملنے والی اشتہارات کی رقم سے موازنہ کیا جائے تو یہ رقم تھوڑی کم ضرور ہے لیکن اسٹاف کی تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہندی اور انگریزی اخبارات کے دفاتر میں اردو اخبارات کے دفاتر سے کہیں زیادہ رونقیں ہوتی ہیں۔ اردو اخبارات کے مالکان چاہیں تو تھوڑی سی فراخ دلی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

بہار میں اردو صحافیوں کی کوئی منظّم تنظیم نہیں ہے۔ کچھ پرانی تنظیمیں ہیں بھی تو عملی طور پر ان کی کوئی سرگرمی نہیں ہے، پھر صحافیوں کی ذاتی چشمک اور منافقانہ رویہ خود ان کے لیے ہی سم قاتل ہے۔ بہار کے صحافی چاہیں تو مشترکہ طور سے اپنے مطالبات اخبار کے مالکان کے سامنے رکھ سکتے ہیں، لیکن صحافیوں کا اتحاد ایک ایسا خواب ہے جو شاید کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

بہار کے اردو اخبارات کی کوئی بین الاقوامی شناخت نہیں ہے۔ کارپوریٹ میڈیا کے اخبارات کو چھوڑ دیا جائے تو قومی تنظیم، فاروقی تنظیم، سنگم اور امین کو چھوڑ کر دوسرے کسی بھی اخبار کا انٹرنیٹ ایڈیشن موجود نہیں ہے۔ جن اخبارات کا انٹرنیٹ ایڈیشن ہے بھی وہ پابندی سے اپڈیٹ نہیں ہوتے۔ یہاں کے اخبارات ''پبلسٹی'' کے لیے سوشل میڈیا کا سہارا بھی نہیں لیتے
۔ حالانکہ تھوڑی سی محنت کی جائے تو اخبارات کو عالمی شناخت حاصل ہو سکتی ہے۔ نوجوان صحافی جو نئی تکنیک سے واقفیت رکھتے ہیں، ان سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔

بہار کے اردو اخبارات سے وابستہ صحافیوں کا ایک اور اہم مسئلہ فن صحافت سے ناواقفیت ہے۔ دوسری ریاستوں خاص طور سے دہلی میں اب پیشہ ور صحافیوں کو ہی شعبہ ادارت میں جگہ دی جاتی ہے۔ بہار میں نئی نسل کو صحافت کے فن و تکنیک سے واقف کرانے کے لیے کوئی مناسب بندوبست نہیں ہے۔ کچھ سال قبل پٹنہ یونیورسٹی نے اردو صحافت میں ڈپلوما کورس شروع کیا تھا لیکن چند سال بعد ہی اس کورس کو بند کرنا پڑا۔ نوجوان صحافیوں کو فن صحافت کے رموز و نکات اور تکنیکی معلومات فراہم کرانے کے لیے مثبت پیش رفت ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ کام تعلیمی ادارے ہی انجام دیں۔ اخبار کے دفاتر میں بھی نوجوان صحافیوں کی تربیت کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ سینئر اور

تجربہ کار صحافی تربیت کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ صحافتی تربیت نہیں ہونے کی وجہ سے نئے صحافی فاش غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ اردو اخبارات کی بیشتر خبریں ہندی یا انگریزی سے ترجمہ کر کے شائع کی جاتی ہیں۔ اشتہارات بھی زیادہ تر ہندی یا انگریزی میں ہی موصول ہوتے ہیں۔ ترجمہ نگاری بھی ایک فن ہے۔ نئے صحافیوں کو اس فن سے واقف کرانا انتہائی ضروری ہے۔

یہ سچ ہے کہ بہار میں اردو صحافت ہندی اور انگریزی صحافت سے کافی پیچھے ہے لیکن حالیہ چند برسوں پر نظر ڈالی جائے تو صبح کاذب کے بعد کی سی دھندلی سفیدی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ حالیہ چند برسوں میں اردو اخبارات کی اشاعت میں اضافہ ہوا ہے۔ اردو اخبارات اب دور دراز کے علاقوں میں بھی پہنچنے لگے ہیں۔ مواد اور گیٹ اپ وغیرہ کے اعتبار سے اردو اخبارات پہلے سے کہیں زیادہ دیدہ زیب اور معیاری شائع ہونے لگے ہیں۔ صحافی برادری اور اخبار کے مالکان و ذمہ داران چند بنیادی مسائل پر توجہ دے دیں اور ان مسائل کے حل کی سنجیدہ کوششیں کی جائیں تو بہار کے اردو اخبارات بھی قومی اور بین الاقوامی سطح کے اخبارات سے کسی طرح کم نہیں ہوں گے۔ بس ضرورت اتنی سی ہے کہ اخبار کے مالکان ہوں یا کارکن صحافی سبھی اپنی ذمہ داری، ایک دوسرے کی مجبوری اور مسائل کو سمجھیں۔ منافقت کا رویہ ترک کر کے خلوص نیت اور جذبۂ اخلاص کے ساتھ صحافت کو اسی طرح مشن بنائیں جیسا مشن مولوی محمد باقر، مولانا محمد علی جوہر، مولانا آزاد، سر سید احمد خاں جیسے اکابرین نے بنایا۔

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

☆☆☆

فردوس علی

بہار کے اردو اخبارات کا رول

اخبارات کا بنیادی کام عوام تک خبروں کی ترسیل ہے۔خبریں عوام تک زبان کے سہارے پہنچتی ہیں۔ چونکہ خبر صرف اسی کا نام نہیں ہے جو کچھ کہ ہمارے آس پاس حادثات وواقعات کی شکل میں رونما ہوتا ہے بلکہ ہر وہ سرگرمی جس نے انسانی زندگی کو آسانی پہنچائی ہے یا ہر وہ واقعہ جس سے انسانی زندگی کو نقصان پہنچا ہے سب کچھ خبروں کا حصہ ہے۔سائنسی ایجادات،میڈیکل ریسرچ،ملکوں کا ٹکراؤ،داخلی کشمکش،فکری تصادم گویا ہر ایک چیز خبر کا حصہ بنتی ہے۔سائنسی ایجادات،طبی تحقیق،فکری تصادم اور اس طرح کی تمام خبریں اپنے ساتھ نئی اور پیچیدہ لفظیات کو بھی ساتھ لاتی ہے۔اس سلسلے میں سید ضمیر حسن کی یہ رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے:

''دراصل زبان کے فروغ کا سلسلہ خیالات اور افکار کی جولانی سے جڑا ہوا ہے۔الفاظ کا ذخیرہ کسی اکادمی میں چند ذہنوں کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ ایک جاری وساری زندگی اور فکر اندیشی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔جس زمانے میں ہمارے اخبار مضامین نو بہ نو سے پُر ہوتے تھے، ہمارے خیال میں ترُفّع ہوتا تھا،زبان آپ سے آپ ترقی کر رہی تھی۔''

(اردو صحافت۔انور علی آروی)

مجھے یہ کہنے میں کوئی ڈر نہیں کہ موجودہ وقت میں ان مسائل کا احاطہ سب سے پہلے کوئی کرتا ہے تو وہ میڈیا ہی ہے۔خواہ وہ الیکٹرانک میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا۔غور سے دیکھا جائے تو اس طرح کی خبروں میں جو رول پرنٹ میڈیا کا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔دیگر زبانوں کے اخبارات کے ساتھ اردو زبان کے اخبارات بھی نہ پہلے پیچھے تھے اور نہ اب ہیں۔جب یہ خبریں عوام تک پہنچتی ہیں تو ظاہر ہے کہ عوام صرف ان چیزوں سے آگاہی حاصل نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ جو نئی لفظیات سامنے آتی ہیں ان سے بھی روبرو ہوتے ہیں اور دھیرے دھیرے یہ الفاظ عوام کے روزمرہ

میں جگہ بھی پاتے ہیں۔اس طرح اردو اخبارات زبان کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

زبان کے فروغ میں اخبارات کے رول کے حوالے سے ایک اور بات کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ گو کہ اخبارات کا مقصد زبان کی تعلیم نہیں ہے لیکن ہر زمانے میں میڈیا کو اچھی زبان کے سیکھنے کا ذریعہ بنایا جاتا رہا ہے۔ہم میں سے ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ ابھی چند برس پہلے تک ہمارے اساتذہ طلبہ کو انگریزی زبان سیکھنے کے لیے ریڈیو سننے کی ترغیب دیتے تھے۔آج جبکہ طلبہ میں اردو زبان کی تعلیم کے رجحان میں بڑی کمی آئی ہے، میٹرک تک جو بچے اردو بحیثیت مضمون پڑھتے بھی ہیں تو ان کی اردو دانی بس واجبی سی ہوتی ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دور کے یہ میٹرک پاس طلبہ اردو میں اچھی درخواست بھی نہیں لکھ سکتے ہیں، آج یہ اردو اخبارات ہیں جو ان کی اردو زبان کو بہتر کرنے میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔

لیکن جہاں تک اردو ادب اور اردو صحافت کا تعلق ہے اس کا ایک دوسرے کے ساتھ بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔اس زمانہ میں جب اردو زبان، کمسنی کے عہد سے نکل کر شعور کی منزلوں کو چھو رہی تھی، اردو صحافت کا آغاز ہوا۔ یہ انیسویں صدی کا ابتدائی دور تھا اور اسی زمانہ میں، 1836ء کے آس پاس، محمد باقر صاحب نے دلی سے اردو اخبار نکالا اور اکبرآباد سے منشی سدا سکھ لال کی سرپرستی میں اخبار ''نورالابصار'' نکلا۔اگر ہم اردو صحافت کی ابتدا سے جائزہ لیں تو واضح طور پر یہ نظر آتا ہے کہ اردو صحافت نے اردو ادب اور ادیبوں کو عوام سے روشناس کرایا ہے۔یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو ادب، صحافت کے ذریعہ ہی مقبولِ عام ہوا اور پروان چڑھا۔شاعری کے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے جو فروغ ملا اور عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس میں شاہی درباروں اور مشاعروں کا بڑا ہاتھ تھا لیکن اردو نثر کی ترقی خالص، صحافت کی مرہون منت رہی ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد، سرسید کے رسالے تہذیب الاخلاق، مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال اور البلاغ، بنارس کے اردو اخبار'' آواز اخلاق''، کانپور سے شائع ہونے والے ''زمانہ'' حسرت موہانی کے رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' اور امتیاز علی تاج کے'' کہکشاں'' اور مولانا ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار'' نے اردو نثر کے ساتھ نظم کی ترقی اور ترویج میں جو اہم حصہ ادا کیا ہے وہ

اردو ادب کی تاریخ کے لئے قابل فخر ہے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اردو کے ادیبوں کا ایک بڑا گروہ جمع کیا تھا جس میں مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد خان، ذکا اللہ خان، محسن الملک اور چراغ علی کے نام نمایاں ہیں۔ مولانا حالی کی طویل نظم مدو جزر اسلام جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے اور اردو کی طویل نظموں میں منفرد خصوصیات اور ایک شہ پارے کی حیثیت رکھتی ہے، سرسید کے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ عوام میں مقبول ہوئی۔

مولانا محمد علی جوہر کے ''ہمدرد'' نے جہاں ایک طرف عوام میں سیاسی شعور بیدار کیا اور ان کی آزادی کی جدوجہد میں مدد کی وہیں اردو نثر کو بھی مالا مال کیا۔ پریم چند کا پہلا ناول ''اسرار معابد'' بنارس کے ''آواز ٔاخلاق'' میں قسط وار شایع ہوا تھا اور اسی طرح ان کے دوسرے ناول اور افسانے، کانپور کے زمانہ میں شایع ہوئے۔

اردو ادب میں نثر کا وہ ابتدائی دور جب کہ رومانیت اپنے عروج پر تھی اور ادب لطیف کی اصطلاح عام تھی اس کو خان بہادر ناصر علی کے اخبار ''صلائے عام'' دہلی اور نیاز فتح پوری کے ''نگار'' نے بڑھاوا دیا۔ نیاز فتح پوری خود اُس زمانہ میں شعری منشورات کے ماہر تھے۔ یہ زمانہ 1920-21 کا تھا۔ اسی زمانہ میں سجاد حیدر یلدرم، نصیر حسین خیال اور مجنوں گورکھپوری ابھرے۔ ان کے شہ پاروں کو گورکھپور کے رسالے ''سبحان'' اور ''مشرق''، کانپور کے ''ادیب اردو'' بدایوں کے ''نقیب'' نے عوام میں مقبول کیا۔ خود مجنوں گورکھپوری کے مجلّہ ''ایوان'' نے جو انہوں نے [illegible]ء میں گورکھپور سے جاری کیا تھا، اردو ناول اور افسانہ نگاری کی ترقی میں کافی نمایاں رول ادا کیا۔

اردو میں طنز و مزاح کو جو فروغ حاصل ہوا وہ خالص اردو صحافت کی دین ہے۔ اس صنف کا آغاز سرشار اور سجاد حسین سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنے مزاحیہ مضامین کی ابتدا ''اودھ پنچ'' سے کی۔ خود سجاد حسین اس زمانے میں اودھ پنچ کے ایڈیٹر تھے۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت ہجر، منشی احمد علی کسمنڈوی اور جوالا پرشاد برق اسی زمانہ کے نامور مزاح نگار تھے۔

بعد کے طنز و مزاح نگار، رشید احمد صدیقی، ملا رموزی، پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی اور کنہیا لال کپور کتابی طنز و مزاح نگار ہیں۔ بعد کی مزاح نگار نسل میں چراغ حسن حسرت،

ابراہیم جلیس، ابن انشا، نصر اللہ خان، حاجی لق لق اور فکر تونسوی، کرشن چندر اور نصرت ظہیر وغیرہ ان سبھوں نے اردو صحافت کے ذریعہ اپنی تخلیقات کو جلا دی اور عوام تک پہنچایا۔ اس نسل کے مزاح نگاروں میں ایک بڑا نام مشتاق احمد یوسفی کا بھی ہے۔

بلا شبہ یہ اردو صحافت کی خوش نصیبی ہے کہ اردو ادب کے ممتاز دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے اردو صحافت کی عملی طور پر رہنمائی کی ہے جن میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، حیات اللہ انصاری، غلام رسول مہر اور مولانا عثمان فارقلیط نمایاں ہیں اور آزادی کے بعد، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، چراغ حسن حسرت اور سبط حسن کے نام درخشاں رہے ہیں۔ لیکن اسے بدقسمتی کہہ لیں یا بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے کہ جب سے اردو صحافت نے تجارت کا لبادہ اوڑھا ہے ایڈیٹرشپ خاندانی میراث بنتی جارہی ہے۔ اس مسند پر ممتاز ادیبوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔

ان کے علاوہ بہار کے حوالے سے اگر ہم غور کریں تو بہار میں جو اخبارات نکلتے رہے ہیں انہوں نے بھی ادب کو ایک نمایاں جگہ دی ہے اور عوام میں مقبول عام بنایا ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ رہی ہے کہ بعض مقامی اخباروں نے ادارتی صفحات پر ادبی مضامین کو جگہ دی ہے۔ لیکن اب تقریباً تمام اخبارات کا ادب ایڈیشن بھی موجود ہے۔ ان ایڈیشنوں کے مطالعے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں غزلیں، نظمیں، قطعات و رباعیاں اور سہرے وغیرہ کے علاوہ نثری اصناف میں افسانے، تنقیدی مضامین، طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور کتابوں پر تبصرے وغیرہ ایڈیشن کے اہم اجزا ہوتے ہیں۔

یوں تو بہار سے اس وقت درجنوں اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں لیکن اگر عوام تک ان کی رسائی کے حوالے سے بات کی جائے تو نصف درجن اخبارات ہی لوگوں کے مطالعہ میں ہیں۔ ان میں دو اخبارات قومی سطح کے سمجھے جاتے ہیں اور بقیہ میں سے کچھ کے گرچہ بہار سے باہر بھی ایڈیشن نکل رہے ہیں لیکن اب بھی وہ قومی سطح کے اخبارات میں اپنی جگہ نہیں بنا سکے ہیں۔ بات چونکہ طویل ہوچکی ہے اس لیے ہم یہاں صرف 4/ اخبارات کے ادب ایڈیشن پر بات کریں گے۔

قومی تنظیم:

قومی تنظیم کا ادب ایڈیشن بنیادی طور پر ایک ضمیمہ کی شکل میں دھنک رنگ کے نام سے اتوار کو شائع ہوتا ہے۔لیکن اس کا ایک اور ایڈیشن ادب نامہ کے نام ادھر چند ماہ سے ڈاکٹر منصور خوشتر ترتیب دے رہے ہیں جس میں نظم ونثر دونوں تخلیقات شامل ہوتی ہیں۔شعری حصے میں غزلیں،نظمیں، قطعات ورباعی وغیرہ جگہ پاتے ہیں۔ جبکہ نثر میں تنقیدی مضامین، تبصرے اور افسانے بھی جگہ پاتے ہیں۔ یہ ایڈیشن صفحہ نمبر ۱۰ر پر اتوار کو شائع ہوتا ہے۔قومی تنظیم میں زبان وادب کے نام سے ایک اور ایڈیشن ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی ترتیب میں نکلتا رہا ہے۔اس کے علاوہ اس کے ادارتی صفحہ پر بھی ادبی وتنقیدی مضامین اور شعری حصہ جگہ پاتے رہے ہیں۔دھنک رنگ چار صفحوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دھنک رنگ قومی تنظیم کے سینئر سب ایڈیٹر راشد احمد ترتیب دیتے ہیں۔اس میں صفحہ نمبر ۱۳ر پر جو ضمیمہ کا پہلا صفحہ ہوتا ہے راشد احمد کا اپنا کالم یا اداریہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اس میں لازمی طور پر قومی تنظیم کے مالک و چیف ایڈیٹر ایس ایم اشرف فرید کا ایک صحافتی مضمون لازمی طور پر ہوتا ہے۔جبکہ ایک یا دو مضمون، حجم کے اعتبار سے جو ممکن ہو،متفرق لوگوں کے شامل کیا جاتا ہے۔دوسرے صفحہ پر آپ کی بیاض کے تحت مخصوص عنوان پر مختلف لوگوں کے ذریعہ بھیجے گئے اشعار ہوتے ہیں جس میں عنوان کے لفظ کا بہتر سے بہتر استعمال کیا گیا ہو۔سب سے اچھا شعر بھیجنے والوں کو انعام کے طور پر مبارکباد دی جاتی ہے۔ ہر ہفتہ الگ الگ عنوانات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔اس صفہ پر ایک کالم میری ڈائری ہوتا ہے جس میں قارئین اپنی ڈائری میں لکھے گئے پسندیدہ کلام بھیجتے ہیں۔کچھ اقوال زریں بھی ہوتا ہے۔اس صفحہ پر اگر آپ کی بیاض سے جگہ بچ جاتی ہے تو ایک افسانہ یا کوئی ادبی مضمون شامل کیا جاتا ہے۔تیسرے صفحہ پر سندیس کے تحت قارئین کے خطوط شامل کئے جاتے ہیں جو مرتب ضمیمہ کے علاوہ لوگ اپنی پسندیدہ شخصیت کے نام بھی لکھتے ہیں۔اس کے علاوہ تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ چوتھے صفحہ پر شعری کلام کے علاوہ افسانے اور کچھ متفرقات قسم کی چیزیں شامل کی جاتی ہیں۔اس صفحہ کا ایک لازمی حصہ ''خوب کہی!'' ہے۔اس میں مرتب لوگوں کے دلچسپ سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔ بہرحال یہ ضمیمہ قارئین کی دلچسپی کا ہوتا

ہے اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا:

روزنامہ راشٹریہ ایک قومی سطح کا اخبار ہے جس کا صدر دفتر دہلی میں ہے اور ہندوستان کے دس سے زائد بڑے شہروں سے اس کی اشاعت پابندی ہو رہی ہے اور وہاں کے مقامی اخبارات میں اس اخبار نے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔بہار میں بھی پٹنہ سے اس کی اشاعت 2006 سے ہو رہی ہے اور بہار کے بڑے اخبارات میں اس کا شمار ہو رہا ہے۔روزنامہ راشٹریہ سہارا کا ادب ایڈیشن ہر اتوار کو ضمیمہ کی شکل میں امنگ کے نام سے شائع ہوتا ہے۔امنگ میں چار صفحات ہوتے ہیں۔ پہلا صفحہ فکر ونظر کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں شامل تخلیقات کا تعلق افکار وخیالات، ادب اور اصلاحی مضامین سے ہوتا ہے۔دوسرا صفحہ خالص ادبی ہوتا ہے جس کا مرکزی عنوان بزم ادب ہے۔اس صفحے کے مشمولات میں تنقیدی مضامین، افسانوں کے علاوہ تبصرہ وتعارف کے عنوان کے تحت ایک یا دو کتابوں پر تبصرے شائع کئے جاتے ہیں جبکہ نظمیہ حصے میں غزلیں اور نظمیں وغیرہ شامل کی جاتی ہیں۔ تیسرا صفحہ خواتین واطفال کے مرکزی عنوان سے شائع ہوتا ہے۔جس میں بچوں کی اصلاح وتربیت سے متعلق مضامین تو ہوتے ہی ہیں خواتین کی دلچسپی اور ان کے مسائل سے متعلق اہم مضامین بھی اس صفحہ کا حصہ بنتے ہیں۔گھر بار کے رکھ رکھاؤ اور بیوٹی ٹپس بھی اس صفحے کا حصہ بنتے ہیں۔ چوتھا صفحہ جہان فن کے نام سے شامل ہوتا ہے جس میں پردۂ سیمیں کی سرگرمیاں اور دلچسپ مضامین شائع ہوتے ہیں۔امنگ کے مشمولات سے ایک پیشہ ورانہ پختگی کا اندازہ ہوتا ہے اور گٹ اپ بھی اتنا عمدہ ہوتا ہے کہ قارئین کی توجہ کو مبذول کر لیتا ہے۔اس کے علاوہ مختلف مواقع پر بھی ادب کے مخصوص صفحات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ایسے صفحات کسی خاص شخصیت کو موضوع بنا کر ان کے فکر وفن پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔روزنامہ راشٹریہ سہارا کا ادارتی صفحہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔اس میں اداریہ کے علاوہ یوں تو کالم کو جگہ دی جاتی ہے لیکن ان میں کئی کالم نویس ادبی مضامین ہی لکھتے ہیں۔اس صفحے پر جن مضامین نگار کو جگہ دی جاتی ہے وہ راشٹریہ سہارا کے مستقل کالم نگار ہیں۔

روزنامہ انقلاب:

روزنامہ انقلاب ایک قومی اخبار ہے اس کا ابھی تک کا سب سے آخری ایڈیشن بہار سے شائع ہوتا ہے۔ بہار سے اس کے تین ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ اس اخبار میں اتوار کا ادب ایڈیشن ''ادب و ثقافت'' کے نام سے شامل اشاعت ہوتا ہے جو دو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بہار کے شعرا و ادبا کو بھی جگہ ملتی ہے۔ اس ایڈیشن پر نظر ڈالیں تو اس میں پہلا حصہ شعری ہوتا ہے جس میں فارسی کی کوئی غزل یا کچھ اشعار ہوتے ہیں اور اس کا اردو ترجمہ دیا جاتا ہے۔ مشہور غزلیں کے تحت کسی پرانے مشہور شاعر کی ایک غزل دی جاتی ہے۔ ایک شاعر کے متفرق اشعار کے تحت مشہور پرانے شعرا کے کلام کے نمونے دیئے جاتے ہیں۔ اسی حصے کا ایک جزو شعرا و ادبا کا مختصر تعارف بھی ہے۔ رنگ ظرافت کے تحت طنز و مزاح میں شعری کلام دیئے جاتے ہیں۔ غزلیں کے تحت نئے اور موجودہ شعرا کے کلام جو اخبار میں اشاعت کے لئے بھیجے جاتے ہیں، ان کو شامل کیا جاتا ہے۔ یہ تعداد بھی تین سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک غزل سرحد پار کے شعرا میں سے کسی کی اور ایک غزل ہندوستان کے کسی قدیم یا جدید شعرا میں سے کسی کی ہوتی ہے۔ عام طور پر ہر ایڈیشن میں ایک افسانہ، ایک تنقیدی مضمون شائع کیا جاتا ہے۔ بچوں کے ادب پر بھی ایک نہ ایک مضمون لازمی طور پر شامل کیا جاتا ہے۔ زبان کے حوالے سے بھی کچھ تخلیقات جگہ پاتی ہیں۔ اس ایڈیشن کا ایک اور نمایاں پہلو دیگر زبانوں کے ادب کا تخلیقی نمونہ بھی ہے۔ ''کتب بازار'' کے تحت کم از کم دو کتابوں پر ہر ایڈیشن میں تبصرے شامل کئے جاتے ہیں جو مختصر اور جامع ہوتے ہیں۔ کلاسیکی ادب سے بھی کچھ نمونے ایڈیشن میں شامل کرنے کا لزوم دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں انقلاب کے ادب و ثقافت ایڈیشن کے مشمولات کسی بھی معیاری ادبی رسالے کے مشمولات سے کم نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہار ایڈیشن نے شاعری میں ایک نئی پہل کر کے عظیم آباد کی ادبی روایتوں کو زندہ کیا ہے۔ اس کے تحت ہر ماہ کے آخری اتوار کو انقلاب کے دفتر میں ایک طرحی مشاعرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں نہ صرف پورے بہار کے شعرا ذاتی طور پر شامل ہوتے ہیں بلکہ اس سے بڑی تعداد میں شعرا اپنا کلام بذریعہ ای میل بھی ارسال کرتے ہیں۔ مصرعہ طرح کا اعلان اخبار

میں ماہ کے ابتدا میں کر دیا جاتا ہے۔ مشاعرہ میں بہ نفس نفیس شریک یا ای میل سے بھیجے ہوئے کلام کو اخبار میں شائع کیا جاتا ہے۔ جن شعرا کے کلام میں نقص یا کمزوری ہوتی ہے ان کی اصلاح بھی کی جاتی ہے۔

روزنامہ پندار:

روزنامہ پندار میں ادب ایڈیشن ادھر چند ماہ سے گوشۂ ادب کے عنوان سے شائع ہوتا ہے جس کو کامران غنی ترتیب دیتے ہیں۔ اس میں تنقیدی مضامین، کتابوں پر تبصرے، افسانے، غزلیں، نظمیں، رباعیاں، قطعات وغیرہ شامل کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادارتی صفحے پر ہمیشہ علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ درمیان میں ایک کالم شائع ہوتا تھا جس میں ادبی شخصیات کے فکر و فن کا تجزیہ کیا جاتا تھا۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بہار سے جو اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں انہوں نے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور ان کی خدمات بھی کسی ادبی رسالے سے کم نہیں ہیں۔

☆☆☆

بیورو چیف روزنامہ ''راشٹریہ سہارا، پٹنہ
محلّہ مہدولی، پوسٹ شوبھنکر پور، ضلع دربھنگہ، بہار
9835817780

شمس تبریز قاسمی

بہار میں اردو صحافت سمت ورفتار

اردو زبان کا جنم جنوبی ہندوستان بطور خاص دکن میں ہوا ہے ،شمالی ہندوستان جب اردو صحافت، شاعری اور ادب سے مکمل طور پر نابلد تھا جنوب میں اردو کا ڈنکا بج رہا تھا، دکنی شاعروں نے ہی شمالی ہندوستان میں اردو کو متعارف کرایا، دہلی اور اطراف میں اردو کا چلن ہوا، رفتہ رفتہ ایک دور وہ بھی آیا جب شمالی ہندوستان کی نمبرون زبان اردو بن گئی، دکن اور جنوب میں اردو کی مقبولیت گھٹ کر وہاں کی علاقائی زبان کی ہوگئی تاہم آج بھی شمالی ہندوستان کے ساتھ جنوبی ہندوستان میں اردو زبان مستحکم ہے۔

شمالی ہندوستان کے جن خطوں میں اردو زبان کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا ہے ان میں دہلی اور اتر پردیش کے ساتھ بہار کا نام سرفہرست ہے، سرزمین بہار میں اردو شاعری اور ادب عروج کی بلندیوں پر ہیں، بہار کی راجدھانی عظیم آباد شاعروں کا گڑھ کہلاتی ہے اور دنیا بھر میں وہاں کے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور انشاء پردازوں کا دبدبہ قائم ہے، اردو ادب اور شاعری کے ساتھ اردو صحافت میں بھی بہار دنیا سے ہم آہنگ ہے بلکہ مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو اس وقت پورے ہندوستان میں اردو صحافت کی سب سے بہتر صورت حال بہار میں ہے، دنیا بھر میں بہار کے اردو صحافی چھائے ہوئے ہیں، پرنٹ میڈیا سے لیکر الیکٹرانک میڈیا تک بہار کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کا دبدبہ ہے۔

بہار میں اردو ادب اور اردو شاعری کی طرح اردو صحافت کا سلسلہ بھی زمانہ قدیم سے رائج ہے اور متعدد اخبارات، میگزین، رسالے وہاں سے شائع ہوتے رہے ہیں، حالیہ دنوں میں پٹنہ اور دیگر شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات کی فہرست بہت طویل ہے جن میں روزنامہ قومی

تنظیم، روزنامہ سنگم، روزنامہ فاروقی تنظیم، روزنامہ پندار اور ہفت روزہ نقیب کو خصوصی حیثیت حاصل ہے ، یہ سب وہاں کے قدیم ترین اخبارات کہلاتے ہیں ،حالیہ دنوں میں روزنامہ راشٹریہ سہارا، روزنامہ انقلاب، حقیقت ٹائمس ، الوطن ، گرم ہوا، روزنامہ تاثیر سمیت متعدد اخبارات وہاں سے شائع ہورہے ہیں، ان کے علاوہ بھی ایک بڑی فہرست ان اخبارات کی ہے جو دیگر شہروں سے شائع ہونے کے ساتھ بہار سے بھی شائع ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت آفس کاپی کی ہے اس لئے ان کا نام لکھنا غیر ضروری اور بے فائدہ ہے۔

پورے ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو اردو قارئین سب سے زیادہ بہار میں نظر آتے ہیں ، اردو پڑھنے ، لکھنے اور بولنے کا جو مزاج اور جذبہ بہار میں ہے وہ کہیں اور نہیں ہے ، اتر پردیش کو اردو زبان کے فروغ کے حوالے سے بہت زیادہ جانا جاتا ہے ، اردو کے بڑے بڑے شعراء، ادباء اور صحافی اس دھرتی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہاں اردو زبان پر ہندی کا غلبہ ہے ، دوسروں کی بات چھوڑیئے خود مسلمان اردو کے بجائے ہندی زبان کو ترجیح دیتے ہیں مغربی یوپی کی صورت حال سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہے جہاں کے مسلمان شادی کارڈ، مشاعروں کا دعوت نامہ ہندی میں چھپواتے ہیں ، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ مسلمان ہیں، دعوت نامہ تو کم از کم اردو میں چھپوانا چاہئے تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ اردو پڑھنے والے کا فقدان ہے، اردو کو روزگار سے نہ جوڑنے کی وجہ سے سبھی ہندی کی جانب توجہ دیتے ہیں اردو پر اتنی بھی توجہ نہیں ہوتی ہے کہ وہ کم از کم پڑھنے پر بھی قدرت رکھ سکیں ، تاہم بہار کی صورت حال مغربی یوپی سے قدرے بہتر ہے قدیم لوگوں کی اکثریت اردو زبان سے واقفیت رکھتی ہے اور وہ اردو اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں، نئی نسل میں اردو سے رغبت کم ہورہی ہے تاہم دیگر علاقوں اور شہروں کی بہ نسبت یہاں کی صورت حال بہتر ہے اور بڑوں کے ساتھ بچے بھی اردو اخبارات پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

بہار کے اردو اخبارات میں قومی تنظیم کا بطور خاص میں یہاں تذکرہ کرنا چاہوں گا جس نے صحافیوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا کی ہے، ہندوستان کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے

اخبارات میں کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو صحافی بنانے میں قومی تنظیم کا رول ہے اور کسی نہ کسی درجہ میں ان حضرات کی اس اخبار سے وابستگی رہی ہے، آج بھلے ہی لوگ قومی تنظیم کی کارکردگی پر سوال اٹھاتے ہوں، اس پر غیر معیاری اخبار ہونے کا الزام لگاتے ہوں تاہم سچائی یہ ہے کہ جولوگ آج اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں وہ کل اسی اخبار سے وابستہ ہو کر اپنی صحافت کے نوک و پلک کو سنوار رہے تھے، آج بھی قومی تنظیم بہار میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور لوگ اسے شوق و رغبت کے ساتھ پڑھتے ہیں، روزنامہ راشٹریہ سہارا اور انقلاب جیسے کارپوریٹ سیکٹر اخبارات کی آمد کے بعد بھی اس کے سرکولیشن پر کوئی اثر نہیں پڑ سکا ہے تاہم بدلتے زمانے کے ساتھ اخبار کو بھی کچھ بدلنے کی ضرورت ہے۔

بہار کو ہندوستان کے انتہائی پسماندہ صوبہ میں شمار کیا جاتا ہے، آج سے تقریباً دس سال قبل انٹرنیٹ کی کوئی سہولت نہیں تھی، فیکس مشین پورے ضلع میں دو چار جگہوں پر ہوا کرتی تھی لیکن اس کے باوجود بہار کے ہر کونہ میں صحافت کا چرچا ہوتا تھا، اخبارات میں تمام علاقوں کی خبریں چھپتی تھی، دور دراز اعلاقے اور دیہات کے خبریں بھی اخبارات کی زینت بنتی تھی، نمائندے حضرات بڑی مشقتوں سے خبریں جمع کرتے تھے، دیہات سے خبر حاصل کرنے کے بعد کئی کیلومیٹر کا سفر کر کے شہر جاتے اور وہاں سے بذریعہ فیکس وہ خبریں بھیجتے تھے، ان دنوں فون کے ذریعہ بھی بہت سے خبریں لکھوائی جاتی تھی، نمائندہ حضرات آفس میں فون کر کے ضروری باتیں لکھوا دیا کرتے تھے جس کی روشنی میں ڈیسک پر خبریں تیار کی جاتی تھی، اب پہلے جیسی باتیں نہیں رہی، ہر جگہ انٹرنیٹ کی سہولت ہے، ای میل کے نظام نے فیکس کو بالکل ختم کر دیا ہے، اب ہر گاؤں دیہات کی خبریں بذریعہ میل ٹائپ شدہ اخبارات کو پہونچ جاتی ہیں، جن لوگوں کے پاس کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ کی سہولت نہیں ہے وہ اسمارٹ فون پر ہی خبریں ٹائپ کر کے اخبارات کو بھیج دیتے ہیں یا وہاٹس ایپ کر دیتے ہیں۔

بہار کی اردو صحافت کے بارے میں بہت سے لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہاں معمولی باتوں کو بھی اخبارت میں جگہ دی جاتی ہے، شادی، ختنہ، عقیقہ کی خبروں کو اہمیت کے ساتھ چھاپا جاتا ہے

، کچھ اخبارات کے نمائندے پیسے لیکر خبریں چھاپتے ہیں، جہاں سے پیسہ ملتا ہے وہیں کی وہ خبریں چھاپتے ہیں، گذشتہ دنوں اپریل میں بہار اردو اکیڈمی کی دعوت پر وہاں منعقد ہونے والے کل ہند صحافتی سیمینار میں مجھے شرکت کرنے موقع ملا، ہم نے دیکھا کہ کچھ مقالہ نگار حضرات اس طرح کی خبروں کو موضوع بحث بنا کر بہار کی صحافت کو انتہائی ناکارہ اور اپنے مشن میں ناکام بتا رہے تھے، بار بار ان کی زبان پر یہی شکایت تھی کہ یہاں کے اخبارات شادی، بیاہ اور عقیقہ کی خبروں کے علاوہ کچھ اور نہیں پیش کر پاتے ہیں لیکن یہ باتیں صرف بہار تک محدود نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے تمام شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات کا یہی حال ہے، روزنامہ انقلاب، روزنامہ راشٹریہ سہارا اور روزنامہ خبریں جیسے معروف و معیاری اخبارات بھی اس طرح کی خبروں کو شائع کرتے ہیں، ان خبروں کو جگہ دینی ان کی مجبوری بھی ہے، اس لئے یہ اعتراضات بے معنی ہیں۔ بلکہ ہندی اخبارات کے صفحات بھی کچھ ایسی ہی خبروں سیاہ ہوتے ہیں، وہ اخبارات التزام کے ساتھ اس طرح کی خبروں کو شائع کرتے ہیں کیوں کہ ہر ضلع کیلئے ان کا ایک صفحہ خاص ہوتا ہے جسے وہ اسی طرح کی خبروں سے پر کرتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایسی خبروں کو جگہ دینے کیلئے مجبور ہوتے ہیں۔

بہار میں اردو اخبارات پڑھنے کا بھی ذوق وشوق لوگوں میں برقرار ہے، دور دراز علاقوں میں بھی لوگ پابندی سے اخبارات پڑھتے ہیں، خبروں کے ساتھ مضامین بھی پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں، اس کا جائزہ لیتے ہیں، مضمون نگار کا رابطہ نمبر دستیاب ہو جاتا ہے تو ان سے فون کر کے اپنے رد عمل کا بھی اظہار کرتے ہیں، اکثر مجھے بہار سے فون آتے ہیں، عموماً جمعہ کو میرا ہفت روزہ کالم پس آئینہ قومی تنظیم سمیت پٹنہ کے دیگر اخبارات میں شائع ہوتا ہے جس پر اکثر قارئین کا فون آتا ہے وہ اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہیں، ایسے ہی کچھ لوگوں سے ابھی پٹنہ سفر کے دوران میری ملاقات ہوئی، جنہوں نے مضمون پڑھنے کے بعد فون کیا تھا، کچھ دنوں قبل اظہار الحق بستوی صاحب دہلی میں ملاقات ہوئی، گفتگو صحافت پر چل پڑی، اس دوران وہ کہنے لگے کہ سب سے زیادہ اخبار بہار میں پڑھا جاتا ہے میں نے کہا کہ بہار جائے بغیر یہ تجزیہ آپ کیسے کر رہے ہیں کہ وہاں کے لوگ سب

سے زیادہ اردو اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ جب بھی کوئی مضمون شائع ہوتا ہے تو بہار سے ضرور فون آتا ہے بقیہ دیگر صوبوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے۔

اخبارات پڑھنے کی دلچسپی کے ساتھ صحافت کے دیگر امور سے بھی انہیں بے پناہ دلچسپی ہے ،اردو کانفرنسوں میں شوق و رغبت کے ساتھ شرکت کرتے ہیں ،اردو کی ترقی کیلئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں،صحافت پر ہونے والے سیمناروں میں بھی وہ بصد شوق جاتے ہیں اور ہمہ وقت اردو کی ترقی کیلئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ چناں چہ سینئر صحافی جناب سہیل انجم صاحب اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں

’’سمینار میں ایک خاص بات یہ نوٹ کی گئی کہ بہار میں اردو زبان سے لوگوں کی دلچسپی برقرار ہے۔اس کا ثبوت وہ سامعین تھے جو صبح سے شام تک سمینار ہال میں تشریف فرما رہے۔ دہلی میں لنچ کے بعد نصف سے زائد کرسیاں خالی ہو جاتی ہیں اور صرف وہ لوگ بچتے ہیں جن کو مقالہ پیش کرکے اعزازیہ لینا ہوتا ہے۔لیکن مذکورہ سمینار کے سامعین کی دلچسپی آخر تک قائم رہی،صرف چند کرسیاں ہی خالی ہوئیں۔ راقم نے ایک اور اہم بات نوٹ کی۔ وہ یہ کہ اہل بہار کی اردو سے دلچسپی مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ دہلی میں ادبی کتابوں کی فروخت بہت کم ہے۔ مصنفین خود کتابیں چھپواتے ہیں اور دوست احباب میں مفت تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہاں ایسے بہت سے اردو دیوانے بھی ہیں جو مفت میں بھی کتاب کو ہاتھ میں لینا گوارہ نہیں کرتے۔ جبکہ پٹنہ کے سبزی باغ میں کتابوں کی ایک معروف اور قدیم دکان بک امپوریم میں ادبی کتابوں کی بھرمار دیکھی۔ یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ لوگ بڑی تعداد میں ادبی کتابیں اور رسالے خریدتے ہیں۔ وہاں کے لوگ مفت میں کتاب پڑھنے کا شوق نہیں پالتے۔‘‘ (بحوالہ ملت ٹائمز 6؍مئی، 2016)

بہار میں اردو اخبارات معاشی اعتبار سے بھی دہلی کے مقابلے میں قدرے بہتر ہیں، معاشی اور تجارتی نقطہ نظر سے سب سے بہتر صورت حال جنوبی ہند کے اخبارات کی ہے جہاں سرکاری اشتہارات کے ساتھ پبلک سیکٹر اشتہارات بھی بڑی تعداد میں اردو اخبارات کو ملتے ہیں، جنوبی ہند

کے بعد بہار کا نمبر ہے جہاں کے اخبارات سرکاری اشتہارات کے ساتھ پبلک سیکٹر اشتہارات کو حاصل کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں، پرائیوٹ کمپنیوں کا اشتہار بھی اچھی خاصی تعداد میں انہیں مل جاتا ہے، جبکہ دہلی کی صورت حال اس حوالے سے بہت ہی خراب ہے، پبلک سیکٹر اشتہارات انقلاب اور سہارا کے علاوہ دیگر اخبارات کو بالکل نہیں مل پاتا ہے، ان دونوں اشتہارات کو ملنے کی وجہ بھی ہندی اخبارات ہیں، دینک جاگرن اور راشٹریہ سہارا ہندی کے توسط سے ان کے اردو ایڈیشنز کو بھی اشتہار مل جاتا ہے جو دراصل ہندی کا ہی پیکیج ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ بہار میں اردو صحافت مجموعی طور پر بہتر ہے، اردو قارئین بڑی تعداد میں وہاں موجود ہیں، لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا جذبہ برقرار ہے، اردو صحافت سے ان کی دلچسپی بطور تجارت نہیں بلکہ عبادت ہے، وہ شوق و محبت کے ساتھ اردو سے لگاؤ رکھتے ہیں، اردو کا فروغ ان کے مشن میں شامل ہے، حتی الامکان اپنے بچوں کو بھی وہ اردو کی تعلیم دیتے ہیں، اخبارات بھی صحافتی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، سماج و معاشرہ کی تشکیل میں نمایاں کردار نبھا رہے ہیں، بہتر مواد کی فراہمی کے ذریعہ اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں، عوام تک بہتر خبروں کی فراہمی کا فریضہ موثر انداز میں نبھا رہے ہیں اور دن بہ دن ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔

☆☆☆

محمد فہام الدین (صدف فہام)
ایم۔اے فائنل ایئر، شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی

بہار کی اردو صحافت کی زبان کا معیار

صحافت کو آغاز ہی سے اطلاعات رسانی کے ساتھ ساتھ سماج کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا سب سے اہم ذریعہ کہا جاتا ہے۔ صحافت سماج میں پھیلے ہوئے غلط رسم و رواج کو ختم کرنے اور انسان کے اندر انقلاب پیدا کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ عہد قدیم میں جب صحافت کا باضابطہ آغاز نہیں ہوا تھا تو شعر وادب کے ذریعہ حالات حاضرہ کی باتوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ کوئی ۱۹۶ سال قبل اردو صحافت کی ابتدا ہوئی اور شعر وادب کے بجائے صحافت کے ذریعہ لوگوں میں بیداری اور انقلاب پیدا کیا جانے لگا ساتھ ہی عوام کو مسائل سے آگاہ بھی کیا جانے لگا۔ لیکن بیسویں صدی میں الیکٹرانک میڈیا نے اس کی جگہ لے لی۔ بیشتر ناقدوں کا خیال ہے کہ الیکٹرانک میڈیا نے پرنٹ میڈیا کو متاثر کیا اور پرنٹ میڈیا کی اہمیت کم ہوگئی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ پرنٹ میڈیا کی اپنی ایک منفرد شناخت ہے، اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ اخبارات کے اثرات دیرپا ہیں۔ اکیسویں صدی میں بھی اردو صحافت کی اپنی منفرد شناخت اور ایک الگ اہمیت ہے۔ جہاں تک بہار میں اردو صحافت کے آغاز کی بات ہے تو ۱۸۵۳ء میں باضابطہ اردو کا پہلا اخبار ''نورالانوار'' جاری ہوا۔ ۱۸۵۷ء تک بہار میں چار اخبار جاری ہو چکے تھے۔ ''پٹنہ ہرکارہ''، ۲۱ اپریل ۱۸۵۵ء، ''اخبار بہار'' یکم ستمبر ۱۸۵۶ء اور ''ویکلی رپورٹر'' یکم مئی ۱۸۵۶ء جاری ہوا اور پہلی جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا۔ افسوس کا مقام ہے کہ بہار کے صحافیوں کو اور اخبارات کی اہمیت کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے باوجود اس کے بہار نے اردو صحافت کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے اور اپنی

بے باک تحریر کے ذریعے بہار کا پرچم لہرایا ہے۔

صحافت کی اہمیت وافادیت کے لئے زبان کو بہت اہم مانا جاتا ہے۔ اچھی زبان جس میں لطف بھی ہو، انقلاب بھی ہو، بامحاورہ بھی ہو اور غیر جانبدار بھی ہو تو یہ صحافت اور اخبار کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک بہار کی اردو صحافت کی زبان کا سوال ہے تو اس پر الزامات عائد کیے جاتے رہے ہیں کہ بہار کی صحافت کی زبان میں علاقائیت ہوتی ہے ادب نہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ بہار کی صحافت کی زبان کا معیار ابتدا ہی سے معیاری رہا ہے۔ آزادی کے بعد تو ہماری صحافتی زبان مزید معیاری ہوگئی ہے۔

''گیا شہر کے مرزا غالب کالج کے پی سی اے اور بایوٹیکنالوجی
کے طلبا کا صدفی صدر یزلٹ آیا۔

مرزا غالب کالج گیا کے شعبہ بایوٹکنالوجی کی طالبہ انامیکا نے 75% نمبر حاصل کر پورے مگدھ میں اول آئی ہے جبکہ اسی شعبہ کی تسنیم کوثر 74.3% نمبر لاکر پورے مگدھ میں سیکنڈ ٹاپر کی۔ مرزا غالب کالج کے شعبہ بایوٹکنالوجی کے کوآرڈینٹر ڈاکٹر شاہد رحیم اور اسسٹنٹ کوآرڈینیٹر منہاج عالم نے بتایا کہ بایوٹکنالوجی کے فائنل امتحان میں کل ۳۱ طلباء طالبات شریک ہوئے تھے جو سب کے سب اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔

یہاں بات قابل ذکر ہے کہ مرزا غالب کالج گیا کے شعبہ بایوٹکنالوجی کا یہ تیسرا بیچ ہے، اب تک کے سبھی بیچوں میں اس بیچ کے طلباء وطالبات نے سب سے اچھا ریزلٹ دیا ہے۔ مرزا غالب کالج گیا کے پرنسپل ڈاکٹر غلام صمدانی نے بتایا کہ بایوٹکنالوجی کے شاندار ریزلٹ کے لئے اس شعبے کے کوآرڈینیٹر، اسسٹنٹ کوآرڈینیٹر اور سبھی اساتذہ کا فی محنت ولگن سے طلبا کی تعلیم پر توجہ دیتے ہیں۔ اس شاندار ریزلٹ کا کریڈٹ اس شعبے کے اساتذہ کو جاتا ہے۔''

(''قومی تنظیم''، پٹنہ، ۱۷ جون ۲۰۱۰ء)

''ہم لوگ اب تک بھگوا گروہ کا خفیہ ایجنڈا سنتے آئے ہیں یا بھگوا پارٹی کے خفیہ ایجنڈا کے بارے میں باتیں کی جاتی رہی ہیں مگر اب تو ایسا لگ رہا ہے کہ میڈیا کا بھی خاص خفیہ ایجنڈا ہے جو موقع پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں چنئی سے شائع ہونے والے ایک روزنامہ نے راہل گاندھی کی تعلیمی لیاقت پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ اخبار نے راہل گاندھی کے کیمبرج یونیورسیٹی سے حاصل کردہ ڈیولپمنٹ اکنامکس میں ایم فل (M.Phill in Development Economics) کی ڈگری پر سوال کھڑے کئے تھے۔ اس کے بعد کیمبرج یونیورسیٹی نے راہل کو دی گئی سند کی تصدیق کی تھی۔ اب خبر یہ ہے کہ اس اخبار کے خلاف نوٹس بھیجا گیا ہے۔ ایسی بے بنیاد خبریں آئے دن میڈیا میں شائع کر دی جاتی ہیں۔ زیادہ تر چینل یا اخبار غیر جانبداری اور ایمانداری کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ذرا باریکی سے خبروں اور رپورٹوں کا جائزہ لیا جائے تب معلوم ہو جاتا ہے کہ میڈیا کتنا ایماندار اور کتنا غیر جانبدار ہے۔ فریزر روڈ نام کا کوئی روڈ سرکاری دستاویز میں موجود نہیں ہے بلکہ روزنامہ کا دفتر مجاہد آزادی اور کانگریس کے عظیم لیڈر مظہر الحق کے نام پر موسوم سڑک مظہر الحق پتھ پر واقع ہے۔ مگر آج تک کسی کانگریسی نے یا کسی حکام نے یا اقلیتی کمیشن نے عظیم مجاہد آزادی دے کی جا رہی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کی زحمت نہیں گوارا کیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سڑک پر ان کے نام کا بورڈ لگا ہوا کرتا تھا اب وہ بھی نظر نہیں آتا ہے۔''

(''قومی تنظیم'' پٹنہ، ۱۰ جون، ۲۰۰۹ء، ص: ۶)

درجہ بالا اقتباس سے پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ بہار کی صحافتی زبان کا معیار اعلیٰ ہے۔ کہیں بھی علاقائی زبان غالب نہیں ہوتی ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ پہلے پر لطف اور بامحاورہ زبان نہیں تھی لیکن تحریر میں ہمیشہ جذباتی پن، انقلاب، اشارے وسلاست کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن بیشتر ناقدوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صحافت کی زبان کا معیار اس کے

پر لطف انداز بیان سے نہیں بلکہ عام فہم اور غیر جانبدر زبان سے ہوتا ہے کیونکہ اخبار یا رسالے کا عام قاری سے تعلق ہوتا ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ صحافتی زبان کے لئے کئی زبانوں کا علم ہونا ضروری ہے جس سے زبان میں کشش پیدا ہوگی۔ اس سلسلے میں سہیل انجم لکھتے ہیں:

''آج ہمارا دامن معیاری زبان اور ذخیرۂ الفاظ کے حوالے سے تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج لوگ اردو صحافت میں آ رہے ہیں وہ عربی اور فارسی سے ناواقف ہیں۔ جب تک اردو صحافی عربی و فارسی کی شد بد نہیں رکھیں گے وہ اچھی اور معیاری زبان نہیں لکھ سکتے۔''

(میڈیا اور جدید رجانات، ص: ۱۶۱)

بہر کیف آج یہ معاملہ تو پورے اردو داں طبقے پر آتا ہے محض صحافی پر الزامات عائد کرنا درست نہیں ہے۔ باوجود اس کے اردو کے صحافی اپنا کردار بہت ذمہ داری کے ساتھ نبھا رہے ہیں اور ان میں بہار کے صحافی کسی موڑ پر پیچھے نہیں۔ روز بروز بہار کے اخبار کی زبان کا معیار اتنا اعلیٰ ہوتا جا رہا ہے کہ وہ مختلف طبقات کے قاری کو تسکین تو پہنچاتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ اپنی تحریروں کے ذریعہ لوگوں میں انقلاب و جوش وجذبہ بھی پیدا کر رہے ہیں۔

بہاری کی صحافت کی زبان کا معیار عہد حاضر میں اور بھی بہتر ہو گیا ہے۔ یہاں سے نکلنے والے بیشتر اخبار و رسائل کی تحریروں کو پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کی زبان عام فہم ہونے کے باوجود پر کشش ہوتی ہے۔

''اسلامیات سے متعلق پروگراموں کو نشر کرنے والے اسلامک چینل پیس ٹی وی پر حکومت ہند کی جانب سے پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ مرکزی حکومت نے اس چینل کو بغیر لائسنس قرار دیتے ہوئے کیبل آپریٹروں کو ہدایت دی ہے کہ اگر اس نے اس قسم کے چینلوں کو چلایا جن کے پاس لائسنس نہیں ہیں تو اس پر سخت قانونی کاروائی کی جائے گی۔ مبینہ دہشت گردانہ سرگرمیوں کو فروغ دینے کے الزام میں جانچ کے

گھیرے میں آئے معروف اسلامک اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائک کے خطبات اور تقاریر کو نشر کرنے والا پیس ٹی وی اب جانچ کے دائرے میں ہے جبکہ اس پر یہ الزام بھی عائد کیا جا رہا ہے کہ کیبل آپریٹروں نے بغیر لائسنس کے اس چینل کو ہندوستان میں دکھانا شروع کر دیا ہے جو قانونی اعتبار سے غلط ہے۔''

(روزنامہ انقلاب، ۹/جولائی ۲۰۱۶ء، ص:۱)

''عید سعید کے مبارک موقع پر جہاں دیہی علاقوں میں مسلمانوں نے جوش و خروش کے ساتھ عید منائی وہیں شہری علاقوں میں بھی پر امن ماحول میں شہر کی عیدگاہوں کے علاوہ تقریباً تمام جامع مساجد میں عید کی نماز ادا کی گئی۔ صبح سے ہی لوگ عید کی تیاری کر کے عیدگاہوں اور مساجد کی جانب جا رہے تھے۔ شہر کے ہر نکڑ، شاہراہوں اور سڑکوں پر مسلمانوں کی زبان سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ عید کی خوشیوں میں ہر مسلمان مرد، بچے، بوڑھے اور امیر و غریب سب لوگ شامل ہو رہے تھے۔ رامپاڑہ عیدگاہ میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جمع ہوئے اور ۹:۳۰ بجے صبح میں نماز عید الفطر ادا کی گئی۔ مولانا بدرالدُجیٰ نے عید کی نماز سے قبل روزے کی اہمیت و افادیت اور اس کے تقاضوں سے متعلق تقریر کرتے ہوئے کہا کہ عید یعنی خوشی دراصل انہیں لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے رمضان کے مہینے میں روزہ تراویح، تہجد اور قرآن کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اپنے ہمسایوں، غرباء، یتیموں، فقراء، بے کس اور مجبوروں کا بھی خاص خیال رکھا ہو۔ ایسے مخلص بندوں کو خود سے اس کا بدلہ دے گا یعنی انہیں جنت ملے گی۔''

(انقلاب روزنامہ، پٹنہ، ۹/جولائی ۲۰۱۶ء، ص:۷)

ان چند اقتباسات کی روشنی میں ایک بات پوری طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ بہار کی صحافت کی زبان کا معیار کتنا اعلیٰ ہے۔ علاقائی چیزوں کو بھی صحافی نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ

یہ ایک نیشنل زبان بن گئی ہے، کہیں بھی علاقائیت کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا ہے۔ آزادی کے بعد سے حال تک بہار کی صحافت کی زبان کے معیار میں بلندی پیدا ہوگئی ہے جو ہنوز جاری ہے۔

۱۸۵۳ء سے جب بہار میں اردو صحافت کا آغاز ہوا تھا تب سے اب تک سیکڑوں صحافی ہیں جنہوں نے اپنی تحریر کے ذریعہ انقلاب برپا کیا۔ عوام کے حقوق کی بات بے باکی سے کی اور زبان کا معیار بلند کیا۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں ''غلام سرور، مولوی سعادت علی، ایم۔ علی ظفر، خورشید احمد، بدر اورنگ آبادی، اظہار احمد، ہریہر پرساد دیہاتی، عین تابش، اے پی جیسوال، ریحان عظیم آبادی، کلام حیدری، شبیر احمد، معین شاہد، ش مظفر پوری، عابد رضا بیدار، مشتاق احمد نوری، منصور خوشتر، عارف اقبال، اجمل فرید، اسفر فرید، سید احمد قادری، مناظر عاشق ہرگانوی، عبدالمغنی وغیرہ۔ فہرست کافی طویل ہے اس لئے چند نام ہی گنوائے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے مل کر صحافت کا سر بلند کیا ہے۔ تمام صحافیوں کو اپنی بے باک تحریر کی وجہ سے بہت سی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ جیل جانا پڑا، اپنے مال و اسباب ضبط کروانے پڑے۔ باوجود ان باتوں کے ان کے جوش و جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ اپنا کام انجام دیتے رہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ پہلے غیر ملکیوں کے خلاف آواز اٹھاتے تھے، آج اپنے ملک کے دشمن عناصر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ اردو کے صحافی خصوصاً بہار کے صحافی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں اور ہر اعتبار سے زبان کو عام فہم و انقلابی بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

☆☆☆